سلسلۂ آصفیہ

رسائلِ شبلی

مولانا مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی الملقب شمس العلماء کے وہ مضامین جو وقتاً فوقتاً تاریخی یا علمی مسئلہ پر لکھے گئے

ایک کتاب یا رسالہ کی صورت میں چھپکر شائع نہیں ہوئے تھے۔ انکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اسلام میں شفاخانوں کی تعمیر کی ابتدا اور انکی عہد بعہد کی وسعت و ترقی

مسلمانوں میں کتبخانہ کی ابتدا اور ترقیاں۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں غیر مذہب کی رعایا کے کیا حقوق تھے۔

جزیہ کی تحقیق اور یہ کہ وہ کن اصول پر مقرر ہوا تھا

مسلمانوں نے جو کلیں ایجاد کی تھیں

ندوۃ العلماء کے دوسرے جلسہ میں مصنف نے جو لکچر دیا تھا۔

احمد زکی آفندی کے سفرنامۂ یورپ پر ریویو۔

اس امر کا ثبوت کہ اسکندریہ کا کتبخانہ مسلمانوں نے نہیں جلایا۔

مسلمانوں نے یونانی عبرانی۔ سریانی قبطی۔ ژند پہلوی و سنسکرت زبان کی کیا کیا کتابیں

مسلمانوں کے عہد حکومت میں کہاں کہاں مدرسے قائم ہوئے۔

مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا کیا طرز تھا۔

باہتمام سید اصغر علی

مطبع العلوم علی گڈہ میں چھپا

دیباچہ

مسلمانوں کے اگلے کارناموں کا غلغلہ سب سے پہلے۔ اس گروہ نے بلند کیا جو آج نیا گروہ کہلاتا ہے۔ اگرچہ اس مقصد کے لیئے ان بزرگوں کو تاریخی تحقیقات سے بالذات سروکار نہ تھا۔ لیکن چونکہ قوم کو حوصلا اور غیرت دلانے کے لیئے اس سے زیادہ کوئی افسوں کارگر نہ تھا کہ "تمہارے اسلاف نے یہ یہ کارہائے نمایاں کیئے تھے، تمکو بھی انہی کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے" اسیلئے یہ بزرگ جب کبھی تقریر یا تحریر کے ذریعہ سے لوگوں کو گرمانا چاہتے تھے تو خواہ مخواہ انکو اسلاف کے کارناموں کا حوالہ دینا پڑتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان پر فخر واقعات کی طرف زیادہ توجہ مبذول ہوتی گئی یہاں تک کہ تاریخی تحقیقات کی ابتدا ہوئی اور بعض بعض اہل قلم نے خاص اس بحث پر جستہ جستہ مضامین لکھے۔ لیکن چونکہ یہ انکا اصلی کام نہ تھا اسیلئے جو کچھ ہوا وہ ایک سرسری کارروائی سے زیادہ نہ تھا۔

اسی اثنا میں ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک سے میں نے ایک رسالہ لکھا جسمیں یہ بحث تھی کہ مسلمانوں نے دنیا کی کیا کیا زبانیں سیکھیں اور غیر قوموں کے کون کون سے علوم و فنون کے ترجمے کیئے۔ نیز یہ کہ مسلمانوں نے دنیا میں ہر جگہ کسقدر بڑے بڑے مدارس

اور دار العلوم تعمیر کیئے۔ یہ رسالہ اگرچہ ناتمام تھا یعنی پہلی بحث کا استقصا نہیں کیا گیا تھا تاہم چونکہ ہماری زبان میں اسوقت تک اس مضمون کے متعلق اسقدر سرمایہ بھی نہیں مہیا ہوا تھا۔ نہایت مقبول ہوا ۔اور یونانی تراجم کی صدائیں تمام ملک میں گونج اٹھیں۔

قبول عام کی بنا پر مجکو خیال پیدا ہوا کہ قوم میں تاریخ کا صحیح مذاق پیدا ہوگیا ہے جو قوم کی علمی ترقی کی جان ہے لیکن واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ محض دہوکا تھا۔ مقبولیت کی وجہ صرف یہ تھی کہ قوم میں عموماً استخوان فروشی اور اسلاف پرستی کی خاصیت موجود ہے۔ اسلیئے بزرگوں کی عظمت کی نسبت جو کچھ صحیح یا غلط کہا جاتا ہے خواہ مخواہ اسکو قبول ہو جاتا ہے۔

اسکا نتیجہ ہے کہ باوجود اس شور و غل کے جو اسلامی ترقیوں کی نسبت کیا جاتا ہے۔ تحقیقات میں کچھ اضافہ نہیں ہوا۔ بلکہ وہی چند واقعات ہیں جو سیکڑوں پیرایہ میں بار بار بیان کیے گئے اور کیئے جاتے ہیں۔ نئی تحقیقات کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔

قوم کی بدمذاقی کے خیال نے مجکو بالکل افسردہ کر دیا تھا۔ لیکن یورپ میں جو اورینٹل کانفرنس قائم ہے اسکی کارروائیوں نے ایک نئی تحریک دل میں پیدا کی۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی قوموں کی (جسمیں مسلمان بھی داخل ہیں) ہر قسم کی علمی و عملی ترقیوں کے حالات بہم پہنچائے۔ چنانچہ پچھلے سال جو اسکا اجلاس ہوا اسمیں یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے علم ادب، فلسفہ، اور صنائع کے متعلق ایک مبسوط مجموعہ طیار کیا جاے۔ کانفرنس کے سلسلہ سے الگ، یورپ میں اور بھی بہت سے لوگ، اپنے ذاتی شوق سے مسلمانوں کے متعلق ہر قسم کی تحقیقات میں مصروف ہیں چنانچہ ایک جرمنی عالم نے نہایت تحقیقات کے ساتھ ایک مبسوط کتاب اس عنوان پر لکھی ہے کہ "مسلمانوں نے خاص علم طب کی کیا کیا کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں" یہ دیکھکر مجکو خیال ہوا کہ جو کام اور قومیں کر رہی ہیں وہ در اصل

ہمارا کام ہے اور یہ ایک بیغیرتی کی بات ہو کہ ہم اپنے کام میں دوسروں کا احسان اُٹھائیں
اس خیال سے میں نے اس سلسلہ کو پھر شروع کیا اور مختلف عنوانوں پر مضامین لکھے۔

انہیں سے تراجم کا مضمون جسکو میں نے لکھنو کی کانفرنس میں پیش کیا تہا اور جس کے ساتھ مدارس اسلامیہ کے حالات بھی شامل تھے۔ اُسکے متعلق نہایت کثرت سے نئی معلومات بہم پہنچیں۔ یونانی، سریانی، پہلوی، ژند قبطی سنسکرت، ہر ایک زبان کے ترجموں کی نسبت معتدبہ سرمایہ ہات آیا اور سیکڑوں کتابوں کے نام دریافت ہوئے جو ان زبانوں سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ اس بنا پر میں نے اس مضمون کو ایک مستقل مضمون قرار دیا اور مدارس اسلامیہ کے حالات الگ عنوان سے لکھے۔ تاریخی سلسلہ کے علاوہ اور جو مضامین اس مجموعہ میں ہیں اُن غلط فہمیوں کے متعلق ہیں جو یورپ میں اسلام اور اہل اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی ہیں۔

یورپ نے صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں، مسلمانوں کے متعلق بہت سے متعصبانہ خیالات قائم کر لئے تھے اور وہ ابتک قائم ہیں۔ یورپ کے عربی داں مصنفین نے جو تعصب سے پاک ہیں۔ ان غلطیوں کو کسیقدر کم کیا ہے لیکن بالکل مٹا نہیں سکے۔ یہی غلطیاں ہیں جنہوں نے یورپ کی قوموں کو اسلام اور اہل اسلام سے اجنبی بلکہ متنفر بنا رکہا ہے، اور اگر وہ بالکل دور کردیجائیں تو قوی اُمید ہے کہ دونوں قوموں کی باہمی بیگانگی بہت کم ہو جائے اور یورپ کو مذہب اسلام کی خوبیاں نظر آنے لگیں۔

انہیں مہتم بالشان بحثیں جزیہ۔ غیر مذہب والوں کے حقوق۔ اور کتب خانہ اسکندریہ کی بحثیں ہیں۔ جزیہ کا مضمون مستقل رسالہ کی صورت میں پہلے شائع ہو چکا تہا لیکن اب اسمیں نہایت مفید اور ضروری معلومات بڑہا دیئے گئے ہیں جنکے بغیر وہ مضمون گویا ناتمام تہا۔ دوسرا مضمون ابتک کتاب یا رسالہ کی شکل میں چہپکر شائع نہیں ہوا تہا۔ کتب خانہ اسکندریہ کا

مضمون پہلے چھپکر شائع ہو چکا ہے اور اسمیں کچھ ترمیم یا اضافہ نہیں کیا گیا ہے۔

یہ افسوس ہے کہ اس مجموعہ کے چھپنے کے وقت ایسے حالات پیش آئے جنکی وجہ سے چھپنے کا کافی اہتمام نہو سکا۔ صفائی اور خوشخطی سے قطع نظر کرکے تصحیح بالکل نہو سکی اور کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ اس بنا پر کتاب کے اخیر میں غلطنامہ شامل کیا گیا ہے۔ اگرچہ ناظرین کو غلطنامہ کے پڑہنے اور تصحیح کرنے میں زحمت ہوگی لیکن انکو مجبوراً یہ زحمت اٹھانی چاہئے ورنہ بہت سے مقامات میں انکو عبارت کے سمجھنے میں اس سے زیادہ الجھن ہوگی جو تصحیح و مطابقت میں ہو سکتی ہے۔

شبلی نعمانی

یکم فروری سنہ ۱۹۰۵ء

اسلامی حکومتیں اور شفاخانے

ایشیائی قوموں میں کسی سلطنت کی عظمت و شان یا پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ فتوحات
ملکی اور فوجی طاقت سے کیا جاتا تھا۔ اور غالباً یورپ کا بھی آج سے دو سو برس پہلے یہی حال تھا
اسکا یہ اثر تھا کہ اس عہد کی تاریخی تصنیفات میں کسی سلطنت اور حکومت کے متعلق جو واقعات
لکھے جاتے تھے وہ زیادہ تر فتوحات اور خانہ جنگیوں کے واقعات ہوتے تھے۔ اسلامی تاریخیں
بھی اس الزام سے بری نہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج کل یورپ نے اسلامی تاریخوں کا نام "قصاب
کی دوکان" رکھا ہے۔ یورپ کے طعنہ دینے کی بہ نسبت ہمکو زیادہ افسوس یہ ہے کہ اس طرز تحریر
نے مسلمانوں کے بہت سی عجیب و غریب کارنامے گمنامی کی خاک میں دفن کر دیئے۔ ہم نہایت
قوی دلیلوں سے اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ۔ مہذب حکومت
کا زمانہ تھا۔ انتظام کے جدا جدا صیغے قائم تھے اور ہر صیغہ کا وزیر یا سکرٹری الگ تھا ہمیشہ
تیسویں برس تمام آراضی کی پیمایش ہوتی تھی اور زمین کی افزایش اور لیاقت کے لحاظ سے
دفتر خراج کی اصلاح و ترمیم ہوتی تھی۔ پبلک ورک یعنی منافع عامہ کا وسیع محکمہ تھا۔ جو سڑکوں کی
درستی۔ پلوں کی مرمت۔ شہر کی صفائی۔ حفظان صحت اور اس قسم کے تمام امور کا متکفل تھا۔

غرض ایک مہذب سلطنت کے جو جو لوازمات ہیں سب تھے لیکن آج ہم ان کی تفصیل بتانے سے
بالکل عاجز ہیں اور یہی عجز ہے جو ہمکو اپنے قدیم تاریخوں کی شکایت پر مجبور کرتا ہے۔

بہرحال یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کی تہذیب و تمدن کے متعلق جُدا جُدا
عنوان قائم کیئے جائیں اور جہاں تک ممکن ہو انکے متعلق نہایت تفصیلی مضامین لکھے جائیں
اگر اس طریقہ میں ہمکو کامیابی ہوئی تو اُن مضامین کا مجموعہ جو وقتاً فوقتاً ہمارے میگزین میں
شائع ہوتے رہیں گے۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی مکمل تاریخ بنجائیگا اور اُسوقت ہم اُسکو ایک
مستقل کتاب کی صورت میں شائع کر سکیں گے۔

یہ آرٹکل پبلک ورک کی ایک خاص شاخ یعنی شفاخانوں کے متعلق ہے۔

اس قسم کی خودرو طبابت جو لازمۂ زندگی ہے۔ ہر قوم میں ہمیشہ پائی جاتی ہے اور عرب
میں بھی ہمیشہ سے موجود تھی لیکن علمی طبابت جو کسب و تعلم کی محتاج ہے اسکا پتہ بھی عرب میں مدت

حارث بن کلدہ

سے چلتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے پہلے۔ حارث بن کلدہ نے جو طائف
کا رہنے والا تھا۔ فارس میں جاکر طب کی تحصیل کی۔ اور وہاں سے واپس آکر قوم کی زبان سے
طبیب العرب کا خطاب حاصل کیا۔ طبابت کے تعلق سے اُسنے نوشیرواں کے دربار میں بھی
رسائی حاصل کی تھی۔ اسکا بیٹا نضر بن حارث اس سے زیادہ نامور ہوا اور اس کی بدولت علم
طب کو عرب میں زیادہ ترقی ہوئی یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے جب فارس پر لشکرکشی کی تو فوج
کے ساتھ بہت سی طبیب و جراح بھی بھیجے۔

امیر معاویہ نے عرب کو چھوڑ کر دمشق کو پایۂ تخت بنایا اور سلطنت اور دربار کے ٹھاٹھ
جمائے۔ چنانچہ ایک عیسائی طبیب جسکا نام ابن آثال تھا خاص دربار کا طبیب مقرر ہوا۔
اس کے سوا اور بہت سی طبیب دربار سے تعلق رکھتے تھے۔

تمدن کی وسعت کے ساتھ اس صیغہ کو بھی برابر ترقی ہوتی گئی اور ملک میں بہت سے جراح وطبیب پیدا ہو گئے جو بطور خود اپنے گھروں پر علاج کرتے تھے کیونکہ اسوقت تک شفاخانوں کا طریقہ نہیں قائم ہوا تھا۔ سب سے پہلے جس نے اسکی بنیاد ڈالی وہ حکومت بنی اُمیّہ کا تیسرا تاجدار ولید بن عبدالملک تھا۔ ولید کو رفاہ عام کے کاموں سے طبعی لگاؤ تھا۔ اور اس صیغہ میں بہت سے کام ہیں جو اوّل اسی کے ہاتوں سے عمل میں آئے۔ اوّل اسی نے مہمان خانہ عام قائم کیا ملک میں جسقدر اندھے اور مفلوج تھے سب کی فہرست مرتب کرا کے اُنکے وظیفے مقرر کر دیئے اور ہر ایک کے ساتھ ایک ایک خادم متعین کیا۔ جذامیوں کے روزینے مقرر کر دیئے اور حکم دیا کہ گھر سے نہ نکلنے پائیں۔ اسی سلسلہ میں شفاخانہ کی بنیاد ڈالی جو ۸۸ھ ہجری میں بنکر طیار ہوا اور بہت سے طبیب و جراح علاج کے لیئے متعین ہوئے[۱]

سب سے پہلا شفاخانہ

محکمہ طبابت کے قائم ہونے سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہودی و عیسائی علما کثرت سے دربار میں باریاب ہوئے اور یونانی علوم و فنون سے واقف ہونیکا رستہ کھلا۔ کیونکہ طب کی عمدہ تصنیفات یونانی ہی زبان میں تھیں اور اُن کے ترجمہ کے بغیر علاج اور دوا سازی وغیرہ میں ترقی نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں ماسرجویہ یہودی نے اہرن قس کی کتاب کا سُریانی زبان سے ترجمہ کیا۔ اور یہ کتاب شاہی کتب خانہ میں داخل کی گئی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد حکومت میں اس ترجمہ کو کتب خانہ سے نکلواکر نقلیں کرائیں اور بہت سے نسخے تمام لوگوں کی استعمال کے لیئے شائع اور مشتہر کیئے[۲]

رفتہ رفتہ تمام ملک میں کثرت سے شفاخانے قائم ہوگئے دولت عباسیہ کے آغاز میں جندیساپور کے شفاخانہ نے جسکا مہتمم اور معالج جارجس تھا نہایت شہرت پائی۔ جارجس یونانی

جارجس

[۱] مقریزی دوم ۴۰۵ [۲] طبقات الاطبا صفحہ ۱۶۳ جلد اول۔

زبان کا بہت بڑا ماہر تھا اور فنِ طب میں اجتہاد کا منصب رکھتا تھا۔ اسنے شفاخانوں کے استعمال کے لیئے سریانی زبان میں ایک نہایت عمدہ قرابادین طیار کی جسکا ترجمہ ازاں بعد میں حنین بن اسحاق نے عربی میں کیا۔ ۱۴۸ھ ہجری میں خلیفہ منصور عباسی بیمار ہو کر زندگی سے مایوس ہوگیا تو جارجیس کے نام طلبی کا فرمان بھیجا۔ جارجیس نے شفاخانہ کا اہتمام بیٹے کے سپرد کیا اور دربارِ خلافت میں حاضر ہوا۔ اس کے علاج سے منصور کو شفا ہوگئی۔ منصور کی فرمائش سے اسنے یونانی زبان کی بہت سی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کیں۔ اس مشہور شفاخانہ کا دوسرا ڈاکٹر سابور بن سہل تھا جو متوکل کے زمانہ میں تھا اور ۲۵۵ھ ہجری میں وفات پائی۔ اسنے ایک نہایت مفصل قرابادین طیار کی جس میں سترہ باب تھے۔ کئی سو برس تک تمام شفاخانوں میں اسی قرابادین پر عمل درآمد رہا۔ ماسویہ جو ایک نامی طبیب گذرا ہے اور جس کے حالات علامہ ابن ابی اصیبعہ نے کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ اسی ہسپتال میں تیس برس تک دوا سازی اور مرہم پٹی کا کام کرتا رہا۔

ویدک کا داخل ہونا

عباسیوں کے ابتدائی زمانہ تک تمام شفاخانوں میں یونانی یا فارسی طبابت کے اصول کے موافق علاج ہوتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ برامکہ کے طفیل سے ویدک بھی شامل ہوگئی۔

یحییٰ بن خالد برمکی نے جو ہرون الرشید کا وزیرِ اعظم اور دولت عباسیہ کا دست و بازو تھا ایک شخص کو ہندوستان بھیجا کہ وہاں جو دوائیں اور نباتات علاج میں برتی جاتی ہیں اُنکو بہم پہنچا کر ساتھ لائے۔ یحییٰ نے ہندوستان کے نامی طبیبوں اور ویدکوں کو بھی دربار میں طلب کیا چنانچہ منکہ سالے۔ اور ابن دہن۔ بغداد میں آئے۔ منکہ نے بہت سی سنسکرت کتابوں کا جو طب کے متعلق تھیں عربی زبان میں ترجمہ کرایا۔ ابن دہن اس شفاخانہ کا افسر

سلہ فہرست ابن الندیم۔ صفحہ ۳۰۳۔

مقرر ہوا جو خاندان برامکہ نے بغداد میں تعمیر کرایا تھا۔ بغداد میں اسوقت اگرچہ بہت سے شفاخانے موجود تھے مگر یہ جدت برامکہ ہی کے ہسپتال کو حاصل تھی کہ اُسکا افسر اور ڈاکٹر ایک ہندو حکیم تھا۔ اس واقعہ سے۔ ہم مسلمانوں کی بے تعصبی اور علمی قدردانی کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں۔ سسرو جو ہندوستان کا ایک مشہور حکیم گذرا ہے۔ فن طب میں اسکی ایک نہایت عمدہ تصنیف دس مقالوں میں تھی۔ یحییٰ نے منکہ کو اس کے ترجمہ پر مامور کیا[۱]۔ اور جب ترجمہ طیار ہو گیا تو حکم دیا کہ شفاخانوں میں قرابادین کے طور پر کام میں لایا جائے۔

ہرون الرشید نے ایک خاص ہسپتال اور تعمیر کرایا اور ماسویہ کو جسکا ذکر اوپر گذر چکا ہی اسکا مہتمم اور ڈاکٹر مقرر کیا۔ رشید کے زمانہ میں طبابت کا مستقل اور وسیع سررشتہ قائم ہو گیا متعدد شفاخانے ایک ایک ڈاکٹر کی نگرانی میں تھے۔ اور ایک شخص تمام شفاخانوں کا انسپکٹر جنرل ہوتا تھا جو رئیس الاطبا کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ یہ عہدہ اول بختیشوع کو سنہ ۱۷۱ ہجری میں اور بعد اس کے بیٹے جبرئیل کو سنہ ۱۷۵ ہجری میں ملا۔ جبرئیل کی تنخواہ دس ہزار درہم ماہوار تھے اور پانچہزار ماہوار بھتہ تھا[۲]۔ یہ تو خاص عہدہ کی تنخواہ تھی۔ دربار خلافت۔ زبیدہ خاتون برامکہ وغیرہ کے ہاں سے جو سالانہ مقرر تھا اُس کی تعداد کئی لاکھ تھی جس کی تفصیل خود جبرئیل کے کاغذات حساب سے علامہ ابن ابی صیبعہ نے نقل کی ہے۔ بختیشوع اور جبرئیل دونوں باپ بیٹے عیسائی تھے۔ اور باوجود اسکے ہرون اور مامون کے دربار میں انکو یہ عزت حاصل تھی کہ وزرا اور اُمرا اُن کے دست نگر رہتے تھے یہاں تک کہ جبرئیل کا بیٹا بختیشوع۔ لباس۔ سواری ساز و سامان حشمت و شوکت میں خود خلیفۂ وقت کا مقابلہ کرتا تھا۔

انسپکٹر جنرل شفاخانجات کی تنخواہ

یہ تعجب ہی کہ باوجود اس کے کہ تمام ممالک اسلامی میں ہر جگہ شفاخانوں کا رواج ہو گیا تھا

---

[۱] فہرست ۳۰۳ [۲] طبقات۔ صفحہ ۱۳۲ و ۱۷۳۔

مصر میں ایک مدت تک اس مقصد کے لیئے کوئی خاص عمارت نہیں تعمیر ہوئی۔ علامہ مقریزی نے
معافر کے ایک شفاخانہ کا ذکر کیا ہے جو فتح بن خاقان وزیر خلیفہ المتوکل باللہ کے حکم سے تعمیر ہوا
تھا۔ لیکن اسکی بنا کی تاریخ یا اور کسی قسم کی تفصیل نہیں لکھی۔ اس سے زیادہ یہ کہ ابن طولون کے
ہسپتال کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس سے پہلے مصر میں کوئی شفاخانہ موجود نہ تھا۔ ہماری ذات
میں اسکی یہ وجہ ہے کہ اسلام سے پہلے مصر فن طب کا مشہور درسگاہ تھا اور بہت بڑے بڑے
حکیم وطبیب موجود تھے جو یونانی حکما کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے۔ ان حکما کی وجہ سے مطب و
علاج کو نہایت ترقی تھی۔ ہر حکیم کا گھر گویا ایک مستقل شفاخانہ تھا۔ اور ممکن بلکہ غالب احتمال یہ ہے
کہ باقاعدہ شفاخانے بھی موجود رہے ہوں۔ اسلام کے بعد ولید کے زمانہ سے شفاخانوں
کی بنیاد پڑی اور رفتہ رفتہ اسکا وسیع سررشتہ قائم ہوگیا۔ لیکن اس صیغہ کا تمام اہتمام
مدت تک عیسائیوں کے ہاتھ میں تھا اور وہی انسپکٹر جنرل اور ڈاکٹر وغیرہ مقرر ہوتے تھے اسلئے
میں چنداں ضرورت نہ تھی کہ جو مطب گاہیں یا شفاخانے نہایت عمدگی کے ساتھ پہلے سے
قائم تھے انکو بے رونق کر دیا جائے اور نئی عمارتیں قائم کی جائیں۔ بہرحال وجہ جو کچھ ہو احمد بن
طولون کے زمانہ تک مصر میں کوئی اسلامی شفاخانہ موجود نہ تھا۔

احمد بن طولون۔ دولت عباسیہ کیطرف سے مصر و مغرب و شام کا گورنر تھا۔ اور چونکہ سلطنت
عباسیہ کو روز بروز ضعف ہوتا جاتا تھا۔ اسکی حالت مستقل سلطنت تک پہنچ گئی تھی ۲۶۱ھ ہجری
میں اسنے ایک نہایت عظیم الشان شفاخانہ کی بنیاد ڈالی۔ اور طیاری کے بعد بہت سی جائداد
اس کے مصارف کے لیئے وقف کی۔ صرف کا تخمینہ ساٹھ ہزار دینار ہوا جس کے کم سے کم
تین لاکھ روپے ہوتے ہیں اس میں علاج کا دستور یہ تھا کہ جب بیمار علاج کے لیئے آتا تھا تو اس کے
کپڑے اور جو کچھ اس کے پاس نقدی ہوتی تھی لے لی جاتی تھی۔ اور شفاخانہ کے خزانچی کے

پاس امانت رہتی تھی۔ شفاخانہ کی طرف سے اُسکو نیا کپڑا اور بچھانے کے لیئے بستر ملتا تھا۔ صبح اور شام دونوں وقت جرّاح اور ڈاکٹر اُس کے دیکھنے اور دوا و خوراک وغیرہ میں کمی بیشی کرنے کی غرض سے آتے تھے۔ جب صحیح ہوکر اتنی طاقت آجاتی تھی کہ روٹی اور مُرغ کا شوربا کھانے لگتا تھا تب اُسکو اُسکی امانت واپس کردی جاتی تھی اور ہسپتال سے چلے جانے کی اجازت ملتی تھی۔ احمد بن طولون ہمیشہ ہر جمعہ کو خود ملاحظہ کے لیئے آتا تھا۔ اور دواخانہ وغیرہ کی جانچ کرتا تھا۔ اسکے ساتھ ایک ایک مریض کے پاس جاکر دیکھتا تھا اور اُنکا حال دریافت کرتا تھا[ہ]۔ پاگلوں کے علاج کے لیئے الگ کمرے تھے اور نہایت خبرگیری سے اُنکا علاج ہوتا تھا

ایک جدّت

احمد بن طولون نے اس صیغہ میں ایک اور جدّت کی جو اور کہیں نہ تھی۔ سنہ ۲۶۳ ھجری میں اسنے جو بہت بڑی عظیم الشان جامع مسجد ایک لاکھ دینار کے صرف سے بنوائی اسمیں ایک طرف ایک وسیع مکان بنوایا جس میں ہر وقت ہر قسم کی دوائیں اور شربت موجود رہتے تھے۔ ایک طبیب مقرر تھا جو ہمیشہ جمعہ کے دن وہاں نماز کے اول وقت سے اخیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ مسجد میں اتفاقیہ کوئی شخص کسی عارضہ میں مبتلا ہوجاتا تھا تو طبیب کے پاس لایا جاتا تھا اور اُس کا علاج ہوتا تھا۔

خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد میں شفاخانوں کی ترقی

خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانے میں اس صیغہ کو نہایت ترقی ہوئی اور بہت سی نئی باتیں ایجاد ہوئیں۔ علی بن عیسیٰ وزارت کا منصب رکھتا تھا اور اسکو رفاہ عام کے کاموں پر نہایت توجہ تھی۔ اتفاق یہ کہ اُس زمانہ میں کثرت سے وبائی امراض پھیلے۔ سنان بن ثابت بن قرہ جو بہت بڑا مشہور طبیب و صابی المذہب تھا۔ شفاخانوں کا انسپکٹر جنرل تھا۔ علی نے اسکو متعدد فرمان اس بارہ میں لکھے اور شفاخانوں کے متعلق نئے نئے کارخانے قائم کیئے۔ سب سے

ہ یہ تمام تفصیل علامہ مقریزی نے کتاب الخطط والآثار میں لکھی ہے دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۴۰۵ جلد دوم۔

پہلے یہ کیا کہ چونکہ اسوقت تک جیلخانوں کے لیئے علیحدہ ڈاکٹر نہیں ہوتا تہا۔ اس نے سنان کو حکم دیا کہ چند طبیب خاص جیلخانوں میں علاج کرنے کے لیئے مقرر کیئے جائیں۔ ٹمپریری ڈسپنسری یعنی عارضی ہسپتالوں کا صیغہ قائم کیا۔ بہت سے طبیب مقرر ہوئے کہ چہوٹے چہوٹے قصبات میں جہاں طبیب اور شفاخانے نہیں ہیں دورہ کریں۔ اور ہر جگہہ دو دو چار چار دن ضرورت کے موافق قیام کرکے بیماروں کا علاج کریں ان طبیبوں کے ساتہ ایک مختصر دواخانہ ہوتا تہا اور قصبات اور دیہات میں علاج کرتے پہرتے تہے۔

جیلخانہ کا ہسپتال
عارضی شفاخانے

ایک نئی بات یہ ہوئی کہ امتحان کا طریقہ قائم ہوا جو اس سے پہلے بالکل مروج نہ تہا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۳۱۹ھ میں ایک نیم حکیم نے ایک بیمار کا غلط علاج کیا اور وہ مرگیا۔ خلیفہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو یہ حکم صادر ہوا کہ کوئی شخص باقاعدہ جب تک امتحان نہ دے مطب و علاج نہ کرنے پائے۔ سنان بن ثابت ممتحن مقرر ہوا اور ہزاروں طبیبوں نے امتحان دیا۔ بغداد کی وسعت اور تمدن کا اس سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ آٹھ سو ساٹھ آدمی امتحان میں پورے اُترے اور اُنکو سند عطا کی گئی حالانکہ امتحان میں وہ لوگ شامل نہ تہے جنکا کمال پہلے سے مسلم تہا۔ یا جو لوگ دربار سے تعلق رکہتے تہے۔ سند میں تصریح ہوتی تہی کہ کس درجہ کا امتحان دیا ہے اور کس قسم کے علاج کی اسکو اجازت دی گئی ہے۔

امتحان کا طریقہ
قایم ہوا

آٹھ سو طبیب
سند یافتہ تہے۔

مقتدر نے ان انتظامات کے علاوہ متعدد بڑے بڑے شفاخانے قائم کیئے۔ ایک شفاخانہ اپنی ماں کے نام سے قائم کیا جسکا سالانہ خرچ سات ہزار دینار تہا جسکے اوّل مرتبہ ۳۵۰۰۰ پینتیس ہزار روپیہ ہوئے۔ یہ شفاخانہ آب ہوا و منظر کی خوبی کے لحاظ سے دجلہ کے کنارے تعمیر کیا گیا۔ محرم ۳۰۶ھ ہجری میں افتتاح کی رسم عمل میں آئی اور بہت سے طبیب جراح معقول مشاہرہ پر متعین ہوئے۔ اسی سنہ میں ایک اور شفاخانہ اپنے نام سے قائم کیا جسکا ماہانہ خرچ

دوسو دینا یعنی ہزار روپیہ ماہانہ تھا[1]

علی بن عیسےٰ وزیر سلطنت نے اپنے صرف سے محلہ حربیہ میں ۳۰۲ہجری میں ایک شفا خانہ قائم کیا۔ اور مشہور طبیب ابو سعید بن یعقوب اسکا ڈاکٹر مقرر ہوا۔ اس زمانے کے قریب یعنی ۳۱۳ہجری میں محلہ درب المفضل میں۔ ابن الفرات نے ایک ہسپتال قائم کیا۔ اور ثابت بن سنان کو اُس کے اہتمام کی خدمت دی[2]۔ یہ وہ شفا خانے ہیں جو خاص بغداد میں تعمیر ہوئے اور جن کے حالات ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ معلوم کر سکے لیکن اسلامی فیاضیوں نے تمام ممالک میں جس کثرت سے اس قسم کی مفید یادگاریں قائم کی ہوں گی انکا شمار کون کر سکتا ہے۔

بغداد۔ اگرچہ شفا خانوں سے معمور تھا تاہم آبادی کی کثرت کے لحاظ سے ابھی اور ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کے لحاظ سے عضد الدولہ نے ایک اور شفا خانہ قائم کیا جس کی وسعت خوبی عمارت۔ کثرت آلات۔ ترتیب اور درستی کے لحاظ سے مورخین نے تسلیم کیا ہے کہ تمام دنیا میں کوئی شفا خانہ اس کے مثل تعمیر نہیں ہوا

علامہ ابن خلکان کے خاص الفاظ یہ ہیں لیس فی الدنیا مثل ترتیبہ۔ واعدلہ من الالات مایقصر الشرح عن وصفہ۔ عضد الدولہ دنیا کے مشہور بادشاہوں میں سے ہے۔ اسلام کی تاریخ میں وہ سب سے پہلا فرمانروا ہے جو بادشاہ کے نام سے پکارا گیا۔ بغداد میں خلفائے عباسیہ کے سوا خطبہ میں کسی کا نام نہیں پڑھا گیا تھا۔ یہ فخر سب سے پہلے عضد الدولہ ہی کو حاصل ہوا۔ اسکی سلطنت نہایت وسیع اور منتظم تھی۔ وہ خود نہایت علم دوست اور خاص کر

---

[1] یہ تمام تفصیل طبقات الاطبا صفحہ ۲۲۱ و ۲۲۲۔ اور منتقی سے اخبار ام القری ۱۶۱ میں ہے۔

[2] طبقات صفحہ ۲۲۲

رفاہ عام کے کاموں کا نہایت دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے عہد میں حفظان صحت کے صیغہ کو نہایت ترقی دی۔ تمام اضلاع اور قصبات میں نئے شفاخانے قائم کیے اور پرانوں کی اصلاح اور مرمت کرائی جس عظیم الشان شفاخانہ کا ہم نے اوپر ذکر کیا اسکی عمارت ۳۷۱ہجری میں انجام کو پہنچی۔ یہ شفاخانہ درحقیقت ایک میڈیکل یونیورسٹی تھے نہایت کثرت سے ہر قسم کے آلات مہیا کیے گئے تھے۔ اور بہت سے مشہور طبیب لیکچر دینے کے لیئے مقرر تھے علاج کے لیئے دور دور سے مشہور طبیب بلوا کر متعین کیے گئے تھے ان سب کی تعداد اول ۱۰۰ تھی انتخاب کے بعد گھٹ کر ۲۴ رہ گئے جن میں ابن کشکرایا۔ ابو یعقوب۔ ابن کشکرایا۔ ابو عیسی۔ بقیہ۔ ابو حسنو۔ جیسے نامور اطبا داخل تھے۔

جراحوں میں سے ابو الخیر۔ ابو الحسن نفاح زیادہ نامور تھے۔ پٹی باندھنے والوں کا افسر ابو الصلت تھا جو اس فن میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔

بہت سے کحال تھے جن میں زیادہ مشہور ابو النصر بن الدحلی تھا۔ فزیکل سائنس کے بہت سے اساتذہ تھے۔ غرض فن طب کی جسقدر شاخیں ہیں سب کے مشہور ماہر اور استاد انہیں لیکچر دینے اور علاج کرنے کے لیئے مقرر تھے۔ اور ہر صیغہ میں متعدد لیکچرار اور پروفیسر تھے۔ آگے چلکر ایک مناسب موقع پر ہم بعض کے حالات بھی لکھیں گے۔

چوتھی صدی میں سلطنت اسلام کی وسعت نے بہت سے مستقل تخت پیدا کر دیئے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ سامانیہ۔ حمدانیہ۔ بنو عقیل۔ غزنویہ۔ فاطمیہ۔ نوریہ۔ ایوبیہ۔ اتابکیہ وغیرہ بڑی بڑی پرزور اور وسیع سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ اگرچہ اس تفرق اجزا سے مجموعی قوت کو صدمہ پہنچا لیکن رفاہ عام کے صیغہ کو بہت ترقی ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ جو نئی حکومت قائم ہوتی تھی اسکو قبول عام حاصل کرنے کے لیئے اس سے بڑھ کوئی آلہ نہ تھا۔ اس سلسلے نے طبابت کو بھی بہت

فروغ دیا اور ہر جگہ نہایت کثرت سے شفاخانے قائم ہوئے۔ چھٹی صدی میں جب علامہ ابن جبیر نے حج کی تقریب سے عراق و شام کا سفر کیا تو بغداد۔ موصل۔ حران۔ حلب۔ حماۃ۔ دمشق میں اس کثرت سے شفاخانے دیکھے کہ حیران رہ گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے سفرنامے میں ان شہروں کے شفاخانوں کا ذکر تفصیل اور اجمال کے ساتھ کیا ہے۔ اس عہد میں سلطان نورالدین اور صلاح الدین نے تمام ممالک میں کثرت سے جو شفاخانے قائم کیے اُن میں سے بعض مشہور شفاخانوں کا ذکر ہم اس مقام پر کرتے ہیں۔

نوریہ یہ شفاخانہ نورالدین زنگی نے دمشق میں تعمیر کرایا تھا۔ کروسیڈ کے معرکوں میں یورپ کا ایک فرمانروا نورالدین کی قید میں آگیا تھا۔ اُس نے ایک بیش قرار رقم اپنی رہائی کے لیئے پیش کی اور نورالدین نے اُسکو رہا کردیا۔ شفاخانہ مذکور اسی رقم سے طیار ہوا اور اس سے اُسکی لاگت کی مقدار کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کے خوب صورت اور بلند دروازے مؤیدالدین نے طیار کیئے تھے جو نجاری میں نہایت کمال رکھتا تھا۔ اور جس نے محض فن نجاری کی تکمیل کے لیئے اقلیدس اور مجسطی کی تکمیل کی تھی[1]

شفاخانوں کا اب تک یہ دستور تھا کہ اُمرا اور دولتمندوں کو اُسمیں علاج کرانیکی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن نورالدین نے جو وقف نامہ لکھا اُسمیں یہ اجازت دی کہ "جو نایاب دوائیں یہاں کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتیں اُن کے استعمال میں غریب اور امیر سب یکساں ہیں"۔ علامہ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ میں اُسکو دیکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اسمیں بہت سے محرر منشی طبیب خدام۔ نوکر ہیں۔ بیماروں کا رجسٹر منشیوں کے پاس رہتا ہے اور اُس میں بیماروں کے نام و نشان کے علاوہ اُنکے مصارف اور ضروریات کی تفصیل لکھی جاتی ہے۔ اطبا صبح کیوقت

---

[1] طبقات الاطباء صفحہ ۱۹۰

ہمیشہ ہر روز بیماروں کو دیکھتے ہیں اور اُن کی دوا اور غذا کی خبرگیری کرتے ہیں۔ روزانہ خرچ کم وبیش ستو اروپیہ ہے۔ علامہ مذکور نے لکھا ہے کہ دمشق میں اسی قسم کا ایک اور شفاخانہ ہے لیکن یہ نیا ہے اور زیادہ پرشان وشوکت ہے۔

سلطان صلاح الدین نے جب فاطمیین کی سلطنت کو برباد کیا تو شاہی ایوانوں میں سے ایک نہایت شاندار ایوان تھا جس کی دیواروں پر پورا قرآن مجید لکھا ہوا تھا۔ سلطان نے اسکو دیکھکر کہا کہ یہ مکان شفاخانہ کے لیئے موزوں ہے۔ چنانچہ ۵۷۷ھ ہجری میں اسکو تھوڑے سے تغیر اور اصلاح کے بعد شفاخانہ بنایا۔ اور بہت سے طبیب و جراح۔ علماے طبعیات مشرف عامل۔ خدام مقرر کیے[۱]

علامہ ابن جبیر نے اسکی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں "قاہرہ کا یہ شفاخانہ صلاح الدین کے مفاخر میں سے ہے۔ وہ ایک نہایت خوبصورت اور شاندار ایوان ہے۔ بہت سے کمرے ہیں ہر کمرہ میں پلنگ بچھے ہیں جنپر سلیقہ سے بچھونے اور تکئے لگے ہیں۔ دواؤں کے لیئے الگ کمرہ ہے اور اُس کے لیئے دواساز اور منشی وغیرہ مقرر ہیں۔ عورتوں کے علاج کے لیئے اسی سلسلہ میں ایک جداگانہ قطعہ ہے اور اُن کی خدمت۔ خبرگیری اور علاج کے لیئے عورتیں مامور ہیں۔ پاگلوں کے علاج کے لیئے الگ مکانات ہیں جنکا احاطہ نہایت وسیع ہے اور دریچوں میں لوہے کی جالیاں ہیں۔ شفاخانہ کا اہتمام ایک طبیب کرڈی کے متعلق ہے۔ اس کے ماتحت بہت سے نوکر ہیں جو صبح وشام دونوں وقت بیماروں کا ملاحظہ کرتے ہیں اور انکی غذا اور دوا میں تبدیلی اور اصلاح کرتے رہتے ہیں۔ سلطان ہمیشہ خود شفاخانہ کے ملاحظہ کے لیئے آتا ہے اور بیماروں کے معالجہ و خبرگیری کی سخت تاکید کرتا ہے" علامہ مذکور نے

---

[۱] مقریزی صفحہ ۴۰۰ جلد دوم۔

لکھا ہے کہ "قاہرہ میں بعینہ اسی درجہ کا ایک اور شفاخانہ ہے"۔ سلطان مذکور نے اسکندریہ میں جو شفاخانہ قائم کیا وہ بھی نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا۔ اور ایک خاص بات میں تمام اور شفاخانوں سے ممتاز تھا۔ یعنے جو لوگ شفاخانہ کے علاج کو خلاف شان سمجھتے تھے۔ اُن کے علاج کے لیئے۔ الگ طبیب و جراح مقرر تھے جو اُن کے گھروں پر جاکر علاج کر آتے تھے۔ ایک یہ تخصیص تھی کہ یہ قاضی صرف اُن لوگوں کے لیئے مخصوص تھی جو مسافر اور اجنبی ہوتے تھے

نورالدین اور صلاح الدین کی تقلید نے شفاخانوں کے رواج کو اور ترقی دی ۶۷۶ھ میں ملک منصور قلاؤن جو اُس زمانہ تک فوجی افسر تھا۔ ایک سفر میں دمشق پہنچکر قولنج کے عارضہ میں مبتلا ہوا۔ چونکہ مرض نہایت شدید تھا اور اطبا نے جو کمیاب دوائیں تجویز کیں وہ اور کہیں نہیں مل سکتی تھیں اس لیئے نورالدین کے شفاخانہ سے دوائیں منگوائی گئیں قلاؤن کو جب شفا ہوگئی تو شفاخانہ کے ملاحظہ کے لیئے گیا۔ اور دیکھکر متعجب ہوگیا۔ دل میں نیت کی کہ "سلطنت حاصل ہوگی تو اس سے بڑھ کر شفاخانہ بنواؤنگا" ۶۷۸ھ ہجری میں جب تخت نشین ہوا تو شفاخانہ کی تعمیر شروع کی۔ جہاں تک ہمکو معلوم ہے شفاخانہ عضدیہ کے سوا تمام ممالک اسلامی میں اس عظمت کا کوئی شفاخانہ کبھی تعمیر نہیں ہوا۔ اور بعض خصوصیتوں کے لحاظ سے تو اسکو عضدیہ پر بھی ترجیح حاصل تھی۔

فاطمیین کے شاہی مکانات میں سے ایک بڑا وسیع محل تھا جسکو خلیفہ العزیز باللہ کے بیٹے نے تعمیر کرایا تھا۔ ان کی حکومت کی بربادی کے بعد سلطان صلاح الدین کے قبضہ میں آیا اور اسی کے خاندان میں وراثۃً چلا آتا تھا۔ قلاؤن نے شفاخانہ بنانیکا ارادہ کیا تو اس سے زیادہ موزوں کوئی عمارت نہیں مل سکتی تھی۔ چنانچہ مالک مکان سے اسکو خریدا اور ۶۸۳ھ میں شفاخانہ کی بنیاد ڈالی۔ اس مکان کی قدیم صورت یہ تھی کہ چار بڑے بڑے ایوان تھے اور

مکان کا کل احاطہ ۱۰۶۰۰ گز تھا احاطہ ہی میں ایک نہر تھی جس کے ذریعے سے ایوانوں میں پانی
آتا تھا۔ قلاوُن نے ایوانات بدستور رہنے دیئے اور بہت سی نئی عمارتیں اضافہ کیں تین سو
قیدی اور بہت سے مزدور روزانہ کام کرتے تھے مصر و قاہرہ میں جس قدر راج اور معمار تھے
عام حکم تھا کہ شفاخانہ کے سوا اور کہیں کام نہ کرنے پائیں۔ ستون جسقدر تھے عموماً سنگ مرمر یا
سنگ رخام کے تھے۔ قلاوُن خود روزانہ عمارت کے ملاحظہ کے لیئے جاتا تھا۔ غرض
اس اہتمام اور سر و سامان سے پورے گیارہ مہینے میں عمارت بنکر طیار ہوئی۔ علامہ سخاوی
نے لکھا ہے کہ یہ شفاخانہ قاہرہ کی نامی اور عظیم الشان عمارتوں میں سے شمار کیا جاتا ہے۔
قلاوُن نے اس کے مصارف کے لیئے بہت سی جائداد وقف کیں جن کی سالانہ آمدنی
دس لاکھ درہم تھی۔ وقف نامہ میں لکھا کہ یہ شفاخانہ امیر۔ غریب۔ غلام۔ آقا۔ بادشاہ۔ رعیت
سب کے لیئے عام ہے۔ بلکہ جو لوگ شفاخانہ میں نہ آئیں وہ بھی اس کی دوائیں استعمال کر سکتے ہیں

ایک خاص التزام یہ تھا کہ ہر مرض کے علاج کے لیئے جدا جدا کمرے تھے۔ چنانچہ بخار والوں
کے لیئے قدیم کے چاروں ایوان تھے۔ آشوب چشم۔ لرزہ۔ اسہال وغیرہ بیماریوں کے لیئے
الگ الگ مکانات تھے۔ مردوں اور عورتوں کی تفریق الگ تھی یعنی دونوں کے لیئے جدا
جدا قطعے تھے ان کے علاوہ اور بہت سے کمرے تھے۔ جو کھانا پکانے۔ دوا بنانے۔ بیماروں
کے رجسٹر رکھنے۔ طب کے درس دینے اور اسی قسم کے کاموں کے لیئے مخصوص تھے لطف
یہ کہ ان تمام کمروں میں نہر کے ذریعہ سے پانی آتا تھا۔ اور ہر وقت پانی کی جدولیں جاری رہتی تھیں

شفاخانہ کے ساتھ ایک مدرسہ بھی تھا جس میں چاروں مذہب کے فقیہ تعلیم دیتے تھے
انتظام کی درستی اور ترتیب کے لیئے شفاخانہ کو متعدد صیغوں میں تقسیم کیا تھا اور ہر صیغہ کا سکرٹری
الگ تھا۔ جس کثرت سے لوگ اس میں علاج کو آتے تھے اُنکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ

معمولی شربت چھوڑ کر شربت انار وغیرہ کے روزانہ پانسو رطل صرف ہوتے تھے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی بہت سی شفاخانے قائم ہوئے سنہ ۶۲۸ ہجری میں خلیفہ مستنصر نے مکہ معظمہ میں جو عالیشان شفاخانہ بنوایا تھا۔ شریف مکہ حسن بن عجلان نے سنہ ۹۱۲ھ میں چالیس ہزار کے صرف سے اس کی مرمت کی۔ سلطان ظاہر بیبرس المتوفی سنہ ۶۷۶ ہجری نے مدینہ منورہ کے قدیم شفاخانہ کی مرمت کی۔ اور مصر سے ایک طبیب اور ہر قسم کی معجون اور دوائیں بھجوائیں۔

ہندوستان میں بھی کثرت سے شفاخانے موجود تھے اور اگر ہم مقریزی کی روایت کا اعتبار کریں تو صرف ایک شہر دہلی میں محمد تغلق کے زمانہ میں ستر شفاخانے جاری تھے۔"
جہانگیر نے سنہ ۱۰۱۴ ہجری میں تخت نشین ہونے کے ساتھ جو بارہ احکام صادر کیے اُنمیں ایک تھا "در شہرہائے کلاں دار الشفاہا ساختہ اطبا بجہت معالجہ بیماراں تعین نمایند وانچہ صرف و خرچ می شدہ باشد از سرکار خالصہ شریفہ می دادہ باشند۔"

شفاخانہ کی تاریخ میں چند امور لحاظ کے قابل ہیں

(۱) شفاخانوں کے کثرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جو شفاخانے کسی بادشاہ کے دور حکومت میں قائم ہوتے تھے وہ اسوجہ سے آیندہ برباد نہیں ہونے پاتے تھے کہ شفاخانہ اور اُسکے متعلق جو جائداد ہوتی تھی وقف میں داخل تھی اور وقف میں شرعاً کسی کو تصرف کا اختیار نہیں ہے۔ نیا حکمراں جو حکومت کے تخت پر بیٹھتا تھا وہ قدیم یادگاروں پر خواہ مخواہ کچھ اضافہ کرتا تھا۔

(۲) شفاخانہ کی کوئی قسم اور کوئی نوع ایسی نہ تھی جو موجود نہ تھی۔ سفری شفاخانے اور جیل خانوں کے شفاخانہ کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ فوجی شفاخانہ کا بھی نہایت معقول انتظام تھا۔ طبیبوں اور دواؤں کا انتظام تو خود صحابہ رض کے زمانہ میں موجود تھا۔ لیکن فوجی شفاخانہ کی

باقاعدہ بنیاد سب سے اول سلطان محمود نے ڈالی۔ سلجوقیوں کا فوجی شفاخانہ دو سو اونٹوں پر چلتا تھا

(۳) ایک خاص امر قابل لحاظ ہے کہ وقتاً فوقتاً جو اطبا۔ شفاخانوں کے افسر یا انسپکٹر جنرل مقرر ہوتے تھے وہ عموماً مجتہد الفن اور استاد الفن ہوتے تھے۔ ابو بکر رازی جو فن طب کا ایک رکن ہے اور جسکی تصنیفات سے (جو سو سے متجاوز ہیں) ابن سینا نے فائدہ اٹھایا ہے رے کے شفاخانہ کا ڈاکٹر تھا۔ سعید بن یعقوب دمشقی جو ۳۰۲ھ ہجری میں بغداد۔ مکہ۔ و مدینہ کے شفاخانوں کا افسر مقرر ہوا مشہور حکیم گذرا ہے۔ اس نے عربی زبان میں یونانی وغیرہ سے بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ سنان بن ثابت جو مقتدر باللہ کے زمانہ میں شفاخانوں کا انسپکٹر جنرل تھا۔ فن طب کے ارکان میں سے شمار کیا جاتا ہے طبقات الاطبا میں اس کے حالات پڑھنے سے اسکی وقعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

عضدیہ شفاخانہ میں ہمیشہ ۲۴ طبیب کام کرتے تھے اور ہر ایک اپنے فن کا استاد ہوتا تھا انہیں سے بعض کا حال ہم نہایت اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں۔

ابو الحسن کشکرایا۔ یہ مشہور حکیم تھا اور پہلے سیف الدولہ کے دربار میں نوکر تھا۔ سنان بن ثابت کے تمام شاگردوں میں نہایت ممتاز تھا۔

نظیف القس۔ عیسائی تھا اور بہت سی زبانیں جانتا تھا۔ یونانی سے بہت سی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کیں۔

ابو الفرج۔ یہ حکیم اور فلاسفر تھا۔ اور عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ اس نے ارسطو اور بقراط اور جالینوس کی کتابوں پر بہت سی مفید شرحیں اور حاشیے لکھے۔ ابن سینا نے اپنی ... میں اسکا ذکر کیا ہے اور اسکے کمال کا اعتراف کیا ہے۔ وہ شفاخانہ میں علاج ... لکچر بھی دیتا تھا۔ اس کی تصنیفات کی مطول فہرست طبقات الاطبا میں

لیکچر بہی دیتا تھا۔ اس کی تصنیفات کی مطول فہرست طبقات الاطبا میں مذکور ہے

ابراہیم بن بکس مختلف زبانیں جانتا تہا۔ عربی زبان میں یونانی وغیرہ کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ یہ طب پر لیکچر دیا کرتا تہا

سعید بن ہبۃ اللہ خلیفہ مستظہر باللہ کا طبیب تہا۔ اسکی تصنیفات میں سے مغنی۔ کتاب الاقناع وغیرہ ہیں۔

امین الدولہ بن تلمیذ۔ مشہور عیسائی حکیم تہا۔ سُریانی۔ فارسی۔ عربی۔ زبانیں جانتا تہا خلیفۂ وقت نے اسکو بغداد کے محکمہ طبابت کا افسر مقرر کیا تہا اور تمام اطبا اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تہے۔ عضدیہ شفاخانہ بہی اسی کی ماتحتی میں تہا۔ اس کی بہت سی مفید تصنیفات یادگار ہیں

(۳) شفاخانوں کے ساتھ دواؤں کے عمدہ بہم پہنچنیکا بہی نہایت اہتمام تہا عطار جو دوائیں بیچتے تہے اُن کی جانچ اور امتحان کے لئے ایک خاص محکمہ تہا جس کے افسر کا لقب رئیس العشابین ہوتا تہا۔ اس عہدے پر ہمیشہ وہ اطبا مقرر ہوتے تہے جو نباتات کے فن میں کمال رکہتے تہے۔ چنانچہ ساتویں صدی میں اس عہدہ پر ضیا ابن بیطار المتوفی سنہ ۶۴۶ ہجری کا تقرر ہوا جو اس فن میں اس درجہ کا کمال رکہتا تہا کہ مسلمانوں میں کوئی شخص اسکا ہمسر پیدا نہیں ہوا۔ نباتات اور ادویہ پر یونان میں جو کتابیں لکہی گئیں۔ اور اُنپر مسلمانوں نے جو کچھ اضافہ کیا تہا۔ اسکو حفظ یاد تہیں لیکن اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ خود دور دراز ملکوں کا سفر کیا۔ یونان۔ اٹلی۔ جزائر بحر روم میں نباتات کی تحقیقات کی۔ مصوّریں سے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے تہے گہانسوں اور بوٹیوں کی تصویریں کہنچواتا تہا اور ان کی مختلف حالتوں کی تاثیریں جداگانہ قلمبند کرتا تہا۔ اس نے یونانیوں کی بہت سی غلطیاں ظاہر کیں اور بہت سی نئی نباتات اور بوٹیاں دریافت کیں جو یونانیوں کو معلوم نہ تہیں!!

ضیا ابن بیطار
ماہر نباتات

(۴) شفاخانوں میں جو لوگ اعمال ید مثلاً جراحی۔ کحالی۔ فصادی۔ وغیرہ کاموں پر مامور ہوتے تھے وہ فن طب کے پورے ماہر ہوتے تھے۔ آج کل کے ہندوستانی اطبا کا سا حال نہ تھا کہ جراحی و فصادی کو ہات نہیں لگاتے۔ قاہرہ میں سلطان صلاح الدین نے جو شفاخانہ قائم کیا تھا۔ اس میں کحالی کی خدمت قاضی نفیس الدین المتوفی [illegible] ہجری کے سپرد تھی جو تمام مملکت مصر کے افسر الاطبا رہے تھے۔ شفاخانۂ عضدیہ میں ابوالخیر اور ابوالحسن بن تفاح جراحی کا کام کرتے تھے۔ ہڈیوں کے جوڑنے اور مرہم پٹی کرنے پر حکیم ابوالصلت مقرر تھا۔

اسلامی شفاخانوں کی یہ نہایت مختصر تاریخ ہے۔ اسلام میں اس صیغہ کو اسقدر وسعت ہوئی تھی کہ شفاخانوں کے حالات اور شفاخانوں کے تجربوں پر بہت سے اطبا مثل ابوبکر رازی امین الدولہ بن تلمیذ۔ ابوسعید زاہد العلما۔ نے مستقل کتابیں لکھیں۔ مگر افسوس ہے کہ وہ کتابیں آج دنیا سے ناپید ہیں۔ اس لیئے ناظرین کو مجبوراً ہماری محدود اور ناکافی معلومات پر قناعت کرنی چاہیے

اسلامی کتب خانے

اسلامی قدیم کتب خانوں کی یہ ایک نہایت اجمالی تاریخ ہے۔ اگرچہ اس امر سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تصنیف و تالیف اور علمی ذخیروں کا مرتب و محفوظ رکھنا مسلمانوں کا قومی شعار تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں جس کثرت سے جابجا کتب خانے اور دارالعلم پائے جاتے تھے شاید دنیا کی تاریخ میں اُس کی نظیر نہیں مل سکتی تاہم یہ سخت تعجب ہے کہ کتب خانوں کے حالات میں آج تک کوئی کتاب بلکہ مضمون تک نہیں لکھا گیا جغرافیہ کی کتابوں میں کسی شہر کا حال لکھتے ہیں تو ہر قسم کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن کتب خانوں کا نام تک نہیں آتا۔ یہی خیال ہے جسنے مجھکو اس مضمون کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اگرچہ میں تسلیم

کرتا ہوں کہ عنوان کے لحاظ سے مضمون کو نہایت مفصل اور وسیع ہونا چاہیئے تھا لیکن جن واقعات کو قدما نے نظر انداز کر دیا ہو اُن کے متعلق مشکل سے کچھ اجمالی حالات مل سکتے ہیں اور مفصل تو بالکل نہیں ملتے۔ اس لیئے مجبوراً ہمارے ناظرین کو اسی پر قناعت کرنی چاہیئے۔

یہ مضمون اگرچہ بظاہر عنوان کی حیثیت کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے لیکن اس سے دو اہم بالشان مسئلوں کا فیصلہ ہو سکتا ہے جو تعلیم یافتہ ملکوں میں مدت سے زیر بحث ہیں اور جن کی نسبت بڑے بڑے مشہور مصنفوں نے تعصب آمیز غلطیاں کی ہیں۔ وہ مسئلے یہ ہیں۔

(۱) مسلمانوں نے غیر قوموں کی یادگاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ (۲) مسلمانوں نے غیر قوموں کے متعلق جو تاریخی حالات لکھئے کہاں تک قابل اعتبار ہیں؟۔

عرب میں تحریر کی ابتدا کب ہوئی؟

اسلام میں کتابوں کے جمع کرنے اور کتب خانہ کی صورت میں ترتیب دینے کا زمانہ اگرچہ دولت بنی اُمیہ کے عہد سے شروع ہوتا ہے لیکن اس امر کی تحقیق کے لیئے کہ جو خزانہ دولت بنی اُمیہ کے عہد میں جمع ہوا اسکا سرمایہ کہاں سے آیا ہوگا۔ ہمکو اس سے پیشتر زمانہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ عرب میں شعر و شاعری اور انساب کا چرچا اگر نہایت قدیم زمانہ سے تھا مگر تحریر کا مطلق رواج نہ تھا۔ سب سے پہلے جس نے اس فن کی بنیاد ڈالی وہ قبیلہ طے کے تین شخص تھے یعنی مرامر۔ اسلم۔ عامر۔ ان لوگوں نے ایک جا جمع ہو کر حرفوں کی شکل اور وضع قرار دی اور حروف ہجا اس ترتیب سے مقرر کئے جیسے سریانی زبان میں تھے۔ ان لوگوں سے حیرۃ والوں نے سیکھا۔ حیرہ والوں کا ایک شاگرد جسکا نام بشر بن الولید تھا اور دومۃ الجندل کا رئیس تھا کسی کام سے مکہ معظمہ گیا۔ وہاں ابوسفیان (امیر معاویہ کے باپ) سے ملاقات ہوئی ابوسفیان نے اس سے اس فن کے سیکھنے کی درخوست کی۔ چنانچہ ابوسفیان اور ابوقیس بن عبد مناف دو شخص اُس کے شاگرد ہوئے اور چونکہ یہ دونوں تجارت کے ذریعہ سے

طائف آیا جایا کرتے تھے۔ طائف میں بھی تحریر کا رواج ہو گیا۔ بشر نے مصر اور شام میں بھی بہت لوگوں کو شاگرد کیا اور رفتہ رفتہ اکثر قبائل میں تحریر کا رواج ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تو صرف ایک قبیلۂ قریش میں ۱۷ شخص صاحبِ قلم موجود تھے جنمیں یہ حضرات بھی تھے عمر بن الخطاب علی بن ابی طالب۔ عثمان بن عفان۔ ابو عبیدہ بن الجراح وغیرہ عورتوں میں بھی اس فن کا رواج ہو چلا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر کے گھرانے میں شفا بنت عبداللہ اور حضرت حفصہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ مدینہ منورہ میں بھی اسلام سے پہلے تحریر کا رواج تھا جس کے موجد یہود تھے[1]

اس سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اشعار و قصائد جو عرب کی تمدن و معاشرت کی اصلی تصویر ہیں اور جواب تک زبانی روایت ہوتے آتے تھے قلمبند ہونے لگے اور ان کی حفاظت کا بڑا ذریعہ نکل آیا چنانچہ سات مشہور قصیدے جو معلقات کے نام سے مشہور ہیں آب زر سے لکھے گئے اور کعبہ پر آویزاں کیے گئے۔

عرب کی زبان میں پہلا اضافہ؟

اسلام کے آغاز یعنی جناب رسالت پناہ کی وفات تک جو تحریری سرمایہ وجود میں آیا وہ قرآن مجید کی متفرق سورتیں، رسول اللہ کے نامہائے مبارک، صلح حدیبیہ وغیرہ کے معاہدے، شعرا کے قصائد تھے۔ آنحضرت کے بعد اگرچہ تحریر و کتابت کو زیادہ وسعت ہوئی لیکن امیر معاویہ کے زمانہ تک جو کچھ سرمایہ وجود میں آیا وہ زبان یا مذہب کے متعلق تھا۔ امیر معاویہ نے جب دمشق میں تخت سلطنت پر اجلاس کیا تو ایک عیسائی طبیب جس کا نام ابن آثال تھا دربار میں حاضر ہوا اور امیر معاویہ نے اس کی بہت قدر کی۔ اس نے ان کے استعمال کے لیے طب کی بعض کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کیں اور یہ پہلا اضافہ تھا جو عرب زبان کے سرمایۂ ...

---

[1] یہ تمام تفصیل فتوح البلدان بلاذری کے خاتمہ میں مذکور ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کا کتب خانہ؟

اگرچہ اس کے بعد عرب کا تحریری سرمایہ برابر ترقی کرتا گیا۔ لیکن یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ ان تحریروں کو ایک منتظم کتب خانہ کی صورت میں کس نے جمع کیا اور اس اولیت کا فخر کس کو حاصل ہے۔ ہمارے مورخین تو ان باتوں کو مہتم بالشان نہیں سمجھتے کہ ان کے لیے جداگانہ عنوان بنائیں البتہ کہیں کسی ضمنی تذکرہ میں کچھ ذکر آجاتا ہے تو اُس سے کچھ کچھ پتہ چلتا ہے۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبار میں حکیم ماسرجویہ کے حال میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ماسرجویہ کی ایک کتاب جو اُس نے سُریانی زبان سے عربی زبان میں ترجمہ کی تھی خزانۃ الکتب (کتب خانہ) میں پائی اور کتب خانہ سے نکلوا کر اُس کے نسخے شائع کرائے۔" اس تصریح اور نیز اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانہ کا طریقہ اس عہد سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ غالباً اوّل جس شخص نے اِس طریقہ کی بنا ڈالی وہ خالد بن یزید بن معاویہ تھا۔

مؤرخ بن خلدون کو تو تعجب اور انکار ہے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں ایسا مذاق علمی کہاں پیدا ہو سکتا تھا اور اسلیئے ان کے نزدیک خالد کے واقعات افسانہ سے زیادہ شبہ نہیں رکھتے لیکن علامہ ابن الندیم نے اس کی نسبت لکھا ہے کہ خالد بن یزید حکیم کے لقب سے پکارا جاتا تھا وہ خود فاضل تھا اور بلند ہمتی کے ساتھ علوم کی محبت رکھتا تھا۔ اُسکو صنعت کا خیال آیا تو اُس نے اُن یونانی فلاسفروں کو جمع کیا جو مصر میں رہا کرتے تھے اور فصیح عربی بولتے تھے۔ ان لوگوں کو اُس نے حکم دیا کہ علم صنعت میں جو جو کتابیں یونانی اور قبطی زبانوں میں ہیں اُن کے ترجمے عربی زبان میں کرے۔"

یہی مؤرخ ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے کہ خالد کے لئے طب۔ نجوم۔ کیمیا۔ کی تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں' خالد۔ خود بھی مصنف تھا اور اُس کی تصنیفات میں سے جو کتابیں مؤرخ ابن الندیم کے زمانہ تک موجود تھیں اور خود اس مؤرخ کی نظر سے گذریں اُنکے

یہ نام ہیں۔ کتاب الحرارۃ۔ کتاب الصحیفۃ الکبیر۔ کتاب الصحیفۃ الصغیر۔

ان دو باتوں کے ثابت ہونے کے بعد یعنی یہ کہ دولت اموی میں حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانہ سے پہلے شاہی کتب خانہ قائم ہو چکا تھا۔ اور یہ کہ خاندان اُمیہ میں اول جس شخص نے قدیم تصنیفات کی جستجو اور تلاش کی وہ خالد بن یزید تھا۔ یہ قیاس یقین کے قریب پہنچ جاتا ہے کہ کتب خانہ کی اول جس نے بنیاد ڈالی وہ یہی خالد تھا۔ خالد کے بعد تالیفات اور تصنیفات کو بے انتہا ترقی ہوئی۔ اشعار عرب۔ لغت۔ انساب۔ ایام العرب۔ غزوات۔ سیر۔ تفسیر۔ حدیث۔ فقہ۔ کلام وغیرہ کے متعلق ایک بڑا سرمایہ پیدا ہو گیا۔ خلیفہ منصور نے غیر زبانوں کی سیکڑوں کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں۔ یہاں تک کہ خلیفہ ہٰرون الرشید نے اس عجیب و غریب عظیم الشان دار العلم کی بنیاد ڈالی جس کا نام بیت الحکمۃ تھا۔

بیت الحکمۃ

یہ بیت الحکمۃ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک کتب خانہ کے لیے خاص تھا اور دوسرا غیر زبانوں کے ترجمہ کے لیے۔ اس عظیم الشان کتب خانہ میں عربی زبان کے علاوہ ہندی فارسی۔ یونانی۔ قبطی۔ کالڈی۔ زبانوں کی بیشمار کتابیں مہیا کی گئی تھیں۔ یحییٰ بن خالد برمکی نے جو ہٰرون الرشید کا وزیر اعظم اور خلافت عباسیہ کا چشم و چراغ تھا۔ ہندوستان میں قاصد بھیجے اور بڑے بڑے نامی پنڈت اور حکیموں کو دربار میں بُلایا۔ یہی پنڈت تھے جن کی وجہ سے ہندوستان کا بہت بڑا سرمایہ علمی بغداد میں پہنچا۔ فارسی تصنیفات زیادہ کثرت سے فراہم ہوئیں کیونکہ خاندان برامکہ فارسی الاصل تھا اور انکو اپنی زبان اور علوم کے ساتھ نہایت محبت اور شیفتگی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ کتب خانہ کے افسر فارس کے خاندان سے تھے ہٰرون الرشید نے کتابوں کی فراہمی اور تدوین کے ذوق میں نہایت بے تعصبی سے کام لیا جسکا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ علان شعوبی کو بیت الحکمۃ میں ترجمہ و کتابت کی

خدمت پر مقرر کیا حالانکہ یہ شخص ہمیشہ عرب کی ہجو گوئی میں مصروف رہتا تھا اور قبائل عرب میں سے ہر قبیلہ کے عیوب میں الگ الگ کتاب لکھی تھی۔

مامون الرشید

مامون الرشید نے اپنے عہد میں اس کتب خانہ کو نہایت ترقی دی اور بہت سے ایرانی علما اُس کے مہتمم اور افسر مقرر کیے۔ جنہیں اکثر مثلاً سہل بن ہرون۔ سعید بن ہرون۔ وغیرہ شعوبی[1] تھے جو عرب کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُن کے عیوب کی پردہ دری کرتے رہتے تھے۔ اس سے یہ نہیں خیال کرنا چاہیئے کہ مامون کو قومی حمیت کا پاس نہ تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ فارس کی تصنیفات کے زیادہ تر واقف کار یہی شعوبی تھے اور اس لیئے اُن کے انتخاب سے چارہ نہ تھا۔

اس کے سوا مامون الرشید کو فارس کے ساتھ ایک خاص تعلق بھی تھا۔ وہ ماں کی طرف سے فارسی الاصل تھا۔ فضل بن سہل جو اُسکا وزیر اعظم اور خلافت کا بانی تھا فارسی تھا۔ اُسکے اکثر درباری بھی فارسی نسل سے تھے۔ ابتداء خلافت میں جب وہ مرو میں رہا کرتا تھا فارسی اثر اُسپر اسقدر غالب آگیا تھا کہ فارسی ہی تصنیفات پیش نظر رکھتا تھا اور وضع۔ لباس طریق انتظام بلکہ خیالات میں بھی فارسیوں ہی کی تقلید کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اردشیر کے تزک کو دستور العمل قرار دیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ تعجب کی بات نہیں کہ اس نے فارسی تصنیفات کی طرف زیادہ توجہ کی لیکن وہ اور زبانوں کی تالیفات کے بہم پہنچانے میں بھی بڑے شوق سے مصروف رہا۔ یونانی کتابوں کے جمع کرنے اور اُن کے ترجمہ کرانے میں اُس نے جو تعجب انگیز کوششیں کیں اُنکو ہم گذشتہ تعلیم اور المامون میں مفصل لکھ چکے ہیں۔

مامون نے اس عظیم الشان کتب خانہ میں عرب جاہلیۃ کے زمانہ کا بھی بہت کچھ سرمایہ

[1] شعوبی ایک عجمی فرقہ تھا جو عرب کی تحقیر و مذمت کرتا تھا۔ اور اُن کے عیوب کی پردہ دری کرنا اپنا فرض جانتا تھا۔

جمع کیا تھا۔ جاہلیوں کے قصائد اور اشعار کے علاوہ اس زمانہ کے خطوط۔ دستاویزات۔ معاہدے۔ جہاں تک مل سکے نہایت کوشش سے فراہم کیے تھے۔ اس کتب خانہ میں عبد المطلب بن ہاشم کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرضہ کا ایک رقعہ موجود تھا جو چمڑے پر لکھا ہوا تھا اور اس کے یہ الفاظ تھے۔ حق عبد المطلب بن هاشم من اهل مكة على فلان بن فلان الحميري من اهل وزل صنعا۔ عليه الف درهم فضة كيلا بالحديدة ومتى دعاه بها اجابه شهد الله والملكان[1]۔

ابن ابی الحریش جو ایک مشہور جلد ساز تھا کتب خانہ میں جلد سازی کے کام پر مامور تھا۔ مامونی کتب خانہ کی وسعت اور کتابوں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باوجود اس کے کہ بغداد پر اکثر تباہیاں آئیں اور انقراض زمانہ سے اس کے علمی خزانے ہمیشہ برباد ہوتے رہے۔ تاہم اس کتب خانہ کی بچی کچی بہت سی کتابیں ساتویں صدی ہجری تک موجود تھیں جو خوش قسمتی سے علامہ ابن ابی اصیبعہ کو ہاتھ آئیں۔ علامہ موصوف نے ان کتابوں کا ذکر حنین بن اسحق کے ترجمہ میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان پر حنین کے ہاتھ کی تحریریں تھیں اور مامون کا طغرا بنا ہوا تھا۔

مامون کے عہد سے کتابوں کے جمع کرنے کا شوق تمام بغداد میں پھیل گیا۔ اکثر وزراء و امرا بلکہ عام علماء بڑے بڑے کتب خانے رکھتے تھے اور کتابوں کے مہیا کرنے میں بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ فتح بن خاقان۔ متوکل باللہ کے وزیر نے جو عظیم الشان کتب خانہ جمع کیا تھا اور جسکا مہتمم علی بن یحییٰ منجم تھا اس زمانہ میں عموماً بے نظیر خیال کیا جاتا تھا۔ محمد بن عبد الملک زیات جو خلیفہ واثق باللہ کا وزیر تھا کتابوں کی نقل و کتابت ترجمہ پر مامور ہوا۔

---

[1] کتاب الفہرست لابن الندیم صفحہ ۵۔

دس ہزار روپیہ صرف کرتا تہا۔ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں لکہا ہے کہ "علامہ واقدی نے جب وفات کی تو چھ سو قمطر کتابیں چھوڑیں اور ہر قمطر دو آدمیوں کا بوجھ تہا۔ حالانکہ مرنے سے پہلے وہ اپنے کتب خانہ کا ایک حصہ دو ہزار اشرفیوں کو بیچ چکے تہے"۔

یہ شوق برابر ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ چوتھی صدی میں تمام ممالک اسلام میں جابجا کثرت سے کتب خانے تیار ہو گئے چنانچہ اس صدی کے بعض مشہور اور نادر کتب خانوں کا ذکر ہم کسیقدر تفصیل کے ساتھ کرتے ہیں۔

اس زمانہ میں غالباً سب سے بڑا کتب خانہ جو تیار ہوا وہ اسپین کا کتب خانہ تہا جسکو حکم مستنصر نے قائم کیا تہا۔ مؤرخ بن خلدون و صاحب نفح الطیب نے اس کتب خانہ کی جو کیفیت لکہی ہے وہ درحقیقت تعجب انگیز ہے حکم خاندان بنی امیہ کا (جو سپین میں حکومت کرتے تہے) ایک مشہور خلیفہ تہا۔ اس کی سلطنت نہایت وسیع اور منتظم تہی۔ وہ بہت بڑا وسیع النظر عالم تہا اور کتابوں کے جمع کرنے کا اسقدر شائق تہا کہ ملک کا خراج اس کے مصارف کے لیے کافی نہیں ہوتا تہا۔ اسپین۔ شام۔ مصر۔ بغداد۔ فارس۔ خراسان کے اضلاع میں اس کے سیکڑوں گماشتے اور سوداگر اس کام پر مامور تہے کہ نادر اور عمدہ قدیم و جدید کتابیں بہم پہنچائیں۔ علامہ ابو الفرج اصفہانی نے جب کتاب الاغانی ختم کی تو حکم نے خاص قاصد بہیجا کہ "قبل اس کے کہ یہ کتاب اُن ممالک میں شائع ہو ہمارے کتب خانہ میں آجائے"۔ چنانچہ چار ہزار روپیہ پر یہ کتاب خریدی گئی اور سب سے پہلے حکم کے کتب خانہ میں داخل ہوئی۔ قاضی ابو بکر ابہری کی تصنیف بہی اسی طرح بہم پہنچائی گئی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ کتب خانہ چار لاکھ کتابوں پر مشتمل تہا۔ مؤرخ ابن خلدون و ابن الابار نے تصریح کی ہے کہ "صرف اشعار و قصائد کے مجموعوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تہی وہ آٹھ سو اسی ۸۸۰ صفحوں میں تہی"۔

حکم کو نایاب کتابوں کے بہم پہنچانے کے ساتھ اُن کی درستی او زیب و زینت کا بھی شوق تھا اس غرض سے اُس نے نہایت نامور اور باکمال خوش نویس مصحح۔ جلد ساز۔ جمع کیے تھے اور انکو بیش قرار تنخواہیں دیتا تھا۔ اگرچہ یہ کتب خانہ خود حیرت انگیز تھا لیکن بانی کتب خانہ کی وسعت نظر اُس سے زیادہ تعجب انگیز ہے۔ مورخوں نے بیان کیا ہے کہ انمیں سے کثر کتابیں اُس کی نظر سے گذری تھیں اور اُنپر اُسنے مفید حاشیے چڑھائے تھے۔ ہر کتاب کے شروع میں وہ مصنف کا نام و نسب۔ تولد و وفات۔ لکھتا تھا اور ایسے عجیب و غریب نکتے اور فوائد درج کرتا تھا جنکا پتہ اُس کی تحریر کے سوا اور کہیں نہیں ملسکتا تھا۔ حکم نے ۳۶۶ھ میں وفات پائی۔

اسلامی دنیا کا دوسرا حصہ جو عباسیوں کے زیر نگیں تھا اس میں دولت عباسیہ کے ضعف کی وجہ سے طوائف الملوکی ہوگئی تھی اور ہر جگہ الگ الگ تاج و تخت کے دعویدار پیدا ہوگئے تھے۔ بخارا۔ میں سامانی خاندان کی حکومت تھی۔ جرجان۔ میں قابوس بن وشمگیر فرمانروا تھا۔ شام۔ کے اضلاع بنوحمدان کے ہات میں تھے۔ شیراز۔ آل بویہ کا پائے تخت تھا۔ مصر میں فاطمیین فرمانروا تھے۔ لیکن یہ عجیب اتفاق تھا کہ یہ سب صاحب علم تھے اور اہل علم کے نہایت قدردان تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے بڑے بڑے کتب خانے قائم کیے تھے۔ اور بیشمار کتابیں جمع کی تھیں۔

نوح بن منصور نے (بخارا کا بادشاہ اور بڑی سطوت و جبروت کا بادشاہ تھا) جو کتبخانہ قائم کیا تھا وہ اُس زمانہ میں بہت سی حیثیتوں کے لحاظ سے بے نظیر خیال کیا جاتا تھا۔ علامہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ اس عدیم المثل کتب خانہ میں ہر علم و فن کی کتابیں تھیں اور انمیں بہت سی ایسی تھیں جنکا پتہ اس کتب خانہ کے سوا اور کہیں نہیں ملسکتا تھا۔ شیخ بو علی سینا نے اِس

حال میں بیان کیا ہے کہ "فلسفہ وغیرہ کی کتابیں جو میں نے یہاں دیکھیں کہیں نہیں دیکھی تھیں
اور نہ اوروں نے انکو دیکھا ہوگا"۔ بوعلی نے اس کتب خانہ کی صورت یہ بیان کی ہے کہ "ایک
بہت بڑا مکان ہے جسمیں بہت سے کمرے ہیں۔ ہر کمرے میں متعدد صندوق ہیں جن میں
کتابیں اوپر تلے رکھی ہوئی ہیں۔ ہر فن کے لیئے جدا کمرہ ہے"۔[1]

عضدالدولہ کی سلطنت نہایت وسیع تھی اور اس زمانہ میں سب سے زیادہ ممالک اُسی
کے قبضہ اختیار میں تھے۔ فارس سے لیکر موصل و جزیرہ تک اُسکا عمل تھا اور خود **بغداد**
میں اُس کے نام کا خطبہ پڑہا جاتا تھا۔ وہ قابلیت حکومت کے ساتھ بہت بڑا شاعر تھا اور علوم و
فنون میں کامل دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے شیراز میں ایک عالیشان کتب خانہ قائم کیا جس میں
اسبات کا التزام کیا تھا کہ جسقدر کتابیں شروع اسلام سے اُس کے عہد تک تصنیف ہو چکی
تہیں سب مہیا کی جائیں۔ افسوس ہے کہ باستثنائے علامہ بشاری کے کسی مورخ نے
اس کتبخانہ کا حال نہیں لکھا۔ علامہ مذکور کی یہ عنایت بھی اسوجہ سے ہے کہ کتب خانہ مذکور اُس
عجیب و غریب عمارت کا ایک حصہ تھا جس کی نسبت علامہ بشاری کا بیان ہے کہ "مُنے
تمام ممالک اسلامیہ میں ایسی عمارت نہیں دیکھی اور میں قیاس کرتا ہوں کہ وہ بہشت کے
نمونہ کے موافق بنائی گئی ہے"۔ علامہ بشاری نے شیراز میں عضدالدولہ کے شاہی محل کا جہاں
ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ اسی عمارت میں یہ عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا جس کی صورت یہ
تھی ایک نہایت لمبا مکان ہے اور اس میں ہر طرف متعدد کمرے ہیں جن میں بہت سی
الماریاں دیوار سے لگی کھڑی ہیں۔ یہ الماریاں تین تین گز چوڑی اور قد آدم اونچی ہیں۔ لکڑی
عموماً منقش اور مذہب ہے۔ ہر فن کے لیئے جدا کمرہ ہے اور اس کی جداگانہ فہرست ہے۔ کتبخانہ

[1] ابن خلکان۔ تذکرہ شیخ بوعلی سینا۔

کے اہتمام و نگرانی کے لیئے وکیل اور خزانچی و محاسب مقرر ہیں اور بجز معتبر آدمیوں کی کسی شخص کا واں گذر نہیں ہو سکتا۔"

سیف الدولہ۔ تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا اور اسقدر علم دوست تھا کہ بقول امام ثعلبی کے اس کے دربار میں جسقدر شعرا اور اہل کمال جمع ہوئے خلفائے عباسیہ کے سوا کبھی کسی کے دربار میں نہیں جمع ہوئے۔ حکیم ابو نصر فارابی اسی کے دربار کا وظیفہ خوار تھا۔ سیف الدولہ کو فن ادب کی طرف زیادہ میلان تھا اس لیئے اُس نے اپنے کتب خانہ میں زیادہ تر اسی فن کی کتابیں جمع کیں۔ چنانچہ فن ادب کا ذخیرہ جسقدر اس کتب خانہ میں مہیا ہوا اور کہیں نہیں ہوا ہوگا۔

محمد بن ہاشم اور اُسکا بھائی کہ دونوں فن شاعری میں ممتاز تھے اس کتب خانہ کے مہتمم اور افسر تھے۔

اگرچہ یہ تمام کتب خانے بجائے خود بڑے بڑے دار العلوم تھے لیکن ان سب کا سرتاج اور اسپین کے نامور کتب خانہ کا حریف مقابل۔ فاطمیین مصر کا کتب خانہ تھا جسکے حالات علامہ مقریزی نے کتاب الخطط والآثار میں کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔

یہ کتب خانہ شاہی محل کا ایک حصہ تھا اور چالیس جدا جدا کتب خانوں پر مشتمل تھا جنمیں سے ایک کتب خانہ میں صرف علوم قدیمہ یعنی فلسفہ وغیرہ کی اٹھارہ ہزار کتابیں تھیں بعض مورخوں نے دعویٰ کیا ہے کہ کل اسلامی دنیا میں اس کی برابر کوئی کتب خانہ نہ تھا۔ اس امر میں کہ اس کی کتابوں کی مجموعی تعداد کیا تھی۔ مورخوں کے مختلف اقوال ہیں ابن الطویر نے دو لاکھ۔ ابن ابی واصل نے ایک لاکھ بیس ہزار اور ابن ابی طے نے چھ لاکھ ایک ہزار بیان کی ہے۔ غالباً یہ اختلاف اس وجہ سے ہوگا کہ ابن ابی طے وغیرہ نے ایک ہی کتاب کے

مختلف نسخوں کو الگ الگ کتاب شمار کیا کیونکہ اس کتب خانہ کی یہ بھی ایک خصوصیت تھی کہ ایک ایک کتاب کے مختلف نسخے موجود تھے اور ہر نسخہ کسی خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ خلیفہ عزیز باللہ کے دربار میں کتاب العین کا ذکر آیا تو اُس کے حکم سے داروغہ کتب خانہ نے کتاب مذکور کے تیس نسخے نکالکر پیش کیے جن میں سے ایک خود مصنف یعنی خلیل بن احمد بصری (موجد نحو) کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

اکثر کتابیں مطلا و مُذہّب اور جلدیں عموماً زرّیں تھیں۔ قدیم یادگاروں کا یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ مشہور خوشنویس مثلاً ابن مقلہ وابن البواب کے قلم کے تراشے جمع کیے تھے اور اُنکو صندوقوں میں بھر کر نہایت احتیاط سے رکھا تھا۔ بطلیموس کے ہاتھ کا بنایا ہوا کرہ جسپر ۱۲۵۰ برس گذر سے تھے اس کتب خانہ میں موجود تھا[۱]۔ ایک اور کرہ تھا جسکو ابو الحسن صوفی نے عضد الدولہ کے لیئے بنایا تھا اور جو پندرہ ہزار روپئے کو خریدا گیا تھا۔

کتب خانوں کے قائم کرنے کا شوق سلاطین اور والیان ملک پر محدود نہ تھا بلکہ اس زمانہ کے اکثر علما اور عہدہ داران ملکی کتب خانوں کو لازمۂ عزت سمجھتے تھے۔ ابو نصر سہل بن مرزبان نے جو نیشاپور کا ایک نامآور امیر تھا اپنی تمام دولت کتابوں کے جمع کرنے میں صرف کردی اور صرف کتابوں کی تلاش وجستجو میں اکثر بغداد کا سفر کیا اور نادر کتابیں بہم پہنچائیں[۲]۔

---

[۱] اسپین کی شاہی محل میں مسلمانوں کے زمانہ کی کچھ بچی کھچی کتابیں اسوقت تک موجود ہیں۔ سو برس سے زیادہ ہوئے کہ پروفیسر کاسیری نے ان کی ایک فہرست لاٹن زبان میں لکھی۔ یہ فہرست دو ضخیم جلدوں میں ہے اور اس میں کہیں کہیں کتابوں کے نام کے ساتھ کتاب کی اصلی عبارتیں بھی ہیں۔ بطلیموس کی کرہ کا ذکر میں نے اسی فہرست کی ایک عربی حوالہ سے لکھا ہے۔

[۲] یتیمۃ الدہر۔ تذکرہ سہل بن مرزبان۔

صاحب بن عباد کو جب نوح بن منصور نے وزارت کے لیے بخارا میں طلب کیا تو اُسنے عذر لکھ بھیجا کہ "مجکو ضروری ساز و سامان کے ساتھ لانے میں بڑی زحمت ہوگی اور صرف کتابوں کے لادنے کے لیے چار سو اونٹ درکار ہوں گے"[1]۔ اسی زمانہ میں محمد بن حسین بغدادی نے جو کتب خانہ قائم کیا وہ نادر او رنایاب کتابوں کے اعتبار سے عموماً بےنظیر تسلیم کیا جاتا تھا۔ علامہ ابن الندیم بغدادی نے باوجود اس وسعت نظر کے اعتراف کیا ہے کے "مَیں نے ایسا کتب خانہ کہیں نہیں دیکھا"۔ اس علمی خزانہ کے حالات بہت کم معلوم ہیں جسکی وجہ مورخین کی بے پروائی کے سوا یہ بھی ہے کہ خود محمد بن حسین بانی کتب خانہ نے اُسکو گمنامی کے پردہ میں رکھنا چاہا تھا۔ وہ کسی سے اُسکا ذکر تک نہیں کرتا تھا اور درحقیقت جو نایاب علمی یادگاریں اُس کے کتب خانہ میں موجود تھیں اُس کے لحاظ سے یہ احتیاط و بخل بیجا بھی نہ تھا۔ علامہ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ "میں نے بڑی مشکلوں سے محمد بن حسین تک رسائی حاصل کی اور جب اُسکو میری طرف سے اطمینان حاصل ہوگیا تو ایک دن اُس نے ایک بڑا تھیلا نکالا جس میں قدیم عرب کے اشعار و قصائد اور بہت سی پرانی دستاویزات او تحریریں تھیں۔ یہ قصائد اور تحریریں چمڑوں پر اور خراسانی۔ مصری۔ چینی۔ تہامی کاغذ پر تھیں۔ میں نے انکو خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ کہنگی کی وجہ سے اُن کی ہیئت بدل گئی تھی اور جا بجا سے حرف اُڑ گئے تھے۔ ان میں جو مجموعے اور اجزا تھے انپر اکثر علما کے دستخط اور سندیں تھیں۔ ان میں ایک قرآن مجید خالد بن ابی الہیاج کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا جو حضرت علیؑ کی صحبت میں رہا کرتے تھے حضرت علیؑ و امام حسنؑ و حسینؑ کے ہات کی متعدد تحریریں تھیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو خطوط سلاطین و سرداران تک ہزار بیا

[1] تیمیۃ الدہر۔ تذکرہ صاحب بن عباد۔

تاب سکے

لکھوائے تھے بجنسہ محفوظ تھے۔ نحو و لغت میں۔ اصمعی۔ ابن الاعرابی۔ سیبویہ۔ فرار۔ کسائی۔ وغیرہ کے ہات کی لکھی ہوئی کتابیں اور رسالے تھے۔ اسی طرح حدیث میں سفیان بن عیینہ ثوری۔ اوزاعی۔ وغیرہ کے ہات کی تحریریں تھیں"[۱]

علامہ ابن الندیم کا بیان ہے کہ اسی کتب خانہ کی بدولت مجکو اسبات کا علم ہوا کہ فن نحو ابوالاسود دؤلی کی ایجاد ہے وہ لکھتے ہیں کہ میں نے چار ورق کا ایک رسالہ دیکھا جو چینی کاغذ پر لکھا ہوا تھا اور جس کے شروع میں یہ الفاظ تھے۔ فیھا کلام فی الفاعل والمفعول من ابی الاسود الدؤلی بخط یحیی بن یعمر۔ اس تحریر کے نیچے چند قدیم علمائے نحو کے دستخط تھے۔

ابوجعفر احمد بن عباس نے جو کتب خانہ قائم کیا۔ اس میں چار لاکھ مجلد کتابیں تھیں"[۲]

قدیم کتابوں کی تلاش و جستجو میں جو مسلمانوں کو شغف اور اہتمام تھا وہ درحقیقت حیرت انگیز ہے۔ اس زمانہ میں قدیم سے یہ روایت چلی آتی تھی کہ اسلام سے پہلے ایرانیوں میں جب علوم و فنون کی ترقی تھی تو انکو یعنی ایرانیوں کو یہ خیال آیا کہ کتابوں کو ایسی حفاظت سے رکھنا چاہیئے کہ زمانہ دراز تک فنا نہونے پائیں۔ اس غرض سے وہ تمام علمی کتابیں ایک درخت کی چھال پر جسکو فارسی میں خدنگ اور عربی میں توز کہتے ہیں اور جو نہایت مضبوط ہوتی تھی لکھوایا کرتے تھے۔ جب اس قسم کا ایک بڑا سرمایہ جمع ہوگیا تو انہوں نے اصفہان کے اضلاع میں سے کہندز میں ایک بڑا کتب خانہ بنوایا اور یہ تمام کتابیں وہاں رکھوا دیں۔ کیونکہ تمام ایران میں آب و ہوا کے اعتدال کے لحاظ سے اس سے بہتر کوئی مقام نہ تھا۔ کی کرہ کا دور تک۔ اگرچہ انقراض زمانہ کی وجہ سے اس کتب خانہ کا نام و نشان نہیں رہا تھا

---

[۱] کتاب الفہرست صفحہ ۴۱ [۲] نفح الطیب مطبوعہ مصر جلد دوم صفحہ ۳۰۸۔

لیکن چونکہ یہ روایت عموماً مشہور تھی اس لئے اکثر شائقین بالخصوص اصفہان کے عہدداران ملکی ہمیشہ اس کی تلاش و جستجو میں رہتے تھے چنانچہ مختلف وقتوں میں کچھ کچھ سرمایہ ہاتھ آیا۔ ابومعشر فلکی نے لکھا ہے کہ "ہمارے زمانہ سے بہت پہلے کا واقعہ ہے کہ اس عمارت کا ایک حصہ ڈھ گیا اور اس میں نہایت قدیم زمانہ کی بہت سی کتابیں نکلیں جو قدیم فارسی زبان میں تھیں چنانچہ جو لوگ اس زبان کو جانتے تھے انہوں نے اس کو پڑھا"۔ ابن الندیم نے بیان کیا ہے کہ "سنہ ۳۵۰ ہجری میں اسی عمارت کے ایک اور حصہ میں بہت سی کتابیں نکلیں لیکن کسی سے پڑھی نہیں گئیں"۔ ابن الندیم نے اس روایت کے بعد لکھا ہے کہ جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ یہ ہے کہ ابن العمید نے سنہ ۳۴۵ ہجری میں بہت سی کتابیں بغداد میں بھیجیں جو اصفہان کی شہر پناہ سے صندوقوں میں رکھی ہوئی ملی تھیں۔ یہ کتابیں یونانی زبان میں تھیں اور چونکہ چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں نہایت متعفن ہو گئی تھیں۔ مدت تک انکو دھوپ دی گئی تب جا کر درست ہوئیں۔ یوحنا وغیرہ نے جو یونانی زبان جانتے تھے ان کتابوں کو پڑھا اور ان کے مضامین پر اطلاع حاصل کی[1]۔

فارس، عراق، شام میں جس اہتمام اور شوق سے ہزاروں کتب خانے قائم ہوئے اسپین نے اس سے بھی زیادہ فیاضیاں دکھائیں۔ قرطبہ (کارڈوا) میں یہ عام دستور ہو گیا تھا کہ ہر امیر ایک جدا کتب خانہ قائم کرتا تھا۔ اور اس بات کی سخت کوشش کرتا تھا کہ اس کے کتبخانہ میں ایسی نایاب کتابیں ضرور ہوں جو اور کہیں نہ پائی جائیں۔ یہ طریقہ۔ لازمہ امارت خیال کیا جاتا تھا اور امرا آپس میں کتب خانوں کے قائم کرنے پر مفاخرت اور حوصلہ آزمائیاں کرتے تھے۔ یہ طریقہ اسقدر عام ہو گیا تھا کہ جو امرا تعلیم یافتہ نہیں ہوتے تھے انکو بھی محض نمود کے لحاظ سے ایسا کرنا

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۱۔

پڑتا تھا۔ مورخ مقری نے اسپین کی تاریخ میں جہاں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے ایک حکایت نقل کی ہے کہ "اس زمانہ میں حضرمی ایک عالم تھے جنکو مدت سے ایک کتاب کی تلاش تھی۔ اتفاق سے ایک دن وہی کتاب نیلام ہو رہی تھی اُنہوں نے خریدنا چاہا لیکن ایک اور شخص اُس کے دام بڑھاتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ قیمت۔ کتاب کی حیثیت سے بہت بڑھ گئی۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ شاید آپ اس کتاب کے بڑے نکتہ شناس و قدر دان ہیں۔ اس نے کہا میں تو جاہل شخص ہوں لیکن چونکہ یہ کتاب میرے کتب خانہ میں نہ تھی اسلیے جس قیمت پر ملیگی میں اسکو ضرور خریدونگا"

اسپین کا ایک قصہ

اس زمانہ میں کتابوں کی قدر دانی کی یہ نوبت پہنچی تھی کہ ابو علی قالی (المتوفی ۳۵۶ھ) کے پاس جمہرۃ العرب کا ایک نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ جس کی قیمت تین سو مثقال سونا ملتا تھا لیکن اُنہوں نے کتاب کو الگ کرنا گوارا نہ کیا۔

اگرچہ تمام ممالک اسلامیہ میں نہایت کثرت سے جا بجا کتب خانے قائم ہو گئے تھے لیکن تیسری صدی بلکہ چوتھی صدی کے آغاز تک کسی پبلک کتب خانہ کا پتہ نہیں ملتا۔ جن کتبخانوں کا اوپر ذکر ہوا وہ لوگوں کے ذاتی کتب خانے تھے۔ غالباً سب سے پہلے جس نے اس عمدہ طریقہ کی بنیاد ڈالی وہ سابور بن اردشیر ایک امیر تھا جنے ۳۸۲ھ میں بغداد میں ایک دار العلم بنوایا اور بہت سی کتابیں عام لوگوں کے مطالعہ کے لیے وقف کیں۔ اسکے بعد ۳۹۵ھ ہجری میں حاکم بامر اللہ نے جو فاطمی خاندان سے مصر کا فرمانروا تھا ایک بڑا عظیم الشان عام کتب خانہ تعمیر کیا۔

پہلا پبلک کتب خانہ

یہ کتب خانہ جسکو مورخین نے ہمیشہ دار العلم کے نام سے یاد کیا ہے بڑی شان و شوکت سے کھولا گیا اور بہت سے قرّاء۔ منجّمین۔ اطبا۔ اُدبا۔ رسم افتتاح میں حاضر ہوئے اور کتابوں کی سیر کی۔ مکان بڑے ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا تھا اور تمام دروازوں اور گذرگاہوں پر پُر تکلف پردے لٹکائے گئے تھے۔ کتابوں کے مطالعہ اور نقل اور کتابت کی عام اجازت تھی اور اس غرض سے

مصر کا دار العلم

کاغذ۔ دوات۔ قلم۔ وغیرہ خود کتب خانہ کی طرف سے ہمیشہ مہیا رہتا تھا۔ بہت سے فقہا۔ اطبا۔ منطقیین۔ ریاضی دانوں کی تنخواہیں مقرر کی گئیں کہ ہمیشہ کتب خانہ میں حاضر رہیں اور اپنی معلومات کو ترقی دیں۔ چنانچہ ایک بار سنہ ۴۰۰ ہجری میں حاکم بامر اللہ نے ان بزرگوں کو مناظرہ کے لیے طلب کیا اور دیر تک صحبت کے بعد ہر ایک کو انعام اور خلعت عطا کی۔ سنہ ۴۰۳ ہجری میں اُسکے دائمی مصارف کے لیے بہت سے مکانات اور دکانیں وقف کیں۔

پبلک کتب خانوں کا عام رواج۔

اس زمانہ سے پبلک کتب خانوں کا طریقہ عام ہو گیا اور تمام ممالک اسلامیہ میں سیکڑوں ہزاروں کتب خانے قائم ہو گئے۔ کتب خانوں کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اسی زمانہ کے قریب مدرسوں اور یونیورسٹیوں کی بنیاد پڑی اور ہر مدرسے کے ساتھ کتب خانہ کا ہونا ایک ضروری بات قرار پائی۔ نظام الملک جسنے نظامیہ بغداد کی بنیاد ڈالی اُسنے عام حکم دیدیا تھا کہ تمام اسلامی ممالک میں جہاں جس جگہ کوئی ممتاز عالم ہو اُس کے لیے ایک مدرسہ اور مدرسے کے ساتھ ایک کتب خانہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ اُس کے زمانہ میں سیکڑوں ہزاروں مدرسے اور کتب خانے قائم ہو گئے اور یہ طریقہ عموماً رواج پذیر ہو گیا۔ مدرسوں کے سوا مسجدیں بھی اسی غرض کے لیے استعمال کی جانے لگیں اور اُسی کا بقیہ اثر ہے کہ آج قسطنطنیہ وغیرہ میں جسقدر مشہور مسجدیں ہیں ہر ایک کے ساتھ ایک بڑا کتب خانہ بھی ضرور ہے۔

پہلے سوال کا جواب

کتب خانہ کی اس اجمالی تاریخ بیان کرنے کے بعد ہمکو ان سوالات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جنکو ہم آغاز مضمون میں لکھ گئے ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسری قوموں کی علمی یادگاروں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا؟ یہ نصیب زمانہ ہونے والا خیال کا جزو بن گیا ہے اور جیسے ابوریحان بیرونی کی کتاب الہند پر نہایت مختصر دیباچہ لکھا ہے کتاب الہند کے

۵۱؎ ہدیۃ النصرۃ فی [illegible] مطبوعہ [illegible] صفحہ [illegible]

دیباچہ میں لکھتا ہے کہ "مسلمانوں نے کبھی قدیم باتوں کی کچھ پروا نہ کی اور اسوجہ سے قدیم قوموں کی نسبت جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ افسانہ کے قریب قریب ہوتا ہے"

پروفیسر مذکور عربی زبان میں کامل مہارت رکھتا ہے اور مسلمانوں کے متعلق اُنکی معلومات کچھ کم نہیں اسلیئے یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمانوں کے اس اہتمام و توجہ کا منکر ہوگا جو اُنہوں نے یونان کی علوم و تصنیفات کی طرف مبذول کی۔ اس لحاظ سے غالباً اُسکا یہ اعتراض ہندوستان فارس۔ بابل کی نسبت ہوگا۔

فارس کی علمی تاریخ

اس سوال کے حل کرنے کے لیئے ہمکو نہایت اختصار کے ساتھ فارس کی علمی تاریخ بیان کرنی چاہیئے۔ موجودہ وسائل علمی سے جہانتک معلوم ہو سکا ہے فارس میں علوم و فنون و اسباب تمدن کا ظہور جمشید کے زمانہ میں ہوا اور اسی زمانہ میں ہئیت و ہندسہ و جغرافیہ کی کتابیں لکھی گئیں ضحاک نے گو جمشید کی سلطنت کو برباد کر دیا لیکن علمی سرمایہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا بلکہ مشتری کے نام پر ایک نیا شہر آباد کر کے بُرجوں کی تعداد کے موافق بارہ محل بنوائے اور ان محلوں میں علمی کتابیں جمع کیں۔ اس زمانہ سے اسکندر کے زمانہ تک گو بڑے بڑے انقلابات ہوئے جنمیں ان خزانوں کا برباد ہونا بھی ایک ضروری امر تھا لیکن چونکہ تمدن و تہذیب کو ترقی تھی اسلیئے جو سرمایہ فنا ہوتا تھا بجائے اُس کے دوسرا پیدا ہو جاتا تھا۔ یہانتک کہ اسکندر یونانی کا زمانہ آیا۔ اس نامور شاہنشاہ کے عجیب و غریب کارناموں نے اگرچہ اس کے عیوب کو بالکل چھپا دیا ہے تاہم مورخوں کی نگاہ سے یہ امر پوشیدہ نہیں رہ سکتا کہ اس نے فارس کے تمام علمی خزانوں کو برباد کر دیا۔ کتابیں جلا دیں۔ پتھر کی چٹانیں اور سلیں جنپر کتبے اور تاریخی واقعات کندہ تھے توڑ پھوڑ کر برابر کر دیئے۔ البتہ اتنا کیا کہ کتابوں کو جلانے سے پہلے جہانتک ممکن ہوا یونانی زبان میں ان کے ترجمے کرائے اور انکو اسکندریہ بھیجدیا سکندریہ

کے بعد ایک مدت تک فارس میں طوائف الملوکی رہی اور علوم وفنون کے ساتھ کچھ اعتنا نہیں کیا گیا یہاں تک کہ ساسانیوں کا دور شروع ہوا اور اردشیر بابک نے طوائف الملوکی کو مٹا کر ایک وسیع سلطنت قائم کی۔ اردشیر نے علوم وفنون کو دوبارہ زندہ کیا اور ہندوستان روم اور چین سے علمی ذخیرے جمع کیے۔ اردشیر کے بعد اُسکا بیٹا سابور اور سابور کے بعد نوشیروان عادل نے علوم وفنون کو اور بھی زیادہ ترقی دی۔

ان واقعات سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کا قدم جب فارس میں پہنچا تو جو کچھ علمی ذخیرہ وہاں موجود تھا۔ ساسانیوں کے زمانہ کا تھا اور ہم دعوی کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے جہاں تک انکے امکان میں تھا اس ذخیرہ کو بڑے اہتمام اور بڑی جد وجہد سے محفوظ رکھا۔

ابتدائے فتح اور انقلاب سلطنت کے ہنگامہ میں اگر کوئی سرمایہ خود بخود برباد ہوا ہو تو ایسا ہونا قدرتی بات ہے تو اس کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ اس بات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ جس زمانہ (یعنی ابتدائے خلافت عباسیہ) تک مسلمانوں کو اپنے ہی علوم وفنون کی تدوین وترتیب کا خیال نہ تھا اُس کی نسبت یہ توقع رکھنی عبث ہے کہ وہ دوسروں کی زبان اور علوم پر توجہ کرتے۔ اسلام میں باقاعدہ اور منتظم طور پر علمی کارخانوں کی ابتدا خلیفہ منصور کے عہد میں ہوئی اور یہی زمانہ ہے جب حدیث۔ فقہ۔ تفسیر پر اول اول کتابیں لکھی گئیں۔ مسلمانوں کی علمی فیاضیوں کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ عین اُس وقت جبکہ انکو اپنے مذہبی علوم کی حفاظت وترتیب کا اہم کام پیش تھا اُسی وقت وہ غیر قوموں کی علمی یادگاروں کے بہم پہنچانے میں بھی مصروف تھے۔

خلیفہ منصور نے ایک طرف تو امام مالکؒ کو بلاکر حدیثوں کے جمع کرنے اور ایک کتاب مستقل لکھنے کے ہدایت کی۔ دوسری طرف ایرانیوں کی سب سے قدیم اور مفصل تاریخ کا جسکا نام

سبکتگین تہا اور جو فارسیوں کے نزدیک ایسی ہی عزت رکہتی تہی جیسی کہ ہندوؤں کے نزدیک
مہابہارت۔ ترجمہ کرایا۔

فارسی تصنیفات کے مترجم

مسلمانوں میں ایک گروہ کثیر گذرا ہے جو صرف فارسی تصنیفات کے ترجمہ میں مصروف تہا جنمیں سے چند ناموز شخصوں کا ذکر علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے۔ اور وہ یہ ہیں۔ فضل بن نوبخت۔ عبداللہ ابن المقفع۔ موسی بن خالد۔ یوسف بن خالد۔ علی بن زیاد۔ حسن بن سہل۔ احمد بن یحیی البلاذری۔ جبلہ بن سالم۔ اسحق بن یزید۔ محمد بن الجہم البرمکی۔ ہشام بن القاسم۔ موسی بن عیسے الکردی۔ زادویہ اصفہانی۔ محمد بن بہرام۔ بہرام بن مردان شاہ۔ عمر بن الفرخان۔

فارس کے علوم و فنون میں سے شاید ہی کوئی ایسا فن رہا ہو جسکی تصنیفات نہیں مہیا کی گئیں اور اسی پر نہیں اکتفا کیا گیا بلکہ انکے ترجمے بہی شائع کیے گئے۔

فارسی فن تاریخ کی کتابیں

چنانچہ فن تاریخ میں رستم و اسفندیار نامہ۔ بہرام نامہ۔ شہرزاد و پرویز۔ کارنامہ نوشیروان تاج نامہ۔ دارا و بت زرین۔ خدائے نامہ۔ بہرام و نرسی۔ نامہ نوشیروان لکہی گئیں۔

فن اخلاق کی کتابیں

فن اخلاق میں۔ زادو فرخ۔ موبد موبدان کی کتاب۔ الحکم والآداب۔ مجموعۂ اردشیر۔ نامہ بداہود بن فرخ زاد۔

فن حرب کی کتابیں

فن سپہگری میں چوگان و گوے۔ بہرام گور کی کتاب فن تیر اندازی میں۔ اور سب سے بڑی مفصل کتاب جسمیں قلعوں کی فتح کی تدبیریں۔ قواعد جنگ۔ جاسوسی و دیدبانی و حملہ آوری کے آئین منضبط تہے اور اردشیر کے عہد میں اسکے استعمال کے لیئے تصنیف ہوئی تہی۔

اسی طرح فن طب۔ بیطاری۔ فلسفہ۔ منطق وغیرہ میں بہت سی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔

شاہان فارس کے فرامین اور توقیعات

کتابوں کے علاوہ شاہان فارس کے خطوط۔ فرامین۔ توقیعات۔ بڑی تلاش سے بہم پہنچا کر

گئے۔ اور ان کے ترجمے کرائے گئے چنانچہ نوشیرواں۔ ہرمز ابن نوشیرواں۔ اردشیر۔ موبد موبدان۔ بزرجمہر کے خطوط و فرامین کا ذکر کتاب الفہرست میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

فارسی ناول اور قصے

ناول اور قصے گو مسلمانوں کو چنداں مرغوب نہ تھے تاہم ان کی طرف سے بھی بے پروائی نہیں کی گئی۔ ان میں سے جن کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا وہ یہ ہیں۔ ہزار داستان۔ یوسفاس۔ چند خسروا۔ مرمین۔ افسانہ۔ روزبہ۔ شنتال و خرس۔ سکٹ اند۔ شاہ زناں۔ فرود نامہ۔

الف لیلہ اصل میں فارس کا ایک ناول ہے

الف لیلہ جس سے زیادہ آج تک دنیا میں کوئی ناول مقبول نہیں ہوا اور جو یورپ کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے فارسی ناول کا ترجمہ تھا جسکا نام ہزار افسانہ تھا اور جو بہمن کی بیٹی ہما کے لیئے تصنیف کیا گیا تھا[1]۔ مسلمانوں کی یہ نہایت دیانت داری ہے کہ انہوں نے کتاب کا نام بھی نہیں بدلا اور اسی قدیم نام کا لفظی ترجمہ الف لیلہ کر دیا۔ لیکن چونکہ انہوں نے بعض قصے اضافہ کیئے اور بالخصوص طرز بیان کو نہایت رونق دی اسلیئے لیلۃ کا لفظ اسپر اور اضافہ کیا اور الف لیلۃ ولیلۃ نام رکھا۔

فارس کے بانیان مذاہب کی کتابیں

فارس کے بانیان مذہب کی تمام کتابیں اسلامی کتب خانوں میں موجود تھیں اور اگرچہ ان میں سے اکثر اسلامی عقائد کے خلاف تھیں تاہم مزید تحقیقات کے لحاظ سے ان کے ترجمے کرائے گئے۔ مانی جسنے سابور بن اردشیر کے زمانہ میں پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا اس کی ساتوں کتابیں عربی میں ترجمہ شدہ موجود ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے اور اس کے پیروؤں کے ۷۶ رسالے عربی زبان میں ترجمہ کیئے گئے۔ ہندوستان کے علوم و فنون کے ساتھ بھی کچھ کم اعتنا نہیں کیا گیا۔ خلیفہ منصور ہی کے زمانہ سے ہندو علما بغداد کے دربار میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ خاندان برامکہ نے ایک ہندو طبیب کو اپنے مشہور ہسپتال کا مہتمم اور افسر مقرر کیا

[1] الف لیلہ کے لیئے دیکھو کتاب الفہرست صفحہ ۳۰۴ ومروج الذہب مسعودی ذکر ہیاکل قدیمہ۔

اِن علما کی بدولت اور نیز اُن مسلمانوں کی وجہ سے جنہوں نے تحقیقات علمی کے لیئے ہندوستان کا سفر کیا۔ سنسکرت کی اکثر عمدہ تصنیفات بغداد کے کتب خانوں میں جمع ہوئیں اور اُنہیں سے پاکھر۔ رابہ۔ سکھہ۔ داہر۔ انکر۔ زنگل۔ جبھر۔ اندی۔ جاری۔ نانک۔ سالی۔ نوکسل۔ روسا۔ راہی۔ کپل۔ براہمہر۔ کی تصنیفات کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا۔

سنسکرت کی تصنیفات

سنسکرت کی جو کتابیں مہیّا کی گئیں وہ نجوم۔ طب۔ بیطاری۔ سپہگری۔ اخلاق۔ فلسفہ۔ مذہب۔ ناول اور ڈراما کے متعلق تھیں۔ ہم ان کتابوں کے نام اور پتے بتا سکتے ہیں لیکن اس مختصر آرٹکل کے لیئے یہ تفصیل شاید موزوں نہو۔

اِن واقعات کے معلوم ہونے کے بعد بعض یورپین مورخوں کا یہ قول کہ مُسلمانوں نے غیر قوموں کی تاریخ و واقعات کی طرف توجہ نہیں کی" غالباً اعتبار کے قابل نہ خیال کیا جاویگا۔ البتہ ایک معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو آج اِن کتابوں کا پتہ کیوں نہیں چلتا؟ اِس سوال کا جواب ایک پُر درد داستان ہے۔

کتب خانوں کی بربادی کے اسباب۔

کتب خانوں کی تباہی اور بربادی کا بہت بڑا سبب اسلامی حکومت کا بہت سے حصوں میں تقسیم ہو جانا اور نئی نئی حکومتوں کا پیدا ہونا اور مٹ جانا تھا۔ دولت عباسیہ کے ضعف کے ساتھ جو سلطنتیں قائم ہوگئیں اُنہوں نے بیشمار علمی ذخیرے پیدا کیئے لیکن جب فنا ہوئیں تو قریباً اپنی تمام یادگاروں کو اپنے ساتھ لیتی گئیں۔ مصر کا مشہور اور بے نظیر کتب خانہ دولت فاطمیہ کی تباہی کے ساتھ برباد ہوا اور تعجب و افسوس یہ ہے کہ صلاح الدین فاتح بیت المقدس جو فاطمیوں کو مٹا کر مصر کا بادشاہ ہوا اُس نے خود اِس کتب خانہ کو برباد ہونے دیا۔ بہت سی کتابیں بے احتیاطی سے پہلے ہی ضائع ہوگئیں اور جو بچیں ایک دلال کی معرفت جسکا نام ابن صورۃ تھا۔ برسوں تک نہایت بیقدری کے ساتھ بکتی رہیں۔ صلاح الدین کے وزیر قاضی عبد الرحیم نے البتہ جہاں تک

مصر کے کتبخانہ کی بربادی

ہوسکا کتابوں کی حفاظت کی چنانچہ قاہرہ میں جو مدرسہ تعمیر کرایا اُس میں قریباً ایک لاکھ کتابیں وقف کیں جنمیں اکثر بلکہ قریباً کل اسی برباد شدہ کتب خانہ کی تھیں۔

تاتاریوں کا کتبخانوں کو برباد کرنا۔

ان تباہیوں پر بھی بہت کچھ علمی سرمایہ باقی رہ گیا تھا لیکن تاتار کے فتنہ نے اُسکو قریباً بالکل نیست و نابود کردیا۔ بغداد کے بعض مورخوں نے تو یہاں تک مبالغہ کیا ہے کہ تاتاریوں نے بغداد کے کتب خانے جب برباد کیئے اور تمام کتابیں دریا میں ڈالدیں تو دجلہ کا پانی کالا ہوگیا لیکن اسمیں کچھ شبہ نہیں کہ اس فتنہ میں بیشمار کتابوں کا نام و نشان جاتا رہا۔

تاتار کا سیلاب بغداد پر محدود نہ تھا بلکہ ترکستان۔ ماوراءالنہر۔ خراسان بلاد جبل فارس عراق۔ جزیرہ۔ شام۔ ان تمام مقامات سے گذرا اور جہاں گذرا تمام علمی یادگار روندکر مٹاتا گیا۔

ہلاکو خاں کا رصدخانہ

مورخ کتبی نے محقق طوسی کے حال میں لکھا ہے کہ ہلاکو خاں نے محقق موصوف کے اشارہ سے جو رصدخانہ مراغہ میں بنوایا اس میں ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی تھا جسمیں بغداد۔ شام۔ جزیرہ کی لُٹی ہوئی کتابیں رکھی گئیں اور اُن کی تعداد چار لاکھ سے زائد تھی۔ اگر بچی کچھی کتابوں کی یہ تعداد تھی تو معلوم نہیں کہ غارت شدہ کا کیا شمار ہوگا۔!!

ان ممالک کا تو یہ حال ہوا اسپین میں باوجود انقلاب سلطنت کے بہت کچھ ذخیرہ موجود تھا لیکن وہ سب عیسائیوں کے نذر ہوا انہوں نے کتابوں کے برباد و تباہ کرنے میں وہ ناموری حاصل کی جو کبھی کسی قوم کو نہ ہوئی ہوگی۔ خود یورپ کے مورخین علانیہ اسکا اعتراف کرتے ہیں اور ان کے بیان سے ثابت ہے کہ کئی لاکھ کتابیں اس انقلاب میں برباد ہوئیں بلکہ قصداً برباد کی گئیں۔

اگرچہ ان انقلابات پر بھی اسلامی ممالک خصوصاً قسطنطنیہ اور مصر میں بڑے بڑے

کتب خانہ موجود ہیں اور میں انشاء اللہ اپنے سفرنامہ میں ان کے حالات تفصیل کے ساتھ لکھونگا لیکن افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ قدما کی تصنیفات جنسے اُصول فن کی تحقیق ہو سکتی تھی اکثر ناپید ہیں۔ جو کچھ موجود ہے زیادہ تر اخیر زمانہ کی پیداوار ہے یا قدیم زمانہ کی وہ تصنیفات ہیں جو زیادہ تر عام قسم کی کتابیں کہی جا سکتی ہیں۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جو کتابیں عام مذاق کے موافق ہوتی ہیں اُنہی کو زیادہ رواج ہوتا ہے اور تمام ممالک میں پھیلجاتی ہیں۔ اِس قسم کی کتابوں پر کسی خاص شہر یا سلطنت کے فنا ہونے سے چنداں اثر نہیں پڑتا کیونکہ ان کے بشمار نسخے ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور وہ سب فنا نہیں ہو سکتے۔

قدیم تصنیفات کا ضائع ہوجانا۔

مسلمانوں نے فلسفہ اور علوم قدیمہ میں اگرچہ بہت کمال حاصل کیا لیکن ان علوم کی تعلیم عام نہ تھی بلکہ وہ ایک خاص دائرہ تک محدود تھے۔ یہاں تک کہ اسپین میں عین اُس زمانہ میں جب فلسفہ اوجِ کمال پر تھا عوام کے سامنے فلسفہ کا نام نہیں لیا جا سکتا تھا اس سبب سے فلسفیانہ تصنیفات کے نسخے کثرت سے متداول نہ تھے جسکا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ جب کسی بڑے دار العلم پر زوال آیا تو اِس قسم کا ذخیرہ بالکل ناپید ہو گیا۔ غیر قوموں کی ترجمہ شدہ کتابیں بھی اسی وجہ سے اکثر ضایع ہو گئیں۔ فلسفہ و علوم قدیمہ پر موقوف نہیں۔ اِسلامی علوم کی وہ کتابیں بھی جو مذاق عام کے موافق نہ تھیں اور جنکو دقتِ مضامین کی وجہ سے قبول عام حاصل نہ تھا اکثر برباد گئیں۔ حالانکہ یہی کتابیں تھیں جو علم و فن کی جان تھیں۔ میں نے خود قسطنطنیہ اور مصر میں متعدد کتابیں دیکھیں جو مسلمانوں کے لیئے مایۂ ناز ہیں اور جن کے نسخے تمام دنیا میں ایک دو سے زیادہ موجود نہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ نسخے معدوم ہو جائیں تو ان کتابوں کا نام و نشان دُنیا سے جاتا رہے میں نے قسطنطنیہ میں اکثر لوگوں سے پوچھا کہ "ان کتابوں کو چھپوا کر شائع کیوں نہیں کیا جاتا" جواب ملا کہ بازار میں ان کتابوں کی مانگ نہیں"۔

ہندوستان میں بھی نادر اور عمدہ کتابوں کا یہی حال ہے۔ کاش خدا قوم توفیق دیتا کہ
یورپ کی طرح۔ ایک انجمن قائم ہوتی اور ان کتابوں کے چھاپے جانے اور شائع کئے جانے کا
انتظام ہوتا کہ جو کچھ بچا بچایا رہ گیا ہے وہ تو برباد نہونے پائے۔

حقوق الذمیین

یعنے

اسلام میں غیر مذہب والوں کے حقوق

دنیا کے عجیب سے عجیب واقعات کی اگر ایک فہرست طیار کی جائے تو یہ واقعہ ضرور
اُس میں درج کرنے کے قابل ہوگا کہ مسلمانوں کے متعلق اگرچہ یورپ کی واقفیت کے ذریعے
نہایت وسیع ہوگئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ اسلامی آبادیوں کا بہت بڑا حصہ اُس کے قبضہ میں
آگیا ہے۔ سیکڑوں عربی داں علما پیدا ہوگئے ہیں۔ عربی تصنیفات کثرت سے یورپین زبانوں میں
ترجمہ ہوتی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے نہایت نایاب تاریخی ذخیرے اصل زبان میں شائع ہوتے جاتے
ہیں۔ اورینٹیل کانفرنس نے مشرق اور مغرب کا ڈانڈا ملا دیا ہے تاہم غلط معلومات کا بادل جو
آج سے کئی سو برس پہلے یورپ کے اُفق پر چھایا تھا اب تک نہیں ہٹا۔ بہت سے بہت یہ ہوا ہے
کہ وہ کسی قدر ہلکا ہوگیا ہے لیکن فضا میں اب بھی اسقدر تاریکی ہے کہ اذا اخرج یدہٗ لم یکد یراہا
بات کو بات دکھائی نہیں دیتا۔ یہ غلط معلومات اوّل اوّل مذہبی راستے سے آئے تھے اور چونکہ
یورپ میں مذہب کا زور خود گھٹ گیا ہے اس لیئے مذہبی حیثیت کے لحاظ سے اب انکا اثر
بھی چنداں قوی نہیں رہا تاہم جب کبھی پولیٹیکل ہوا چلتی ہے تو یہ دبی چنگاریاں اسقدر جلد بھڑک
اٹھتی ہیں کہ تمام یورپ میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔

آرمینا کے جھگڑے میں ترکوں پر جو شتبہ الزامات لگائے گئے ابھی اس کی تحقیق بھی نہیں شروع ہوئی تھی کہ یورپ کے اہل قلم نے دُنیا میں غلغلہ ڈالدیا کہ خود مسلمانوں کے مذہب میں عیسائی رعایا سے ایسا سلوک کرنا جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے اور اسوجہ سے یہ یقین کرنا کہ ترکوں نے وہ تمام ظالمانہ کارروائیاں کی ہوں گی گویا اسبات کا یقین کرنا ہے کہ ترک اپنے مذہب کے پابند ہیں اور پورے پابند ہیں۔

اسی سلسلہ میں ٹائمس کے پرچہ مورخہ ۲ جنوری ۱۸۹۶ء میں پادری ملکم مکال نے بڑے دعوے کے ساتھ ایک آرٹکل لکھا جس میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ "مذہب اسلام عیسائیوں کے حق میں نہایت سخت ظالمانہ قانون ہے۔ اور اسلامی حکومتوں میں ہمیشہ اس قانون پر عملدرآمد رہا ہے"۔ دلی کی مشنریوں نے اِس آرٹکل کا ترجمہ چھاپکر شائع کیا اور دیباچہ میں یہ تمہید لکھی کہ یہ آرٹکل اسقدر مدلل اور پُرزور ہے کہ خود ٹائمس کا وہ مسلمان مضمون نگار جو مذہب اسلام کی حمایت میں مضامین کا سلسلہ لکھ رہا تھا۔ اس آرٹکل کے بعد بالکل بند ہو گیا اور کچھ جواب نہ لیکا"۔

آج کل کے مصنفین اسلام نے یورپ کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اِس عظیم الشان مسئلہ پر توجہ نہیں کی۔ کتب خانہ اسکندریہ۔ عورتوں کے حقوق جزیہ۔ یہ سب جزئی مباحث ہیں۔ لیکن ذمیوں کے حقوق کا مسئلہ ایسا مہتم بالشان اور وسیع ہے کہ اگر اسکا قطعی فیصلہ کر دیا جائے تو یورپ کی غلط فہمیوں کا سارا طلسم ٹوٹ جائیگا۔ میں یہ مضمون اسی خیال سے لکھتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ یہ بھی اُسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا جس طرح اِس سے پہلے کتب خانہ اسکندریہ والجزیہ کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو چکی ہے۔

اِس رسالہ کا موضوع جسپر بحث کا تمام سلسلہ قائم ہے یہ ہے کہ اسلام میں ذمیوں کے

کیا حقوق ہیں؟ یہ جملہ تین لفظوں پر مشتمل ہے۔ اسلام۔ ذمّی۔ حقوق۔ اسلام سے
ہماری مراد قرآن یا وہ احادیث نبوی ہیں جنکی صحت اُصول حدیث کی رو سے ثابت ہو چکی ہے
ذمّی اُن رعایا کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت میں آباد ہوں اور جنکا مذہب اسلام نہو۔ لفظ حقوق
کی تفسیر کی ضرورت نہیں۔ موضوع کے جو الفاظ ہیں اگرچہ ان کی تشریح یہی ہے جو ہم نے کی
لیکن ہمارا دعوے اُس سے زیادہ وسیع ہے جو موضوع سے مفہوم ہوتا ہے یعنی جس طرح ہمارا یہ
دعوی ہے کہ مذہب اسلام نے ذمیوں کے حقوق نہایت فیاضی سے قائم کیے اسی طرح ہمارا ایک
دعوے ہے کہ یہ صرف تحریری قانون نہ تھا بلکہ تیرہ سو برس کی وسیع مدت میں من حیث الاغلب
طریق عمل بھی اسی کے مطابق رہا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یعنی آغاز نبوت سے فتح مکہ تک جو [illegible]
میں واقع ہوئے لڑائیوں کا ایک ایسا متصل سلسلہ قائم رہا جس کی وجہ سے یہ موقع ہی نہیں نصیب
ہوا کہ اسلام کو حکومت و سلطنت کی حیثیت حاصل ہوتی اور رعایا کے ساتھ سلطنت کو
جو تعلقات ہونے چاہییں اُسکے متعلق قانون اور قاعدے منضبط ہوتے۔ قرآن مجید اور احادیث
نبوی سے اس باب میں جن احکام کا پتہ لگتا ہے وہ خاص مسلمانوں سے متعلق ہیں یعنی غیر مذہب
والوں سے انکو واسطہ نہیں۔ اسوقت تک غیر مذہب والوں سے جو تعلقات پیدا ہوئے تھے
وہ اسی قدر تھے کہ کسی قوم سے کچھ معاہدہ ہو گیا کسی سے چند شرائط کے ساتھ صلح ہو گئی مختصر کہ
اسوقت تک غیر مذہب والے اسلام کی رعایا نہیں کہلاتے تھے۔ خیبر کی آبادی فتح ہو کر بھی صرف
اسی قدر ہوا کہ یہودیوں سے بٹائی پر معاملہ ہو گیا اور زمین اُنکے قبضہ میں چھوڑ دی گئی۔ فتح مکہ کے
بعد یمن۔ بحرین۔ عمان۔ عدن وغیرہ فتح ہوئے ان اضلاع میں کثرت سے دوسری قومیں یعنی
یہود۔ عیسائی۔ پارسی آباد تھے۔ چونکہ اسوقت امن امان قائم ہو چکا تھا۔ اور اسلام کو پوری قوت

حاصل ہو چکی تہی۔ اسلام نے صاف صاف انکو رعایا کے لقب سے پکارا اور خود انکو بہی اس لقب سے عار نہیں رہا۔ لیکن ان کے متعلق کسی قسم کے مجموعہ احکام نافذ ہونے کے بجائے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ انپر جزیہ مقرر کیا گیا اور اسکے معاوضہ میں انکو چند حقوق دیئے گئے۔ سب سے پہلے انحضرت صلی اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم کے زمانہ میں تقریباً ۹ھ میں نجران کے عیسائیوں پر جزیہ مقرر ہوا۔ اسکے بعد ایلہ۔ اذرح۔ اذرعات وغیرہ وغیرہ پر بہی جزیہ لگایا گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اسوقت تمدن سلطنت کا آغاز تہا اور اسوجہ سے تاریخوں میں مسلمان یا ذمی رعایا کے حقوق کی تفصیل نہیں مل سکتی۔ تاہم اس معاملہ کے متعلق جسقدر سرمایہ اُس کو نہایت تلاش سے مہیا کرنا چاہیئے کیونکہ گو وہ مختصر اور سادہ ہوں لیکن اُنسے حقوق الذمیین کے قانون کے اُصول معلوم ہوتے ہیں اور اسکا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ زمانہ مابعد میں ذمیوں کے متعلق جو مفصل قانون بنا اُس کا مایۂ خمیر کیا تہا؟

بانی اسلام یعنی جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ واٰلہٖ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا اُن کو تحریر کے ذریعہ سے مفصلہ ذیل حقوق دیئے۔

انحضرتؐ نے ذمیوں کو جو حقوق عطا فرمائے

(۱) کوئی دشمن اُن پر حملہ کریگا تو ان کی طرف سے مدافعت کیجائے گی۔ رسول اللہ کے خاص الفاظ یہ ہیں۔ یُمنَعُوا۔[۵۲]

(۲) انکو انکے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائیگا۔ خاص الفاظ یہ ہیں۔ لا یُفتنوا عن دینھم[۵۳]

(۳) جزیہ جو ان سے لیا جائیگا اسکے لئے مُحصّل کے پاس خود جانا نہیں پڑیگا۔

(۴) ان کی جان محفوظ رہیگی۔

(۵) ان کا مال محفوظ رہیگا۔

---

[۵۱] فتوح البلدان صفحہ ۶۰۔ [۵۲] فتوح البلدان صفحہ ۵۹۔ [۵۳] فتوح البلدان صفحہ ۶۴۔

(۶) انکے قافلے اور کارواں (یعنی تجارت) محفوظ رہیں گے۔

(۷) اُن کی زمین محفوظ رہیگی۔

(۸) تمام چیزیں جو انکے قبضہ میں تھیں بحال رہیں گی۔

(۹) پادری۔ رُہبان۔ گرجوں کے پُجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کیئے جائینگے۔

(۱۰) صلیبوں اور مورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔

(۱۱) اُن سے عشر نہیں لیا جائیگا۔

(۱۲) اُن کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائیگی۔

(۱۳) پہلے سے انکا جو کچھ مذہب اور عقیدہ تھا وہ بدلوایا نہیں جائیگا۔

(۱۴) انکا کوئی حق جو انکو پہلے سے حاصل تھا زائل نہیں ہوگا

(۱۵) جو لوگ اسوقت حاضر نہیں ہیں یہ احکام انکو بھی شامل ہوں گے۔

پہلے اور دوسری دفعہ کے سوا باقی تمام حقوق جس معاہدہ سے قائم ہوتے ہیں وہ ذیل میں بعینہٖ منقول ہیں

ولنجران وحاشیتها جوار الله وذمة محمد النبی رسول الله علیٰ انفسهم وملتهم وارضهم واموالهم وغائبهم وشاهدهم وغیرهم وبعثهم وامثلتهم لا یُغیّر ما کانوا علیه ولا یُغیّر حقٌ من حقوقهم وامثلتهم لا یفتن اسقف من اسقفیته ولا راهب من رهبانیته ولا واقه من وفاهیته علیٰ ما تحت ایدیهم من قلیل او کثیر ولیس علیهم رهق ولا دم جاهلیة ولا یحشرون ولا یعشرون ولا یطاء ارضهم جیش الخ[1]

[1] فتوح البلدان صفحہ ۶۵ - قاضی ابو یوسف نے بھی اس معاہدہ کو کتاب الخراج میں نقل کیا ہے۔

ذمیوں کے متعلق اسلام کا جو اصلی قانون ہے وہ اس سے زیادہ نہیں۔ کیونکہ اسلام صرف ان مسائل اور احکام کا نام ہے جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ سے ثابت ہوں۔ اس کے سوا جو کچھ ہے گو اُسنے قوم میں اور ملک میں کوئی اعتبار حاصل کر لیا ہو۔ لیکن وہ اسلام کا اصلی قانون نہیں ہے۔

ذمیوں کے حقوق کے متعلق اگرچہ یہ مختصر قواعد ہیں اور اسلام کو ابتدائی زمانہ میں غیر قوموں کے ساتھ جسقدر کم تعلق پیدا ہوا تھا اُسکے لحاظ سے اس سے زیادہ ضرورت بھی نہ تھی۔ تاہم انھی قواعد میں نہایت مہتم بالشان اُمور کا ماخذ موجود ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ذمیوں کے حقوق کے متعلق گو کتنا ہی مفصل مجموعہ قوانین بنایا جاوے۔ لیکن اُس کی جزئیات اِن اُصول سے باہر نہیں جا سکتیں۔

اب ہم نہایت تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ زمانہ مابعد میں جبکہ غیر قوموں سے نہایت وسیع اور قوی تعلقات قائم ہو گئے۔ ذمیوں کے ساتھ اسلامی حکومتوں کا طرز عمل کیا رہا؟

حضرت عمر کی زمانہ کے واقعات۔

سب سے زیادہ جس زمانہ کے واقعات اس بحث کے تصفیہ کے لئے کام آسکتے ہیں وہ خلافت فاروقی کے واقعات ہیں۔ ان کی خلافت کا زمانہ ایک ممتد زمانہ ہے اول اول انھی کے وقت میں غیر قوموں کے ساتھ سلطنت و رعیت کے تعلقات قائم ہوئے ان کی نسبت مخالفوں نے کہا ہے کہ وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ سختی سے برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے عہد میں رعایا کو جسقدر حقوق قائم ہو سکتے ہیں ہو چکے تھے اور ہر ایک حق کی نسبت صاف صاف فیصلہ کر دیا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی حکومت اسلامی حکومت کی اصلی تصویر خیال کیجاتی ہے۔

حقوق میں سب سے مقدم قصاص کا حق ہے یعنی یہ کہ قتل و خون کے معاملہ میں فاتح اور مفتوح کے حقوق برابر سمجھیں جائیں۔ آج جن ملکوں میں تمدن اور تہذیب کی حکومت ہے

انکا یہ دعوی ہے کہ اُنہوں نے اس مساوات کو قائم کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ الفاظ کے ذریعے سے یا عمل کے ذریعے سے؟ میں اسکا فیصلہ اُن لوگوں پر چھوڑتا ہوں جو رات دن اپنی آنکھوں سے اسکی مثالیں دیکھتے رہتے ہیں۔ اسکے مقابلہ میں دیکھو اسلام نے کیا کیا۔؟

قبیلۂ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرۃ کے ایک عیسائی کو مار ڈالا تھا حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی اُنہوں نے لکھ بھیجا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کو حوالہ کر دیا جائے[1] چنانچہ قاتل حنین نام ایک شخص کو جو مقتول کے وارثوں میں تھا سپرد کر دیا گیا اور اس نے اسکو قتل کر دیا[1]، جہاں تک ہمکو معلوم ہے حضرت عمر کے اس طریق عمل سے کسی زمانہ میں اختلاف نہیں کیا گیا۔ بلکہ حضرت علی علیہ السلام نے صاف صاف لفظوں میں فرمایا کہ من کان لہ ذمتنا فدمہ کدمنا و دیتہ کدیتنا یعنی "جو لوگ ذمی ہو چکے انکا خون ہمارا خون ہے اور اُن کا خوں بہا ہمارا خوں بہا ہے" حضرت علی علیہ السلام کو یہ موقع خود بھی پیش آیا اور اُنہوں نے صاف حکم دیدیا کہ قاتل جو مسلمان تھا قتل کر دیا جائے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ جب مقتول کے وارثوں نے آکر عرض کیا کہ ہمنے خون معاف کر دیا تو آپ نے فرمایا کہ تم پر کچھ دباؤ تو نہیں ڈالا گیا[2]۔

حضرت علیؓ کا قول

عمر بن عبد العزیز جنکو دوسرا عمر کہا جاتا ہے ان کے عہد میں بھی اس قسم کا واقعہ پیش آیا اور اُنہوں نے بھی یہی حکم دیا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے چنانچہ اُنہوں نے اُسکو بے تکلف قتل کر دیا[3]۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ کا واقعہ

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ولید بن عقبہ جو صحابی تھے کوفہ کے گورنر تھے ایک دفعہ ایک یہودی نے ان کے سامنے شعبدہ بازی کے تماشے دکھائے اسوقت اور بہت سے تماشائی موجود تھے ان میں جندب بن کعب ازدی بھی تھے جو بڑے مشہور تابعی ہیں اور صحیح ترمذی میں

[1] زیلعی تخریج ہدایہ مطبوعہ دہلی صفحہ ۲۲۲ و ۲۲۳۔ [2] زیلعی صفحہ ۰۰۰ [3] زیلعی صفحات مذکورۂ بالا۔

ان کی روائیتیں نقول ہیں وہ ان شعبدوں کو شیطان کا اثر سمجھے اور یہودی کو قتل کر دیا، ولید نے اسی وقت انکو گرفتار کر لیا۔ اور یہودی کے قصاص میں قتل کر دینا چاہا۔ لیکن چونکہ وہ بڑے جتھے کے آدمی تھے انکے قبیلہ والے انکی حمایت کو کھڑے ہو گئے۔ ولید نے اسوقت دفع فتنے کے لیے انکو قیدخانہ بھیجدیا اور ارادہ کیا کہ موقع پاکر قتل کر دینگے۔ داروغہ جیل کو انپر رحم آیا اور کہا کہ تم چپکے سے بھاگ جاؤ۔ اُنھوں نے کہا کیوں؟ کیا درحقیقت میں قتل کر دیا جاؤنگا؟ داروغہ نے کہا خدا کی خوشنودی کے لیے تمہارا قتل کر دینا کچھ بڑی بات نہیں' غرض وہ بھاگ گئے، صبح کو ولید نے جندب کو قصاص کے لیے طلب کیا' داروغہ نے کہا کہ وہ تو چھپ کر بھاگ گیا، ولید نے اُسکے بدلے داروغہ کی گردن ماردی[1]۔ ہمکو اس امر سے بحث نہیں کہ داروغہ جیل کا قتل کر دینا جائز تھا یا نہیں بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ باوجودیکہ جندب بڑے رتبہ کے آدمی تھے اور یہودی ایک معمولی تماشہ گر تھا تاہم ولید کو ایک حکم شرعی کی تعمیل کے لحاظ سے جندب کے قتل کر دینے میں کچھ تامل نہوا۔

اسی سلسلہ میں حضرت عمر فاروق کی شہادت کا واقعہ بھی سُننے کے قابل ہے حضرت عمرؓ کے قاتل کا نام فیروز تھا جو مجوسی النسل تھا اور عیسائی مذہب رکھتا تھا حضرت عمر کے بڑے بیٹے عبیداللہ سے لوگوں نے بیان کیا کہ اور لوگ بھی اس سازش میں شریک تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر کے بیٹے عبدالرحمٰن نے چشم دید واقعہ بیان کیا' عبیداللہ تلوار ہاتھ میں لیکر نکلے، اور فیروز کے بیٹے اور جفینہ و ہرمزان کو جنپر سازش کا شبہ تھا قتل کر دیا۔ انمیں سے ہرمزان مسلمان ہو گیا تھا باقی عیسائی تھے عبیداللہ اُسی وقت گرفتار کر لیے گئے اور حضرت عثمان جب مسند خلافت پر بیٹھے تو پہلا مسئلہ یہی پیش کیا گیا کہ عبیداللہ کی نسبت کیا کرنا چاہیے حضرت عثمان نے صحابہ کو

[1] مسعودی ذکر خلافت عثمان کتاب الاوائل میں اس واقعہ کو کسیقدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے ۱۲

بلا کر رائے طلب کی، تمام مہاجرین یعنی اُن بزرگوں نے جو رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وطن چھوڑ کر چلے آئے تھے اور تمام صحابہ کی بہ نسبت افضل سمجھے جاتے تھے یک زبان ہو کر کہا کہ عبید اللہ کو قتل کر دینا چاہیئے۔ حضرت علی علیہ السلام بھی اس مجمع میں موجود تھے اور اُنھوں نے بھی یہی رائے دی۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس فیصلہ کی تعمیل نہ کر سکے اور (جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے) حضرت عثمان کی خلافت کی یہ پہلی کمزوری تھی تاہم اُنھوں نے تینوں مقتولوں کے بدلے بیت المال سے خوں بہا دلایا، شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ لوگوں نے عبید اللہ کا قتل کیا جانا جو تجویز کیا تھا وہ ہرمزان کے قصاص میں تھا اور ہرمزان مسلمان ہو چکا تھا لیکن یہ قیاس صحیح نہیں، اولاً تو روایتوں میں اس قسم کی تخصیص کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ نے تینوں کا جو خوں بہا دلایا اس میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی۔

ہمکو جہاں تک معلوم ہے اسلام کی تمام تاریخ میں اسکے خلاف کوئی مثال نہیں ہے۔ بعض مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ ہرون الرشید کے زمانہ میں ایک مسلمان نے کسی ذمّی کو مار ڈالا، قصاص میں مسلمان ماخوذ ہوا لیکن کسی خاص وجہ سے ہرون الرشید کو اُسکی رعایت منظور تھی اور اس لیئے اُسنے چاہا کہ وہ قتل سے بچ جائے، چنانچہ قاضی ابو یوسف صاحب کو بلا کر اُسکی تدبیر پوچھی، قاضی صاحب نے فرمایا کہ شہادت سے یہ ثابت نہیں کہ وہ مارے جانیکے وقت بھی قانوناً ذمّی تھا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ واقعہ ثابت نہیں تاہم اگر اسکو مان لیا جائے تب بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ذمّی کے قصاص میں مسلمان کو قتل سے بچانا ایک ایسا عظیم واقعہ تھا جسکے حیلہ پیدا کرنے کے لیے قاضی ابو یوسف جیسے شخص کی ضرورت پڑی اور وہ بھی اس کے سوا کچھ حیلہ نہ بتا سکے کہ اسکا ذمّی ہونا مشتبہ ٹھہرائیں۔

سلہ مسعودی ذکر خلافت عثمانؓ کتاب [illegible] میں یہ واقعہ کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مال اور جائداد کے متعلق ذمیوں کو حقوق

مال اور جائداد کے حقوق جنکو انگریزی میں رائٹ آف پراپرٹی اور رایٹ آف لینڈ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انہیں بھی مسلمان اور ذمی برابر درجہ رکھتے تھے[۵۱]۔ ذمیوں کے قبضہ میں جسقدر زمینیں تہیں اسلام کے بعد عموماً بحال رکھی گئیں۔ یہاں تک کہ اگر خلیفۂ وقت یا بادشاہ کو مسجد یا کسی اور عمارت کی غرض سے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تھی تو معاوضہ دیکر لی جاتی تھی۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑوں کے پالنے کے لیے ایک منزل بنانا چاہا۔ آپ نے ابوموسیٰ اشعری کو جو بصرہ کے گورنر تھے لکھ بھیجا کہ اگر وہ زمین ذمیوں کی نہو اور انہیں ذمیوں کی نہروں اور کنوؤں کا پانی نہ آتا ہو تو سائل کو زمین دیدیجائے[۵۲]" خلیفہ منصور عباسی نے جب بغداد کو دارالخلافت بنانا چاہا تو آس پاس کی قومیں جو وہاں کی زمیندار تھیں اُنسے قیمت دیکر زمین مول لی[۵۳]۔ حیرۃ میں قدیم زمانہ کے محل اور ایوان تھے جو اسلام کے زمانہ میں ویران ہوچکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں کوفہ میں جو جامع مسجد بنی اُسمیں کچھ ملبہ وہاں کے مکانات سے آیا تھا' اگرچہ انکا کوئی قانونی وارث نہ تھا تاہم چونکہ ذمیوں کی زمین میں تھا اسلیئے ذمیوں کو انکی قیمت انکے جزیہ میں مجرا دیدی گئی[۵۴]۔ اسکے سوا سیکڑوں واقعات ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ذمیوں کے مال اور جائداد سے کبھی تعرض نہیں کیا گیا۔

آغاز اسلام ہی میں یہ مسئلہ بڑے معرکہ کے ساتھ طے ہوگیا تھا کہ غیر مذہب والے جو اسلام کی رعایا بنگئے ہیں انکی مقبوضہ زمینیں انکے قبضہ سے نکالی نہیں جاسکتیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں جب عراق فتح ہوا تو عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت بلالؓ نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ جسقدر مفتوحہ زمین ہے اہلِ فوج کو تقسیم کردی جائے۔ حضرت عمرؓ نے انکار کیا اور دیر تک بحث رہی آخر یہ ٹھہرا کہ تمام مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک بڑا مجمع ہوا اور

[۵۱] فتوح البلدان صفحہ ۳۵۱۔ [۵۲] فتوح البلدان صفحہ ۲۹۵۔ [۵۳] فتوح البلدان صفحہ ۲۸۶۔

انصار میں سے دس شخص جو اپنے اپنے قبیلے کے وکیل اور قائم مقام تھے مجمع میں حاضر ہوئے۔
تمام بڑے بڑے مہاجرین صحابہ یعنی حضرت علی حضرت عثمان طلحہ عبد اللہ بن عمر وغیرہ بھی موجود
تھے۔ حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر نہایت توضیح سے اس مسئلہ کو بیان کیا۔ بلال اور عبد الرحمن بن
عوف اب بھی مخلف رہے لیکن عام رائے یہ ہوئی کہ ذمی اپنی زمین سے بیدخل نہیں کیئے جا سکتے
حضرت بلالؓ اسپر بھی قائل نہیں ہوتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے جب قرآن مجید کی ایک آیت
استدلال میں پیش کی تو انکو مجبور ہونا پڑا اور بلا اختلاف تمام صحابہ کے اتفاق سے یہ مسئلہ طے ہو گیا۔[1]

اسی بنا پر فقہ کا یہ مسئلہ مسلم ہے کہ اگر بادشاہ یا امام وقت کسی زمانہ میں زمین کو ذمیوں
کے قبضہ سے نکالنا چاہے تو نہیں نکال سکتا۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں۔

وَلَيْسَ لَهُ أَنْ يَأْخُذَهَا بَعْدَ ذَٰلِكَ مِنْهُمْ ... یعنی امام وقت کو یہ اختیار نہیں کہ اسکے
وَهِيَ مِلْكٌ لَهُمْ يَتَوَارَثُونَهَا وَيَبِيعُونَهَا۔ ... بعد اُن سے زمین کو چھین لے۔ وہ زمین
انکی ملک ہے انمیں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہیگی۔ اور وہ اسکو خرید و فروخت کر سکتے ہیں"

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں جاگیرات کا ایک صیغہ قائم کیا تھا یعنے حقوق اسلامی کے
لحاظ سے جسکو مناسب سمجھتے تھے اسکو جاگیر عطا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ اراضیات بالکل ذمیوں کی
مملوکہ تھیں اور حضرت عمرؓ کو انمیں کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہ تھا اسلیئے اس غرض کے لیے
خاص وہ زمینیں مخصوص کی تھیں جو کسی کی ملک نہ تھیں چنانچہ اس قسم کی زمینیں حسب ذیل تھیں۔
جاگیرات خالصہ جو نوشیرواں نے خاندان شاہی کے لیے مخصوص کی تھیں۔ لاوارث اشخاص کی
زمین۔ دریا برآمد۔ ڈاکخانہ کے متعلق زمین۔

اسکے ساتھ یہ اصول بھی قرار پایا کہ جو ملک بزور فتح کیا جائے وہاں کے باشندوں کی جائداد

[1] یہ پوری تفصیل کتاب الخراج صفحہ ۱۰۱،۱۰۲ میں ہے۔

زراعت کرنے پر بھی مسلمانوں کے ہاتھ منتقل نہیں ہوسکتی، یہ قاعدہ اگرچہ اس لحاظ سے مقرر ہوا تھا کہ مسلمان کے قبضہ میں آجانے سے زمین دہ یکی ہو جاتی ہے اور خراج کو نقصان پہنچتا ہے تاہم اس قاعدہ سے ذمیوں کو بہت بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ زمین کسی حالت میں انکے خاندان اور انکی قوم کے قبضہ سے باہر نہیں جاسکتی تھی، چنانچہ اسکے خلاف اگر کبھی عمل ہوا تو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا گیا، امام لیث بن سعد نے مصر میں تھوڑی سی زمین مول لی تھی، اسپر وہاں کے بڑے بڑے علما مثلاً ابن لہیعہ اور نافع بن یزید سخت معترض ہوئے[51] عقبہ بن عامر ایک بڑے بزرگ صحابی تھے، اور امیر معاویہ نے انکو مصر کا گورنر مقرر کیا تھا۔ وہ مصر کے ایک گاؤں میں اپنی سکونت کے لیے مکان بنوانا چاہتے تھے چنانچہ امیر معاویہ نے اس غرض سے انکو ایکہزار جریب زمین عنایت کی، انہوں نے خراب اور افتادہ زمین جو کسی کے قبضہ میں نہ تھی انتخاب کی اور جب انکے نوکر نے کہا کہ کوئی عمدہ قطعہ لیجیئے تو انہوں نے کہا یہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ معاہدہ میں جو شرطیں ہیں انمیں ایک یہ بھی ہے کہ ذمیوں کی زمین انکے قبضہ سے نکالی نہیں جائیگی"[52] ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اکثر ممالک میں جو خراج ذمیوں پر مقرر کیا گیا اُسکے ساتھ یہ شرط بھی لکھدی گئی کہ آیندہ کبھی اسپر اضافہ نکیا جائیگا خود مصر کے معاہدہ میں یہ شرط داخل تھی، چنانچہ امیر معاویہ نے جب مصر کے عامل وردان کو لکھا کہ خراج کی مقدار میں اضافہ کیا جائے تو اسنے صاف انکار کیا اور جواب میں لکھا کہ معاہدہ میں شرط ہو چکی ہے کہ خراج مقررہ پر اضافہ نہوگا" اگرچہ اسمیں شبہ نہیں ہوسکتا کہ زمانہ مابعد میں خراج کی مقدار بدلتی رہی۔ لیکن اسبات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ اصل جمع پر اضافہ ہوا۔ بہت سی زمینیں نئی آباد ہوگئی تھیں اور اُنپر اضافہ ہونا خود مقتضائے انصاف تھا۔

[51] مقریزی صفحہ ۲۹۵ ۔ [52] مقریزی صفحہ ۲۰۸ ۔

مذہبی حقوق

سب سے مقدم اور ضروری بحث مذہبی حقوق کی ہے۔ یورپ میں جس گروہ نے اسلام کو نکتہ چینیوں کا ہدف بنا رکھا ہے، انکی حوصلہ آزمائی کا بڑا جولانگاہ یہی ہے۔ انکا دعویٰ ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی بالکل نہیں ہے اور قدیم اسلامی حکومتوں نے غیر قوموں کے مذہبی حقوق بالکل پامال کر دیئے تھے لیکن ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے تمام دنیا کی قوموں کو جس حد تک مذہبی آزادی دی کبھی کسی قوم نے نہیں دی نہ اب دینے کا دعویٰ کر سکتی ہے۔ یورپ دو سو برس پہلے تو مذہبی آزادی کا نام ہی نہیں لے سکتا تھا۔ آج بے شبہ اسکو یہ دعویٰ ہے مگر کیوں ہے؟ اسلیئے کہ اسکو خود مذہب کی پروا نہیں رہی۔ بے شبہ یورپ، گرجا اور مسجد کے جھگڑے میں انصاف کا پلہ برابر رکھتا ہے لیکن اگر ایک سڑک اور مسجد کا معاملہ پیش آجائے تو مسجد بے تکلف برباد کر دیجاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس فیاضی پر ناز ہے وہ مذہبی آزادی کا نہیں بلکہ مذہبی بے پروائی کا اثر ہے۔

مذہبی آزادی کے متعلق اسلام کا جو اصول ہے اُن الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجرانیوں کے معاہدوں میں تحریر فرمائے تھے اور جسکو تمام و کمال ہم اس مضمون کے پہلے حصہ میں نقل کر چکے ہیں یعنی یہ کہ "پادری وغیرہ اپنے منصب پر بحال رہیں گے اور مذہب سے کچھ تعرض نہ کیا جائیگا" یہ خاص رسول اللہ کے احکام ہیں اور اس لئے دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خاص اسلام کے احکام ہیں۔ اس سے یہ بھی قیاس ہو سکتا ہے کہ خلفائے راشدین جو رسول اللہ کے افعال و اقوال کے یادگار تھے اس باب میں انکا طرز عمل کیا رہا ہوگا؟ لیکن ہم صرف قیاس پر قناعت نہیں کرتے۔ تاریخ کی مستند کتابوں مثلاً بلاذری، طبری، ازدی، وغیرہ میں سیکڑوں معاہدے اصلی الفاظ میں مذکور ہیں جنکا قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کے مذہب سے تعرض نہ کیا جائیگا۔ چنانچہ مزید اطمینان کے لیئے ہم بعض معاہدوں کو اس مقام پر نقل کرتے ہیں۔ خالد نے حضرت ابوبکر کے زمانہ میں جب حیرہ پر فتح حاصل کی تو یہ معاہدہ لکھدیا۔

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ ولا یمنعون من ضرب یعنی انکے گرجے برباد نہ کیے جائینگے۔ نہ انکو سنکھ بجانے النواقیس ولا من اخراج الصلبان فی یوم عیدھم[۵۱] منع کیا جائیگا۔ نہ عید کے دن صلیب کے نکالنے سے روکا جائیگا عانات پر جب خالد کا گزر ہوا تو وہاں کا پادری انکے پاس حاضر ہوا اور انہوں نے ان شرائط پر اس سے صلح کر لی۔

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ وعلی ان یضربوا نواقیسھم فی ای ساعۃ شاؤا من لیل او نھار الا فی اوقات الصلوٰۃ وعلی ان یخرجوا الصلبان فی ایام عیدھم[۵۲] یعنی انکے گرجے برباد نہ کئے جائینگے۔ وہ نماز کے وقتوں کے سوا رات دن میں جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں اور تمام تیوہاروں میں صلیب نکالیں۔

قاضی ابو یوسف صاحب نے کتاب الخراج میں ان احکام کو نقل کرکے لکھا ہے کہ خالد کے ان معاہدوں پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ کسی نے کبھی اعتراض نہیں کیا" اس لحاظ سے اگر فقہی اصطلاح کے موافق لیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع ہوگیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ زمانہ مابعد میں جب کبھی کسی متعصب فرمانروا نے اسکے خلاف کرنا چاہا تو مذہبی پیشواؤں نے فوراً مخالفت کی اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے یہ جرأت نہ کر سکے تو اس کے مرنے کے بعد اس کی تلافی کر دی گئی۔ ہرون الرشید جب نایس فورس قیصر روم کی بار بار بغاوت سے نہایت برہم ہوا تو عیسائیوں کی طرف سے اسکے خیالات بہت کچھ بدل گئے تھے غالباً اسی کا اثر تھا کہ اس نے قاضی ابو یوسف صاحب سے جو مذہبی صیغہ کے افسر کل تھے پوچھا کہ عیسائیوں کے گرجے اسلام میں کیوں محفوظ رہے اور آج انکو کیوں یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ علانیہ صلیب نکالتے ہیں؟ اسکا جواب جو قاضی صاحب نے لکھا اسکے خاص الفاظ یہ ہیں۔

[۵۱] کتاب الخراج صفحہ ۸۴۔ [۵۲] کتاب الخراج صفحہ ۸۶

انما كان الصلح جرى بين المسلمين واهل الذمة في اداء الجزية وفتحت المدن على ان لا تهدم بيعهم ولا كنائسهم داخل المدينة ولا خارجها وعلى ان يقاتلوا من ناواهم من عدوهم وعلى ان يخرجوا الصلبان في اعيادهم ففتحت الشام كلها والحيرة الا اقلها على هذا. فلذلك تركت البيع والكنائس ولم تهدم۔[1]

یعنی مسلمانوں اور ذمیوں سے جزیہ کی بناپر جو صلح ہوئی تھی اس شرط پر ہوئی تھی کہ انکی خانقاہیں اور گرجے شہر کے اندر ہوں یا باہر برباد نہ کیے جائینگے اور یہ کہ انکا کوئی دشمن انپر چڑھ آئے تو انکی طرف سے مقابلہ کیا جائیگا۔ اور یہ کہ وہ تیوہاروں میں صلیب نکالنے کے مجاز ہیں چنانچہ تمام شام اور حیرہ باستثنائے بعض مواضع کے انہی شرائط پر فتح ہوا اور یہی وجہ ہے کہ خانقاہیں اور گرجے اسی طرح چھوڑ دیے گئے اور برباد نہیں کیے گئے۔

خلیفہ ہادی کے زمانہ میں ١٦٩ھ میں جب علی بن سلیمان مصر کا گورنر مقرر ہوا تو حضرت مریم کے گرجا اور چند گرجوں کو منہدم کرا دیا ہادی نے ایک سال کی خلافت کے بعد وفات پائی اور ہارون الرشید تخت نشین ہوا۔ اسنے علی کو معزول کر کے ١٧١ھ میں موسیٰ بن عیسیٰ کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔ موسیٰ نے گرجوں کے معاملہ میں علماء سے استفتا کیا۔ اسوقت مصر کے تمام علماء کے پیشوا لیث بن سعد تھے جو بہت بڑے محدث اور نہایت مقدس اور بزرگ تھے انہوں نے علانیہ فتوے دیا کہ منہدم شدہ گرجے نئے سرے سے تعمیر کرا دیے جائیں اور دلیل پیش کی کہ مصر میں جس قدر گرجے ہیں خود صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں تعمیر ہوئے تھے چنانچہ تمام گرجے سرکاری خزانہ سے تعمیر کرا دیئے گئے۔[2] علامہ مقریزی نے تاریخ مصر میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں لکھا ہے۔

فبنيت كلها بمشورة الليث بن سعد وعبد الله بن لهيعة وقالا هو من عمارة البلاد

[1] کتاب الخراج صفحہ ٨٠۔ [2] النجوم الزاہرہ واقعات ١٧١ھ۔

واحتجا بان الكنايس التي بمصر لم تبن الا في الاسلام في زمن الصحابة والتابعين۔[1]

اسی طرح دمشق کا ایک گرجا ایک رئیس کی بیجا فیاضی سے خاندان بنی نصر کے قبضہ میں آگیا تھا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عہد خلافت میں اسکو بنی نصر سے چھین کر عیسائیوں کے حوالہ کر دیا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں لیکن اس موقع پر ہم ایک ایسا واقعہ نقل کرتے ہیں جو صرف ایک جزئی واقعہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ اس سے جانشینان اسلام کے عام طرزعمل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دمشق کی جامع مسجد ایک گرجا کے متصل تھی جسکا نام یوحنا کا گرجا تھا۔ امیر معاویہ نے اپنے عہد خلافت میں ضرورت کی وجہ سے چاہا کہ گرجا کو مسجد میں شامل کر لیں۔ لیکن عیسائیوں نے انکار کیا۔ امیر معاویہ مجبور رہے۔ عبدالملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں عیسائیوں سے درخواست کی اور معاوضہ پیش کیا۔ عیسائی پھر راضی نہوئے اور عبدالملک کو باز رہنا پڑا۔ ولید نے اپنے زمانہ خلافت میں عیسائیوں کے آگے ایک بہت بڑی رقم پیش کی۔ وہ اسی طرح انکار کرتے رہے۔ ولید نے غصہ میں آکر کہا کہ تم خوشی سے نہیں دیتے تو میں جبراً لیلوں گا۔ عیسائیوں نے کہا جو شخص کسی گرجا کو نقصان پہنچاتا ہے وہ پاگل یا کوڑھی ہو جاتا ہے۔ ولید کو اسپر زیادہ غصہ آیا خود اپنے ہاتھ میں کدال لیکر گرجا کی دیوار ڈھانی شروع کی اور بالآخر گرجا مسجد میں شامل کر لیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں عیسائیوں نے اس تعدی کی شکایت کی حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دمشق کے عامل کو لکھ بھیجا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں ملا لیا گیا ہے وہ عیسائیوں کو واپس کر دیا جائے اسپر مسلمانوں کو نہایت رنج ہوا کہ ہم جس مسجد میں نماز پڑھ چکے اور اذانیں دے چکے اسکو کیونکر ڈھائیں آخر عیسائیوں کے پاس جا کر خوشامد کی اور کہا کہ "آغاز فتح میں غوطہ دمشق کے جسقدر گرجے مسلمانوں

[1] مقریزی جلد دوم صفحہ ۵۱۱۔

کے قبضہ میں ہوگئے تھے اور اب تک ہیں۔ وہ سب واپس کردیئے جائینگے اگر تم اس مسجد کے ڈھا دینے سے باز آؤ" عیسائی اسپر راضی ہوئے اور عمر بن عبدالعزیز کو اس کی اطلاع دی گئی۔ انہوں نے عیسائیوں کی خواہش کے موافق مسجد کا منہدم کرنا روک دیا اور انکو غوطۂ دمشق کے تمام گرجے دلا دیئے

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غیر مذہب والوں کی کسی عبادتگاہ پر تصرف کرنا کسقدر پُرخطر کام سمجھا جاتا تھا اور مقدس خلفا کہاں تک گرجاؤں وغیرہ کا لحاظ رکھتے تھے۔

یورپین مصنفوں کی طرف سے بڑا اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں نئے گرجاؤں یا بتخانوں کے بننے کی اجازت نہ تھی" لیکن یہ ان کی سرسری معلومات کا نتیجہ ہے۔ یہ بحث خود صحابہ کے زمانہ میں پیش آچکی تھی اور اسکا فیصلہ کردیا گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تھا" انہوں نے جواب دیا کہ جو شہر مسلمانوں کے خاص آباد کردہ ہیں وہاں غیر مذہب والوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ گرجا اور بتخانہ بنائیں یا ناقوس بجائیں باقی جو قدیم شہر ہیں وہاں ذمیوں سے جو معاہدہ ہے مسلمانوں کو اسکا پورا کرنا ضرور ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ فتوی بھی اس لحاظ سے تھا کہ اسوقت تک مسلمان اور دوسری قومیں اچھی طرح ملے جلے نہیں تھے لیکن جب یہ حالت نہیں رہی تو وہ فیصلہ بھی نہیں رہا چنانچہ خاص اسلامی شہروں میں اس کثرت سے گرجا" بتخانے" آتشکدے بنے کہ انکا شمار نہیں ہوسکتا۔ بغداد خاص مسلمانوں کا آباد کیا ہوا شہر ہے وہاں کے گرجوں کے نام معجم البلدان میں کثرت سے ملتے ہیں قاہرہ میں جو گرجے بنے وہ مسلمانوں ہی کے عہد میں بنے۔ **یوٹکیس** نے جو ۳۲۸ھ میں اسکندریہ کا لارڈ بشپ تھا" اپنی کتاب میں جو عربی زبان میں ہے اور جسکو پروفیسر پوکاک نے لاطینی ترجمہ کے ساتھ چھاپا ہے۔ اس قسم کے بہت سے گرجوں کا نام اور انکے حالات لکھے ہیں۔

۵۱ یہ پوری تفصیل فتوح البلدان صفحہ ۱۹۰ میں مذکور ہے ۵۲ کتاب الخراج صفحہ ۸۸۔

خالد بن عبداللہ قسری نے جو ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں عراقین کا گورنر تھا اور عرب کے نہایت نامآور لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے اپنی ماں کے لیے جو عیسائی مذہب رکھتی تھی خود ایک گرجا تعمیر کرا دیا تھا۔ عضدالدولہ نے جو بہت بڑا نامور شہنشاہ گذرا ہے اور نہایت صاحب فضل و کمال تھا اپنے وزیر نصر بن ہارون کو چرچ اور گرجاؤں کے بنانے کی عام اجازت دی تھی[1]۔ چنانچہ اس نے ۳۶۹ھ میں نہایت کثرت سے تمام ممالک اسلامیہ میں چرچ اور گرجے تعمیر کرائے۔

مسلمانوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ پرانے معبد قائم رکھے یا نئے معبدوں کی تعمیر کی اجازت دی، بلکہ انہوں نے نہایت انصاف سے معبدوں کے متعلق تمام عہدے اور تمام وہ جائدادیں بحال رہنے دیں جو ان معبدوں پر وقف تھیں یہاں تک کہ پجاریوں اور مجاوروں کے جو روزینے پہلے سے مقرر تھے وہ بھی اپنے خزانہ سے جاری رکھے۔ عمرو بن العاص نے حضرت عمرؓ کے عہد میں جب مصر فتح کیا تو جسقدر اراضیات گرجاؤں پر وقف تھیں اسی طرح بحال رہنے دیں، چنانچہ اس قسم کی جو اراضیات ۸۰۰ھ تک موجود تھیں انکی مقدار ۲۵ ہزار فدان تھی[2]۔ محمد قاسم نے جب سندھ فتح کیا تو برہمنوں کو بلا کر بتخانوں کے متعلق انکو جو اختیار دیئے اسکو مورخ علی بن حامد نے اپنی تاریخ سندھ میں ان الفاظ میں لکھا ہے "پس اکابر و مقدمان و براہمہ را فرمود کہ معبود خود را عبادت کنند و فقرائے برہمنان را باحسان و تعہد تیمار دارند و اعیاد و مراسم خود بشرائط آبا و اجداد قیام نمایند۔ وصدقاتے کہ پیش ازیں درحق براہمہ می دادند برقرار قدیم بدہند۔"

بنیامین جو مصر کا پیٹریارک تھا اور ایرانیوں کے تسلط کے زمانے میں مصر سے بھاگ گیا تھا اسکو خود عمرو بن العاص نے سنہ ۲۰ھ میں امان کی تحریر بھیجکر مصر میں بلوایا اور پیٹریارک کے عہدہ پر مامور کیا[3]۔ محمد فاتح نے جب سنہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تو یونانی کلیسا کا خود محافظ بنا،

[1] ابن الاثیر واقعات سنہ ۳۶۹ھ [2] دیکھو مقریزی جلد دوم صفحہ ۴۹۹۔ [3] مقریزی جلد دوم صفحہ ۴۹۲۔

اور تمام پادریوں کو ہر قسم کے قانون کے احکام سے بری کر دیا۔

اسلام میں غیر مذہب والوں کے مذہبی احکام کا جو لحاظ کیا جاتا تھا۔ اسکا ثبوت اس کر ذکر کیا ہوگا کہ یہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی عیسائی ایک گرجا بنانے کی وصیت کر جائے تو اسلامی عدالت اس وصیت کو جائز تسلیم کریگی اور مسجد بنانے کی وصیت کر جائے تو ناجائز چنانچہ صاحب ہدایہ نے باب الوصیۃ میں امام ابو حنیفہ کا یہ مذہب نقل کر کے انکی طرف سے دلیل پیش کی ہے نحن امرنا بان نترکھم وما یدینون یعنے ہمکو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم غیر مذہب والوں کو ان کے احکام مذہبی پر چھوڑ دیں" ایک دفعہ جب حضرت ابو بکر کے عہد میں ایک عورت نے مسلمانوں کی ہجو کے اشعار گائے اور ایک افسر نے اس جرم پر اسکے ہاتھ کاٹ ڈالے تو حضرت ابو بکر نے اس افسر کو خط لکھا کہ اگر وہ عورت مسلمان تھی تو کوئی معمولی سزا دینی چاہیے تھی اور اگر ذمی تھی تو جب ہم نے اس کے شرک اور کفر سے درگذر کی تو ہجو تو شرک سے بہرحال کم ہے[1]

عیسائی نکتہ چینیوں کی نسبت ہمکو صرف یہی شکایت نہیں کہ وہ اسلامی تاریخوں سے ناآشنا ہیں بلکہ افسوس یہ ہے کہ وہ خود اپنے قدیم عیسائی بزرگوں کی روایتوں سے واقفیت نہیں رکھتے۔

حضرت عثمان کے زمانہ میں مرو کا جو بشپ ایک تھا اور جسکا نام .... تھا۔ اسنے ایران کے لارڈ بشپ .... کو جو خط لکھا تھا اسمیں یہ الفاظ تھے "عرب جنکو خدا نے اسوقت جہان کی بادشاہت دی ہے عیسائی مذہب پر حملہ نہیں کرتے۔ بلکہ برخلاف اسکے وہ ہمارے مذہب کی امداد کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور خداوند کے مقدسوں کی عزت کرتے ہیں اور گرجوں اور خانقاہوں کے لیے عطیے دیتے ہیں"

مذہبی اور قانونی حقوق کے بعد جنکا ہم اوپر ذکر کر چکے یہ امر زیادہ قابل لحاظ ہے کہ ذمیوں کی

---

[1] طبری واقعات سنہ ۱۲ھ۔

ذمیوں کا رتبہ اور اعزاز۔

رتبہ اور اعزاز کے لحاظ سے اسلامی گورنمنٹ اور اسلامی پبلک میں کیا درجہ حاصل تھا' فاتح اور مفتوح کی تمیز ایک ایسا فطرتی اثر ہے جو کبھی طرح کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا. پچھلی دنیا میں تو یہ تمیز اس حد تک پہنچا تھا کہ فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوحین کو جانوروں سے کچھ ہی زیادہ سمجھا' ہندو آریہ جب ہندوستان میں آئے تو یہاں کے اصلی باشندوں کو اس طرح خاک میں ملا دیا کہ انکو شودر کے لقب سے خود عار نہیں رہا' رومن نے تمام مفتوحہ قوموں کو گویا غلام بنا رکھا تھا۔ دنیا اسی حالت میں تھی کہ اسلام کا قدم آیا' اسکے گرد و پیش ہر طرف اسی قسم کی مثالیں موجود تھیں لیکن اسنے کیا کیا؟ یہ کیا کہ دنیا کے اس عام رواج یافتہ قاعدہ کو دفعۃً مٹا دیا اور قول و فعل دونوں سے بتا دیا کہ حقوق عامہ میں جسقدر آدمی آسمان کے نیچے ہیں سب برابر ہیں' اسلام ہی نے یہ بات سکھائی تھی کہ جب ایک یہودی نے حضرت علیؓ پر خود انکی خلافت کے زمانہ میں ایک زرہ کا دعوی کیا تو جناب ممدوح کو اسکی جوابدہی کے لیے عدالت میں حاضر ہونا پڑا' اور وہ بغیر کسی عذر کے معمولی فریق مقدمہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوئے'۔ یہ اسلام ہی کی تعلیم تھی کہ جب ایک عیسائی نے ہشام بن عبد الملک پر جو بڑی عظمت اور اقتدار کا خلیفہ گذرا ہے ایک جائداد کا دعوی کیا اور حضرت عمر بن عبد العزیز کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا تو حضرت عمرؒ نے ہشام کو عدالت میں طلب کیا' اور کہا کہ مدعی کے برابر کھڑے ہو کر جوابدہی کرو' ہشام نے وکیل مقرر کرنا چاہا' حضرت عمرؒ نے کہا نہیں تم خود سامنے کھڑے ہو کر جواب دو' ہشام نے عیسائی کے ساتھ سخت کلامی شروع کی حضرت عمرؒ نے نہایت سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ دوبارہ یہ حرکت سرزد ہوئی تو بغیر سزا دیئے نہ چھوڑونگا' چونکہ روداد سے عیسائی کا حق ثابت تھا اسکو ڈگری دلائی اور حکم دیا کہ ہشام کی دستاویز جو اسنے پیش کی تھی چاک کر دی جائے[1]۔ تاریخ اسلام میں اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں لیکن ہم نے صرف اُن بزرگوں کے نمونے پیش کئے ہیں

---

[1] عیون والحدائق صفحہ ۱۰۔

جو خود اسلام کے نمونے تھے۔

اسلامی حکومتوں میں مسلمان، اور ذمی عموماً برابری کی حیثیت سے رہتے تھے۔ سرکاری مناصب میں مجالس عامہ میں عام معاشرت میں فاتح و مفتوح کی کچھ تمیز نہ تھی، لیکن قبل اسکے کہ ہم اس دعوی کو تفصیل سے ثابت کریں ہمکو اُن شبہات کا جواب دینا چاہیے جو اس موقع پر خواہ مخواہ پیدا ہوں گے۔ عیسائی مصنفین نے ہمیشہ نہایت زور کے ساتھ اسلام پر یہ الزام لگایا ہے کہ اسنے دوسری قوموں کو نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھا، اور ذلت کی مخصوص علامتیں قائم کیں، اسلام نے یا اسلام کے جانشینوں نے یہ قاعدے بنائے کہ ذمی ایک خاص قسم کا لباس اختیار کریں جو انکی محکومی اور ذلت کی علامت ہو، گھوڑے پر نہ سوار ہوں رستہ میں تا دباً مسلمانوں سے بچکر نکلیں بڑے بڑے عہدے نہ پائیں، انکے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہ کیا جائے۔

ہم بے شبہ تسلیم کرتے ہیں کہ فقہ کی پچھلی تصنیفات میں ذمیوں کی نسبت یہ احکام موجود ہیں لیکن ہمارا یہ دعوے ہے کہ یہ احکام خدا کے رسول کے صحابہ کے ائمہ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی دعوے ہے کہ یہ احکام کسی زمانہ میں رواج نہیں پائے کسی کسی ظالم بادشاہ نے جوش تعصب میں اس قسم کی کارروائی کی تو وہ اسی عہد تک رہی مورخین نے عام طور پر لکھا ہے کہ سب سے پہلے جسنے ذمیوں کا لباس بدلا وہ المتوکل باللہ عباسی تھا" اس سے یہ تو علانیہ ثابت ہے کہ متوکل باللہ سے پہلے یہ لباس نہ تھا متوکل نے ذمیوں پر اور بھی طرح طرح کی سختیاں کیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ وہی متوکل ہے جسنے حضرت امام حسین علیہ السلام کے مزار مبارک کو کھدوا کر زمین کے برابر کر دیا۔ اور منادی کرادی کہ کوئی شخص زیارت کو نہ آنے پائے، جس شخص نے خود جگر گوشۂ رسول کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہو اُسکے کسی فعل پر کیا استدلال ہو سکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ حضرت عمر فاروق نے بھی ذمیوں کے لیے ایک خاص لباس کی تعیین کی تھی لیکن

یہ وہی لباس تہا جو مدت سے انکا قومی لباس چلا آتا تہا اور اسوجہ سے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اس سے تحقیر اور ذلت مقصود تہی۔ اس بحث کو ہم نے مختصراً سیرۃ النعمان میں لکھا ہے اور انشاء اللہ ہم الفاروق میں اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دینگے۔ یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ حضرت عمر کا یہ حکم آیا کوئی مذہبی اور انتظامی حیثیت رکہتا تہا یا صرف انکا مذاق طبیعت تہا جس کے معنی صرف یہ تہی کہ تمام قومیں اپنی قومی خصوصیتوں پر قائم رہیں۔

اس امر کے فیصلہ کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ لباس کے بارہ میں حضرت عمر کے احکام کس حد تک عمل میں آسکے۔

حضرت عمرؓ نے جہاں غیر قوموں کو عرب کے لباس کے اختیار کرنے سے روکا تہا' اہل عرب کو بھی عجم کی وضع سے پرہیز کرنے کی تاکید کی تہی۔ چنانچہ عتبہ بن فرقد کو جو فرمان لکھا تہا۔ اسمیں یہ الفاظ تہے علیکم بلباس ابیکم اسمعیل وایاکم والتنعم وزی العجم والقوا الخفاف والقوا السراویل۔ یعنی تمکو اپنے باپ اسمٰعیل کا لباس پہنا چاہیے۔ خبردار عیش طلبی اور اہل عجم کی وضع نہ اختیار کرنا۔ موزہ اور پاجامہ پہننا چھوڑ دو۔

لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمر بیت المقدس کے معاہدہ کے لیئے شام تشریف لے گئے تو تمام افسران فوجی رومیوں کے لباس میں تہے' اسپر ناراضی بہی ظاہر فرمائی لیکن جب ان لوگوں نے اسکا سبب بتایا تو چپ ہو گئے۔ اس سے بڑہ کر یہ کہ جب مصر فتح ہوا تو اہل فوج کی خوراک ولباس کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ عیسائی ہر سال غلہ اور کپڑوں کی ایک تعداد مقررہ جزیہ کے ساتھ ادا کرتے رہیں' ان کپڑوں میں عمامہ اور جُبّہ کے ساتھ موزے اور پاجامے بہی شامل[1] تہے' حالانکہ موزہ اور پاجامہ کے استعمال کو حضرت عمرؓ اپنے سابق فرمانوں میں منع کر چکے تہے' حضرت عمر کی ان دو مختلف

[1] فتوح البلدان صفحہ ۲۱۵۔

کاروائیوں کی تاویل اسکے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ اول اول انکی وہ رائے تھی لیکن جب انہوں نے
دیکھا کہ طبائع کے میلان عام کو وہ روک نہیں سکتے تو انہوں نے اس خیال کو جانے دیا۔

غیر قوموں کو حضرت عمرؓ نے جو روک ٹوک کی تھی وہ بھی نہ چل سکی عیسائیوں اور یہودیوں نے
مسلمانوں کی بہت سی خصوصیتیں اختیار کرلیں یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز نے جو حضرت عمرؓ کے
قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے اپنے ایک عامل کو لکھا کہ "قد ذکر لی ان کثیرا ممن قبلک من النصاریٰ
قد راجعوا لبس العمائم وترکوا المناطق[1] یعنے مجکو معلوم ہوا ہے کہ اکثر عیسائی عمامہ باندھنے لگے
ہیں اور پیٹیاں لگانی چھوڑ دی ہیں"۔

ایک خاص قابل لحاظ یہ بات ہے کہ مسلمان جہاں جہاں گئے اور جہاں جہاں انکی حکومتیں قائم
ہوئیں انہوں نے خود مفتوح قوموں کا لباس اختیار کرلیا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر انکا لباس ذلت اور
تحقیر کی علامت ہوتا تو مسلمان ذلت اور تحقیر کو کیوں گوارا کرتے عباسیوں کی سلطنت کا آغاز
درحقیقت منصور کے عہد سے سمجھا جاتا ہے اسنے دربار کے لیے جو ٹوپی اختیار کی وہی مجوسیوں کی
ٹوپی تھی جو خاص انکی قومی علامت تھی معتصم باللہ جس کے زمانہ میں دولت عباسیہ پورے شباب
پر پہنچ گئی تھی اسنے بالکل شاہان عجم کی وضع اختیار کرلی تھی مورخ مسعودی نے لکھا ہے "وغلب
علیہ التشبہ بملوک الاعاجم فی الآلۃ ولبس القلانس والشاشیات فلبسھا الناس
اقتداءً بفعلہ وائتماماً بہ فسمیت المعتصمیات[2]" یعنی وہ ٹوپی اوڑھنے پگڑی باندھنے
اور ساز و سامان رکھنے میں رئیسان عجم کی تقلید کا بہت شائق تھا چنانچہ اسکو دیکھکر سب نے یہ وضع اختیار
کرلی اور اس وضع کا نام معتصمی پڑگیا۔

سندھ وغیرہ میں جب عربوں کی حکومت قائم ہوئی اور اس کے مختلف حصوں میں خاص

[1] کتاب الخراج صفحہ ۷۳۔ [2] مروج الذہب مسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ۔

عرب کی نسل کے سلاطین فرمانروا ہوئے تو تمام مسلمانوں نے ہندوؤں کی وضع اختیار کرلی چنانچہ ابن حوقل بغدادی جسنے چوتھی صدی کے آغاز میں ان ممالک کا سفر کیا تھا۔ کھنبات کی نسبت اپنی جغرافیہ میں لکھتا ہے" وزی المسلمین والکفار بھا واحد فی اللباس وارسال الشعر یعنی یہاں مسلمان اور کافروں کی ایک وضع ہے دونوں ایک سا لباس پہنتے ہیں اور بال بڑے بڑے رکھتے ہیں"

وہی مورخ سندہ اور منصورہ کی نسبت لکھتا ہے "وزیھم زی اھل العراق الا ان زی ملوکھم یقارب زی ملوک الھند، یعنی یہاں کے مسلمانوں کا لباس عراق کا سا ہے لیکن یہاں کے بادشاہوں کی وضع ہندو راجاؤں کے قریب قریب ہے"۔

ذمیوں کو سلام کرنا

مخالفوں کی طرف سے بلکہ خود متعصب مسلمانوں کی طرف سے بڑا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود یہ حکم دیا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو سلام نہ کرو، چنانچہ عبداللہ بن عمر نے ایک دفعہ ناواقفیت سے ایک عیسائی کو سلام کیا تو پھر اس سے جا کر کہہ آئے کہ تو میرا سلام پھیر دے" یہ اور اس قسم کی روایتیں بہت زیادہ شہرت پکڑ گئی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس از سر تا بکل پردہ اٹھا دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ منورہ اور اسکے اطراف میں جو یہود رہتے تھے اُن میں اسقدر تعصب تھا کہ بات بات میں اُسکا اثر پایا جاتا تھا وہ مسلمانوں کو سلام کرتے تھے تو السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہتے تھے جسکے معنی یہ ہیں کہ "تمکو موت آئے" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ جب یہود اسطرح سے سلام کریں تو تم صرف یہ کہدو کہ علیکم یعنی "تمپر"[۱] یہی روایت ہے جو مختلف پیرایوں میں ادا کی گئی ہے اور جسکا حاصل صرف یہ ہے کہ جس طرح لوگ تمسے پیش آئیں تم بھی

[۱] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۵۹۔

اُسنے اُسی طرح پیش آؤ" بے شبہ عبداللہ بن عمر نے سلام کہکر واپس لیا تہا لیکن اولا تو اسبات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ عیسائی ذمّی یعنی اسلام کی رعیت تہا اور ہماری بحث یہاں صرف ذمیوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے اصل بات یہ ہے کہ عبداللہ بن عمر کی یہ ذاتی رائے تہی اور دوسرے صحابہ جو علم و فضل تحقیق و اجتہاد میں اُنسے بہت بڑہ کر تہے اُنکی رائے اسکے بالکل خلاف تہی حضرت عبداللہ بن عباس جنکو بحر العلم کا خطاب ملا تہا وہ فرمایا کرتے تہے کہ کوئی شخص یہودی ہو یا عیسائی یا آتش پرست اُسکے سلام کا جواب اُسی طرح دینا چاہیے جس طرح وہ تمکو سلام کرتا ہے۔ کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے کہ اذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منہا او ردوہا یعنی جب تمکو کوئی شخص سلام کرے تو تم اُسے زیادہ عمدہ طور پر اُسکا جواب دو یا عمدہ طور سے نہیں تو برابر طور سے ہی عبداللہ بن عباس کا یہ قول امام بخاری نے ادب المفرد میں نقل کیا ہے۔ ابو موسیٰ اشعری جو بڑے رتبہ کے صحابی تہے اُنہوں نے ایک عیسائی راہب کو خط لکہا تو سرنامہ پر سلام لکہا اسپر ایک شخص نے اعتراض کیا اُنہوں نے جواب دیا کہ اُسنے مجکو خط میں سلام لکہا تہا تو میں نے بہی لکہا" امام بخاری نے ادب المفرد میں عبداللہ بن عباس کا قول لکہا ہے کہ لو قال لی فرعون بارک اللہ فیک قلت وفیک یعنی اگر فرعون بہی مجکو یہ الفاظ کہے کہ خدا تجکو برکت دے تو میں اُسکے جواب میں کہوں گا کہ خدا تجکو برکت دے۔

حاصل یہ کہ اسلام کا یہ اُصول تہا اور اسی پر ہمیشہ عمل درآمد رہا کہ جو قوم جس طرح اسلام کے ساتھ پیش آئی تہی اسلام بہی اُسکے ساتھ اُسی طرح پیش آتا تہا۔ جو عیسائی یا یہودی وغیرہ دوستانہ و ہمدردانہ برتاؤ کرتے تہے اُنکے ساتھ اُسی طریقے سے برتاؤ کیا جاتا تہا" البتہ اسلام میں عیسائیوں کی طرح یہہ فیاضی نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو وہ دوسرا گال پہیر دے کہ لو یہ بہی حاضر ہے۔

ذمیوں کو معاشرت کے تمام امور میں جو مساویانہ درجہ حاصل تہا اُسکا ثبوت اس سے بڑہ کر کیا ہوگا

ذمیوں کا ذکر اسلامی تاریخوں میں

کہ اسلامی تذکروں میں جہاں کسی صاحب علم عیسائی یا یہودی کا ذکر آتا ہے تو اُسکا نام اُسی معززاور
مدح آمیز طریقہ سے لیا جاتا ہے جس طرح ایک مسلمان اہل کمال کا لیا جا سکتا تھا یہاں تک کہ اگر مذہب
کی تصریح نہ ہو تو کسی طرح امتیاز نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی مسلمان کا تذکرہ ہے یا کسی غیر مذہب کے آدمی کا بختیشوع
جبریل بسلویہ۔ حنین بن اسحاق۔ یوحنا بن ماسویہ۔ ابو اسحاق صابی کا تذکرہ اسلامی
تاریخوں میں جس عظمت سے کیا گیا ہے اُن کتابوں کے پڑھنے سے اُسکا اندازہ ہو سکتا ہے میں اس موقع پر
نمونہ کے لیے صرف ابن التلمیذ کی نسبت جو بغداد کا ایک معزز عیسائی تھا مورخانِ اسلام کے چند فقرے
نقل کرتا ہوں عماد کاتب نے جو سلطان صلاح الدین کا میر منشی تھا اسکو سلطان الحکما کے لقب سے
مخاطب کر کے یہ الفاظ لکھے ہیں ورأیته وهو شیخ بهی المنظر حسن الرواء لطیف الروح
بعید الهم۔ عالی الهمة۔ مصیب الفکر حازم الرای وکنت اعجب فی امرہ کیف حرم
الاسلام مع کمال فهمه وغزارة علمه۔

کیا کوئی قوم کسی دوسری قوم کا ذکر اس سے زیادہ مدح اور تعریف کے ساتھ کر سکتی ہے آجکل کے
مقدس علما کے آگے اگر دنیاوی حیثیت میں بھی کسی انگریز کا ذکر مدح کے ساتھ کیا جائے تو وہ اُسکو
اسلامی شان کے خلاف سمجھیں گے مگر اسکی صرف یہ وجہ ہے کہ انکو تاریخ پر نظر نہیں اور انکو معلوم نہیں
کہ وہ جن بزرگوں کے نام لیوا ہیں اُنکا طریق عمل کیا تھا۔

عباسیوں کے دربار میں ذمیوں کی عزت

خلفائے عباسیہ کے دربار میں غیر مذہب والوں کو جو اعزاز اور رتبہ حاصل تھا اُس سے کون انکار
کر سکتا ہے عباسیوں کے دربار کا یہ خاص آئین تھا کہ کسی شخص کا نام دربار میں لقب یا کنیت کے
ساتھ نہیں لیا جاتا تھا' اس قاعدہ سے کوئی ایسا ہی بڑی عزت اور مرتبہ کا آدمی مستثنے ہو سکتا تھا'
یہاں تک کہ اکثر بڑے بڑے علما کو یہ عزت نصیب نہیں ہوتی تھی' باوجود اس کے مامون الرشید جبریل
بن بختیشوع کا نام دربار میں کنیت کے ساتھ لیتا تھا۔ ہرون الرشید نے عام حکم دیدیا تھا کہ جس شخص کو مجھ

کچھ کہنا ہوتا یا کوئی غرض پیش کرنی ہو تو جبریل بن بختیشوع کے ذریعہ سے کرتے چنانچہ بڑے بڑے
افسران فوجی ہرون الرشید سے جو کچھ عرض معروض کرتے تھے جبریل کے ذریعہ سے کرتے تھے
متوکل باللہ نے باوجود اسکے کہ ذمیوں کی نسبت سخت احکام جاری کیے تھے تاہم اسکے دربار میں ذمی
اہل کمال کو یہ عزت حاصل تھی کہ بختیشوع دربار میں خود متوکل کا سا لباس پہنکر آتا تھا اور اکثر صحبتوں میں
متوکل کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھتا تھا یہاں تک کہ ایک دفعہ بختیشوع متوکل کی خدمت میں حاضر ہوا
تو اتفاق سے وہ اسوقت دیوان خاص کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا تھا بختیشوع بھی وہیں چوکھٹ پر اسکے
برابر بیٹھ گیا۔ سلمویہ بن بنان کو جو عیسائی مذہب رکھتا تھا معتصم باللہ کے دربار میں یہ عزت حاصل تھی کہ معتصم
کے جسقدر فرمان صادر ہوتے تھے سلمویہ کے دستخط سے ہوتے تھے علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات
الاطباء میں سلمویہ کی نسبت معتصم کا یہ فقرہ نقل کیا ہے کہ اکبر عندی من قاضی القضاۃ یعنی سلمویہ
میرے نزدیک قاضی القضاۃ سے بڑھکر ہے۔ سلمویہ جب بیمار ہوا تو معتصم خود عیادت کو گیا اور افسوس
کے ساتھ رویا۔ سلمویہ نے جب وفات کی تو اس رنج میں تمام دن کھانا نہیں کھایا اور حکم دیا کہ اسکا جنازہ
ایوان شاہی میں لا کر رکھا جائے اور عیسائی مذہب کے موافق شمع اور بخور جلا کر اسکے جنازہ کی نماز پڑھی جائے
خلیفہ المعتضد باللہ کے دربار میں جہاں تمام وزراء امراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے صرف وزیر اعظم
اور ثابت بن قرہ کو بیٹھنے کی اجازت تھی۔ حالانکہ ثابت بن قرہ مذہباً صابی تھا اور ذمی تھا۔ ایکدن معتضد
ثابت بن قرہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیکر ٹہل رہا تھا دفعۃً معتضد نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ثابت خوف سے
کانپ اٹھا۔ معتضد نے کہا ڈرو نہیں میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ کے اوپر تھا۔ لیکن چونکہ تم علم و فضل میں مجھ سے
بڑھکر ہو اسلیے تمہارا ہاتھ اوپر ہونا چاہیے"

سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس نہایت پابند شریعت اور متقی و پرہیزگار تھا اسکے دربار میں
کثرت سے عیسائی تھے اور وہ انکی نہایت عزت و توقیر کرتا تھا انہی میں سے ابن المطران ایک عیسائی تھا

صلاح الدین کی عادت تھی کہ وہ لڑائی کے معرکوں میں ایک سرخ خیمہ نصب کراتا تھا اور جب لڑائی سے فارغ ہو کر بیٹھتا تھا تو اسی خیمہ میں بیٹھتا تھا چونکہ یہ امتیاز کی علامت تھی اسلیے حکم تھا کہ اور کوئی شخص اس رنگ کا خیمہ نہ رکھے۔ بن لمطران چونکہ شان و شوکت اور تمام باتوں میں خود سلطان صلاح الدین کی ہمسری کرنا چاہتا تھا اسنے اپنا خیمہ بھی سرخ رنگ کا طیار کرایا اور اسی میں بیٹھا کرتا تھا صلاح الدین نے دیکھا تو کہا کہ مجکو اس سے کوئی اعزاز مقصود نہیں تھا صرف ضرورت کی وجہ سے ایسا کیا گیا تاکہ لوگ میرے خیمہ کو بآسانی پہچان لیں، یہ کہکر اُسکا خیمہ اُکھڑوا دیا۔ بن المطران اسپر سخت برہم ہوا اور دو دن تک دربار میں نہ آیا۔ آخر صلاح الدین نے بڑی استمالت سے اُسکو راضی کیا، اس قسم کی سیکڑوں مثالیں ہیں کوئی کہاں تک گنوائے۔

یورپ والو! اگر اسلامی حکومتوں میں ذمیوں کی اسی طرح ذلت اور تحقیر کی جاتی تھی تو کاش تم اپنی مفتوحہ قوموں کے ساتھ اسی ذلت اور تحقیر کا برتاؤ کرتے۔

ذمیوں کے ساتھ ہمدردی

اعزاز اور توقیر کی نسبت شاید کہا جائے کہ یہ پالٹکس کی بنا پر تھا۔ اسلیے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام اور جانشینان اسلام ذمیوں کی نسبت دلی ہمدردی اور غمخواری کے کیا خیالات رکھتے تھے۔ ذمیوں کی نسبت اگرچہ ہر قسم کے معاملات حضرت عمرؓ کے عہد میں منضبط ہوئے اور زمانہ مابعد میں بلحاظ اغلب اُنہی کا طرزِ عمل سچے مسلمانوں کا طرزِ عمل ہا۔ لیکن ابتدا خود جناب رسول اللہ کے زبانِ مبارک میں ہو چکی تھی اور اسوجہ سے ہمکو اسباب میں خود شریعت کا طرزِ عمل معلوم ہو سکتا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہ بن ارقم کو جزیہ کے وصول کرنے پر مقرر کیا تو اُنکو بُلا کر فرمایا الا من ظلم معاھدا او کلفہ فوق طاقتہ او انتقصہ او اخذ منہ شیئا بغیر طیب نفسہ فانا حجیجہ یوم القیامۃ[1]

[1] کتاب مذکور صفحہ ۷۲ — ۱۲

یعنی جان لو! کہ جو شخص کسی معاہد (یعنی ذمی) پر ظلم کریگا' یا اُس سے اُسکی طاقت سے زیادہ کام لیگا یا اُسکو ذلیل کریگا یا اُس سے کوئی چیز اُس کی مرضی کے بغیر لیگا تو میں قیامت کے دن اُسکا دشمن ہونگا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس ہدایت کا یہ اثر تھا کہ صحابہ جہاں کہیں ذمیوں پر کسی قسم کی سختی ہوتی دیکھتے تھے فوراً مواخذہ کرتے تھے سعید بن زید نے ایک دفعہ دیکھا کہ ذمیوں کو مالگذاری وصول کرنے کے لیے دہوپ میں کھڑا کیا گیا ہے اُسی وقت وہاں کے حاکم سے جاکر کہا کہ میں نے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنا ہے کہ جو شخص لوگوں کو عذاب دیتا ہے خدا اُسکو عذاب دیگا ہشام بن حکیم کو بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا اور انہوں نے اُسی وقت حاکم وقت یعنی عیاض بن غنم کے پاس جاکر ملامت کی اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی قول سند میں پیش کیا۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے شخص کو ایک دروازہ پر بھیک مانگتے دیکھا' اُس سے پوچھا کہ تیرا کیا مذہب ہے' اُسنے کہا یہودی' فرمایا بھیک کیوں مانگتا ہے' بولا کہ تنگی اور مفلسی کی وجہ سے اور جزیہ کے ادا کرنے کے لیے" حضرت عمرؓ اسکو اپنے ساتھ اپنے مکان پر لوا گئے اور کچھ نقد اپنے پاس سے دیکر بیت المال کے افسر کے پاس کہلا بھیجا کہ۔ انظر هذا وضربائه فوالله ما انصفنا ه ان اکلنا شبیبته ثم نخذله عند الهرم انما الصدقات للفقراء والمساکین والفقراء هم المسلمون وهذا من المساکین من اهل الکتاب۔ یعنی اس بوڑھے اور اسکے اور ساتھیوں پر خیال کرو خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ اسکی جوانی کی کمائی ہم نے کھائی اور اب یہ بوڑھا ہو گیا ہے تو اسکو ہم نکال دیں صدقہ کی بنسبت جو خدا نے کہا ہے کہ فقیروں اور مسکینوں کو دینا چاہیے تو فقیروں سے مسلمان اور مسکینوں سے اہل کتاب مُراد ہیں۔"

حضرت عمرؓ کی اِس ہمدردی اور رحم کا جو اُنکو ذمیوں کے ساتھ تھا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوگا

سلہ کتاب الخراج صفحہ ۔

کرباوجود اسکے کہ وہ ایک ذمی کے ہاتھ سے مارے گئے تھے تاہم ذمیوں کا انکو یہ خیال تھا کہ وفات کے وقت تین نہایت ضروری وصیتیں جو کیں اُنمیں ایک یہ تھی کہ ذمیوں کے ساتھ جو اقرار ہیں وہ پورے کیے جائیں اُنکی طاقت سے زیادہ کام اُنسے نہ لیا جائے اور اُن کے دشمنوں کے مقابلہ میں اُن کی طرف سے لڑائی کی جائے[1]

عراق میں حضرت عمرؓ نے جو خراج مقرر کیا تھا اگرچہ نہایت خفیف تھا تاہم انکو ہمیشہ خیال رہا کہ تشخیص مالگذاری میں ذمیوں پر سختی تو نہیں کی گئی۔ چنانچہ جن لوگوں نے زمین کی پیمایش کرکے جمع تشخیص کی تھی انکو اکثر بلاکر اسکی نسبت پوچھا کرتے تھے خراج جب آتا تھا تو دس شخص بصرہ سے اور دس کوفہ سے طلب کیے جاتے تھے حضرت عمر اُنکے اظہار لیتے تھے اور جب وہ چار دفعہ شرعی قسم کھاکر کہتے تھے کہ مالگذاری کے وصول کرنے میں ذمیوں پر سختی نہیں کی گئی ہے تب انکو تسلی ہوتی تھی مسلمانوں کو ذمیوں کے ساتھ جو ہمدردی تھی اُسکے لیے اس قسم کی سیکڑوں جزری مثالیں ملتی ہیں لیکن اُن سبکا استقصا نہیں کیا جاسکتا۔ اسلیے ہم ایک ایسے واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں جس سے جماعت اسلامی کی عام رائے کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

سائپرس کا واقعہ

جزیرہ سائپرس جب ۲۹ھ میں فتح ہوا تو شرط یہ ٹھہری کہ وہاں کے لوگ مسلمانوں اور رومیوں کے باہمی معرکوں میں کسی کا ساتھ نہ دینگے لیکن ۳۲ھ میں انہوں نے مسلمانوں کے برخلاف رومیوں کو مدد دی امیر معاویہ نے اُنپر چڑہائی کی اور شہر کو فتح کرکے پہلی شرط پر پھر صلح کرلی۔ لیکن وہ اپنی شرارت سے پھر باز نہ آئے۔ اسپر ولید بن یزید نے ایک گروہ کو جلاوطنی کی سزا دی اگرچہ وہ اس سزا کے فی الحقیقت مستحق تھے لیکن ان کی سازش کا ثبوت قطعی نہ تھا تمام مسلمان اور علما اور فقہا ولید کی اس حرکت پر سخت برہم ہوے کہ ذمیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا جائز نہیں چنانچہ ولید کے بعد جب اُسکا بیٹا

---

[1] حضرت عمرؓ کے اس قول کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔

تخت خلافت پر بیٹھا تو اسنے اُن سب کو واپس بلا لیا اور تمام مسلمانوں نے ولید کی اس کارروائی کی تحسین کی۔ دولت عباسیہ کے زمانہ میں وہاں کی رعایا نے پھر بغاوت کا ارادہ کیا اسوقت عبدالملک بن صالح گورنر تھا اور بڑے بڑے نامور ائمہ اور فقہا شلاً لیث بن سعد۔ امام مالک سفیان بن عیینہ۔ موسیٰ بن اعین۔ اسمٰعیل بن عیاش۔ یحییٰ بن حمزہ۔ ابو اسحٰق فزاری۔ مخلد بن حسین وغیرہ موجود تھے عبدالملک نے ان سب کے پاس استفتا بھیجا اور پوچھا کہ قاعدۂ شریعت کی رو سے ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیئے۔ علامہ بلاذری نے فتوح البلدان میں ان سب کے فتوے الگ الگ انکے الفاظ میں نقل کیے ہیں۔ اکثروں نے تو یہی رائے دی کہ انسے درگذر کرنا چاہیئے کیونکہ فقط ارادۂ بغاوت سے وہ ذمیت کے حقوق سے محروم نہیں ہوگئے لیکن جن بعض بزرگوں نے سختی کی انہوں نے بھی صرف یہ اجازت دی کہ انکو سال بھر کی مہلت دیجائے اگر اس مدت میں وہ پورے مطیع ہوجائیں تو بہتر ورنہ انکو کہدیا جاے کہ رومیوں کے ملک میں چلے جائیں۔ یحییٰ بن حمزہ اور ابو اسحٰق فزاری و مخلد بن حسین نے یہ فتویٰ دیا کہ ان لوگوں کے پاس جسقدر مال و اسباب اور زمین وغیرہ ہے ایک ایک چیز کی گنکر قیمت بیت المال سے ادا کی جاے اور انکو کہدیا جاے کہ وہ اور کہیں جاکر آباد ہوجائیں۔ اسمٰعیل بن عیاش نے لکھا کہ وہ چاہے رومیوں کے غلام ہیں اسلیے ہمکو انکی مدد کرنی چاہیئے ان بزرگوں کے فتووں اور رایوں سے بآسانی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ذمیوں کے ساتھ اسلام کا کیا برتاؤ تھا۔

سب سے اخیر بحث ملکی حقوق کی ہے یعنی یہ کہ ذمیوں کو انتظام سلطنت میں کہاں تک دخل تھا لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ شروع سے اس بحث میں ہمارے مخاطب عیسائی ہیں جنکا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام غیر مذہب والوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کا حکم دیتا ہے اس لیے ہم ملکی حقوق کی بحث میں یورپ کی نظام سلطنت سے موازنہ کرینگے کیونکہ عیسائیوں کے نزدیک عدل و انصاف تہذیب اور شائستگی کا معیار یورپ اور یورپ کا اصول حکومت ہے۔

ملکی حقوق۔

سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ملکی حقوق کی نسبت یورپ کی مہذب سے مہذب حکومتوں نے فاتح و مفتوح میں جو حد فاصل قائم کی ہے وہ اسلامی حکومتوں نے کبھی نہیں کی' اسلام نے یا اسلامی حکومتوں نے کبھی یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ جو شخص ولایت زا ہنو اسکو فلاں قسم کے حقوق نہیں ملسکتے' یا فلاں فلاں عہدے فاتح قوم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہیں'۔

اسلام کے آغاز میں ملکی اور فوجی عہدے مختلف نتھے' جو شخص صوبہ کا گورنر ہوتا تھا وہی سپہ سالار بھی ہوتا تھا' یہاں تک کہ جو لوگ منصب قضا پر مامور ہوتے تھے وہی ضرورت کے وقت فوج کے جنرل مقرر ہو کر بھیجدیئے جاتے تھے' تہذیب اور شائستگی کے تاریخ داں اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ سلطنت جب اول اول قائم ہوتی ہے تو اسکے مختلف صیغے مدت تک باہم مختلط رہتے ہیں جسقدر تمدن زیادہ ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر تقسیم عمل کا اصول زیادہ عمل میں آتا جاتا ہے۔ اور ہر ہر صیغہ جدا جدا صورت پکڑتا جاتا ہے' اسی کلیہ کے موافق اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی اس قسم کا اختلاط والتباس رہا اور اسکا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ مفتوح قومیں' ملکی انتظامات میں کم شامل ہو سکیں کیونکہ اسوقت تک جسقدر ملکی عہدے تھے انمیں فوجی مہمات بھی شامل تھیں' اور اسوجہ سے غیر قومیں خود ان پر خطر خدمات کو گوارا نہیں کرتی تھیں۔

اس موقع پر یہ امر قابل استفسار ہے کہ اگر غیر قوموں نے خود فوجی خدمتوں کو قبول کرنا چاہا تو اسلام نے انکی خواہش کا کہاں تک لحاظ رکھا' اور جواب یہ ہے کہ اسلام نے بے تکلف انکی درخواست منظور کی' حضرت عمرؓ کے وقت بارہا یہ موقعے پیش آئے کہ عیسائیوں اور آتش پرستوں نے باوجود اپنے مذہب پر قائم رہنے کے فوجی خدمتوں میں شامل ہونے کی درخواست کی اور حضرت عمرؓ نے نہایت خوشی سے انکی درخواست کو منظور کر کے انکو تمام وہ حقوق دیدیئے جو مسلمانوں کو حاصل تھے' لیکن ناظرین کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ ہم اس موقع پر ان واقعات کی تفصیل بھی بیان کریں گے'

ورنہ الفاروق کے لیے کیا رہ جائیگا؟

بہرحال اسلام کے ابتدائی زمانہ میں وہ خدمتیں اور عہدے جنہیں فوجی حیثیت بھی شامل تھی ذمیوں کو کم ملے لیکن جس صیغہ میں اس حیثیت کا لگاؤ نہ تھا وہ ذمیوں کے لیے کھلا رہا بلکہ حق یہ ہے کہ خاص انہی کے قبضۂ اختیار میں رہا۔ خراج اور مالگذاری کے محکموں کے دفتر پر عموماً عیسائی اور آتش پرست قابض تھے یہاں تک کہ اس دفتر کی زبان بھی لاطینی اور فارسی و قبطی رہی۔ شام میں سنہ ۸۱ ہجری تک دفتر خراج لاطینی زبان میں تھا اور اس وقت ابن سناش نام ایک عیسائی اس محکمہ کا افسر تھا عراق کا دفتر حجاج بن یوسف کے زمانہ میں فارسی سے عربی زبان میں منتقل ہوا۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ دفتر خراج کے میر منشی نے جو آتش پرست تھا اور جس کا نام فرخ زاد تھا مغرورانہ یہ دعوی کیا تھا کہ عربی زبان اس قابل نہیں کہ حساب کے تمام جزئیات کو ادا کر سکے۔

رفتہ رفتہ جب تمدن نے زیادہ ترقی کی اور ملکی اور فوجی صیغہ میں بالکل امتیاز ہوا تو ذمیوں کو ملکی صیغوں میں بار ہونے لگا۔ سب سے پہلے اسکی ابتدا امیر معاویہ کے عہد میں ہوئی یعنی ابن آثال[1] ایک عیسائی حمص کا فنانشل کمشنر اور وہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ رفتہ رفتہ کوئی بڑے سے بڑا منصب یا عہدہ ایسا نہیں رہا جو غیر مذہب والوں کے دسترس سے باہر ہو۔ مذہبی صیغہ کو چھوڑ کر باقی سب سے بڑے عہدے دو تھے وزارت اور کتابت۔ کتابت آج کل کی اصطلاح میں چیف سکرٹری کے عہدے کے برابر تھی یعنی ہر قسم کے فرامین سلطنت اور سلطنت غیر سے مراسلت کا کام اسی سے متعلق ہوتا تھا اسی وجہ سے وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا چنانچہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں جہاں اس عہدہ کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ صاحب هذه الخطة لابد ان يتخير من ارفع طبقات الناس۔

۱؎ تاریخ یعقوبی ذکر حکومت معاویہ۔

غرض یہ دونوں منصب جو اعلیٰ ترین مناصب تھے ذمیوں کو عطا کیے گئے عبدالملک بن مروان جو
سلطنت بنو امیہ کا دوسرا تاجدار تھا۔ کا کاتب ابن سرجون ایک عیسائی تھا
دولت عباسیہ کے عہد میں ابو اسحاق صابی جو اس منصب پر ممتاز تھا بڑے رتبہ کا شخص گذرا
ہے اور ابن خلکان وغیرہ نے اسکے فضل وکمال کی بڑی تعریف کی ہے سلطنت دیلم کا سرتاج
عضدالدولہ جو شہنشاہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا اسکا وزیر اعظم ایک عیسائی تھا جسکا نام نصر بن
ہرون تھا یہ تمام خلفا وسلاطین دنیاوی جاہ وجلال کے ساتھ مذہبی شان بھی رکھتے تھے یورپ کو
اس قسم کی بے تعصبی اور فیاضی تک پہنچنے کے لیے ابھی کئی سو برس درکار ہیں۔
ایک امر البتہ قابل لحاظ ہے کہ اسلامی حکومتوں میں سول اور ملیٹری ڈپارٹمنٹ کسی زمانہ میں
صاف صاف الگ نہیں ہوئے اسواسطے جس حد تک ملکی صیغہ میں فوجی حیثیت کا لگاؤ رہتا تھا
ذمی اس سے کم متمتع ہو سکتے تھے لیکن اسکے سوا اور ہر قسم کے مناصب اور عہدے تمام ذمیوں
کے لیے کھلے تھے اور ہر زمانہ میں سیکڑوں اور ہزاروں عیسائی یہودی ہندو آتش پرست سرکاری
خدمتوں پر مامور رہے۔ ہندوستان میں ایک خاص تغیر ہوا یعنی یہ کہ ہندوؤں نے کثرت سے فوجی
خدمتیں قبول کیں اور فوج میں بہت بڑا حصہ انکا تھا اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوؤں نے ہر قسم کے بڑے
بڑے ملکی عہدے حاصل کیے نا واقف ہندو خیال کرتے ہیں کہ یہ فیاضی صرف اکبر کے ساتھ مخصوص
تھی اور یہ انکی مادری حیثیت کا اثر تھا لیکن یہ انکی تاریخی جہالت کا نتیجہ ہے جہانگیر شاہجہاں یہانتک کہ
عالمگیر جسکو نہایت متعصب خیال کیا جاتا ہے سب نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیئے شاہجہاں
کے دربار میں سب سے بڑا منصب نہ ہزاری تھا یعنی وہ ارکان سلطنت جنکو نو ہزار سواروں کو رکھنے
کی اجازت تھی اس سے اتر کر ہفت ہزاری اور اس عہدہ پر مہابت خاں خانخاناں ممتاز تھا اس کے
نیچے پنج ہزاری وچار ہزاری وغیرہ تھے چنانچہ اس درجہ کے مناصب پر مسلمانوں اور ہندوؤں کی

تعداد قریب قریب برابر تھی ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہاں اس قسم کے ہندو عہدہ داروں کی فہرست لکھتے ہیں جسکو ہم نے شاہجہاں کی سرکاری تاریخ شاہجہاں نامہ سے انتخاب کیا ہے۔

نام	منصب	نام	منصب
رانا جگت سنگھ	پنجہزاری	راجہ بیٹھل داس	چارہزاری
گج سنگھ	〃	بھارت بندیلہ	〃
جے سنگھ	〃	راؤ سور	〃
راؤ رتن راء	〃	اگدیو رائے	〃
جھجھار سنگھ	〃	ہمیر رائے	〃
مالوجی دکنی	〃		〃
اوداجی رام	〃		〃
بہادر جی	〃		〃

انکے علاوہ گیارہ ہندو افسر دو ہزاری۔ بارہ ڈیڑھ ہزاری۔ سولہ ایک ہزاری۔ آٹھ نہ صدی۔ گیارہ ہشت صدی۔ آٹھ ہفت صدی تھے اور اسکے نیچے کے عہدہ دار تو بیشمار تھے۔

ان تمام واقعات کے ثابت ہونے کے بعد دنیا خود اسکا فیصلہ کر سکتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں نے غیر قوموں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الجزیہ

غیر مذہب والوں نے ہمیشہ اس لفظ کو نہایت ناگواری سے سنا ہے۔ اُنکا خیال ہے کہ اسلام اس لفظ کا موجد ہے۔ اسلام ہی نے یہ اصول پیدا کیا جس سے اُسکا مقصد مسلمانوں اور غیر مذہب والوں میں نہایت متعصبانہ اور نامناسب تفرقہ قائم کرنا تھا۔ اُنکا خیال ہے کہ جزیہ ایک ایسا جبر تھا جس سے بچنے کے لیے اسلام کا قبول کر لینا ہی گوارا کیا جاتا تھا اور اسوجہ سے وہ جبراً مسلمان کرنیکا ایک قوی ذریعہ تھا۔ لیکن یہ تمام غلط خیالات اُنہی غلط فہمیوں سے پیدا ہوئے ہیں جو غیر قوموں کو اسلام کی نسبت ہیں۔ ہم اس موقع پر تین حیثیتوں سے جزیہ پر بحث کرنی چاہتے ہیں۔ جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے اور کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے۔ ایران اور عرب میں جزیہ کی بنیاد کب سے قائم ہوئی۔ اسلام نے اسکو کس مقصد سے اختیار کیا۔

پہلی بحث

جزیہ گو اب مصطلح معنی میں خاص ہو گیا ہے لیکن لغت کی رو سے وہ خراج اور جزیہ کے لیے یکساں موضوع ہے۔ قاموس میں ہے "الجزیۃ خراج الارض وما یوخذ من الذمی"۔ جوہری و صاحب قاموس نے اس لفظ کے اصل و اشتقاق سے کچھ بحث نہیں کی۔ صاحب کشاف نے اسکو "جزی" سے

شفق خیال کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ غیر زبانوں کے جو الفاظ عربی میں مستعمل ہو گئے ہیں انکی نسبت ہمارے مصنفین اکثر غلطی کرتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ خاص اس قسم کے الفاظ نہایت استیعاب سے جمع کیے گئے ہیں اور یہ فن لغت کی ایک شاخ بن گئی ہے۔ تاہم جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں مثلاً شفاء الغلیل وغیرہ اُنسے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انکے مصنفین غیر زبانوں کے ماہر نہ تھے منجنیق اور صوفی صاف یونانی الفاظ ہیں جنکی اصل منگانک اور سوف ہو لیکن ہمارے علمائے لغت منجنیق کی اصل من جہ نیک بتاتے ہیں اور صوفی کو صوف سے ماخوذ سمجھتے ہیں جو ایک قسم کا کپڑا ہوتا ہے۔ اس قسم کے اور سیکڑوں الفاظ ہیں۔

غیر زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کی تحقیق نہایت قدیم ہے۔ سب سے قدیم کتاب جو عربی زبان میں لکھی گئی وہ مفاتیح العلوم ہے۔ یہ کتاب صاحب کشف الظنون کا ماخذ ہے۔ اور علامہ مقریزی نے اُس کی نسبت لکھا ہے کہ کتاب جلیل القدر ہے۔ جزیہ کی نسبت لکھا ہے "والجزیۃ من رؤس اھل الذمۃ جمع جزیۃ وھو معرب کزیت وھو الخراج بالفارسیۃ[۱]۔"

یعنی ذمیوں سے جو جزیہ لیا جاتا ہے یہ معرب لفظ ہے جس کی اصل گزیت ہے اور اس کے معنی فارسی میں خراج کے ہیں"۔

فارسی لغت نویسوں نے گزیت کی نسبت تصریح کی ہے کہ یہ فارسی کا لفظ ہے

برہان قاطع میں ہے "گزیت بفتح اول و کسر ثانی زرے باشد کہ حکام ہر سالہ از رعایا گیرند و آنرا خراج هم گویند و زرے را نیز گویند کہ از کفار ذمی ستانند بتازی جزیہ گویند"

گزیت خاقان خراج چین ستد　　گزیت قیصر گزیت روم ستد

وا اینکہ شہرت دارد بکسر اول و فتح ثالث ست و معرب آن جزیہ باشد۔ فرہنگ جہانگیری کے مصنف نے

---

[۱] دیکھو کتاب مذکور مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۰۔

دوسرے معنی کے سند میں حکیم سوزنی کا یہ شعر سنداً نقل کیا ہے۔

کتاب خویش بخواہم درو عمل بکنم   کہ تا گزیت ستانند ز نحو اہل کتاب

اور یہ بھی لکھا ہے کہ جزیہ اسی کا معرب ہے

ہمکو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جزیہ اصل میں فارسی کا لفظ ہے۔ تصریحات لغت کے علاوہ تاریخی قرینہ نہایت قوی موجود ہے۔ یہ مسلم ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں جزیہ کا لفظ مستعمل ہو چکا تھا۔ یہ بھی مسلم کہ فارسی میں گزیت کا لغت اسی معنی میں قدیم سے شائع ہے۔ تاریخی شہادتوں سے (جیسا کہ ہم آئندہ بیان کرینگے) ثابت ہے کہ نوشیرواں نے جزیہ کے قواعد مقرر کیے تھے اور اس زمانہ میں نوشیرواں کے عمال یمن اور مضافات یمن پر منصوب تھے۔ اس طرح گزیت کا لفظ قانونی طور پر عرب میں پھیلا اور معرب ہو کر جزیہ ہو گیا۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ محکوم ملک میں جب فرمانروا زبان کے الفاظ دخل پانے لگتے ہیں تو سب سے پہلے وہ الفاظ آتے ہیں جو سلطنت کے قانونی الفاظ ہوتے ہیں۔ زبانِ عرب میں جسقدر فارسی الفاظ معرب ہو کر شائع ہو گئے ہیں کسی اور زبان کے نہیں ہوئے۔ اُسپر طرہ یہ کہ جزیہ کا لفظ معرب ہونے کے لیے گویا پہلے ہی آمادہ تھا۔ صرف ایک حرف کی تبدیل اور دو ایک تغیر سے وہ عربی قالب میں پورا اُتر گیا۔

دوسری بحث

جہاں تک ہمکو معلوم ہے ایران و عرب میں خراج و جزیہ کے وہ قواعد جو بادنیٰ تغیر اسلام میں رائج ہیں۔ نوشیرواں کے عہد میں مرتب ہوئے۔ امام ابو جعفر طبری جو بہت بڑے محدث اور مورخ تھے۔ نوشیرواں کے انتظامات ملکی کے بیان میں لکھتے ہیں والزموا الناس الجزیة ما خلا اھل البیوتات والعظماء والمقاتلة والھرابذة والکتاب ومن کان فی خدمة الملک۔ وصیروھا علی طبقات۔ اثنی عشر درھما وثمانیة وستة واربعة ۔ ولم یلزموا الجزیة من کان اتی لہ

من السنّ دون العشرین او فوق الخمسین۔[۵۴]

یعنی لوگوں پر جزیہ مقرر کیا گیا جسکی شرح ۱۲ درہم اور ۸ و ۶ و ۴ تھی لیکن خاندانی شرفا اور امرا اور اہل فوج اور پیشوایان مذہب اور اہل قلم اور عہدہ داران دربار جزیہ سے مستثنے تھے۔ اور وہ لوگ بھی جنکی عمر ۵۰ سے زیادہ یا ۲۰ سے کم ہوتی تھی۔"

امام موصوف اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں وہی الوضائع التی اقتدی بھا عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد الفرس۔ یعنی حضرت عمرؓ نے جب فارس کو فتح کیا تو انہی قاعدوں کی تقلید کی۔" علامہ ابوحنیفہ دینوری نے بھی کتاب الاخبار الطوال میں بعینہٖ یہ تفصیل نقل کیا ہے۔[۵۵]

جس غرض سے نوشیرواں نے جزیہ کا قاعدہ جاری کیا اسکی وجہ علامہ طبری نے نوشیرواں کے اقوال سے یہ نقل کی ہے کہ اہل فوج ملک کے محافظ ہیں اور ملک کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں۔ اسلیے لوگوں کی آمدنی سے انکے لیے ایک رقم خاص مقرر کی گئی کہ انکی محنتوں کا معاوضہ ہو۔

خراج و جزیہ کے متعلق جو کچھ ان مورخوں نے لکھا اسکی تائید فردوسی کے اشعار سے بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض امور میں دونوں کا بیان مختلف ہے۔ ہم ان اشعار کو اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔[۵۶]

ہمہ پادشاہاں شدند انجمن	زمین را بسنجید و بند و رسن	گرفتند نامہ بر یک درم
گرایدون کہ دہقاں بود تخم کار	اگر تاک بار ور شش درم	ز خرما ستان بر ہمیں در شمر
سرگزیت درم بود دہقاں بجور	نبودے غم و رنج گشتی دژم	گزارندہ از دہ درم تا چہار
ببایستے از دو بستہ ی کاردار	دبیر و پرستندہ و شہریار	نبودے بدیوان کسے را شمار

دونوں روایتوں کے فرق کو ناظرین خود سمجھ سکتے ہیں۔

---

۵۴ تاریخ کبیر طبری صفحہ ۹۶۲ ۔ ۵۵ دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۷۰۔

تیسری بحث

اسلام نے جو انتظام قائم کیا اُسکی رو سے ہر مسلمان فوجی خدمت کے لیے مجبور کیا جاسکتا تہا۔ یہ قاعدہ کچھ آسان قاعدہ نہ تہا اور لوگ اگر ذرا بہی اُس سے بچنے کا حیلہ پا جاتے تہے تو اُس سے فائدہ اُٹہانا چاہتے تہے۔ چنانچہ ایک بار جب جزیرہ سسلی میں مکتب کے معلم اس جبر سے بری کر دیئے گئے تو سیکڑوں آدمیوں نے اور کام چھوڑ کر یہی پیشہ اختیار کر لیا۔[1]

اس لحاظ سے کُل مسلمان فوجی خدمت رکہتے تہے اور ضرور تہا کہ وہ جزیہ سے اسی طرح بری رہیں جس طرح نوشیرواں عادل نے عموماً اہل فوج کو اس (جزیہ) سے بری رکہا تہا۔ لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تہے اور جنکی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تہی۔ اُنکو فوجی خدمت پر مجبور کرنیکا اسلام کو کوئی حق نہ تہا۔ نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمات کے لیے راضی ہو سکتے تہے۔ اسلیے ضرور تہا کہ وہ اپنی محافظت کے لیے کوئی معاوضہ دیں۔ اسی معاوضہ کا نام جزیہ تہا جو فارسی لغت سے معرب کیا گیا تہا۔ لیکن اگر کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شریک ہونا یا شرکت کے لیے آمادہ ہونا گوارا کیا تو وہ جزیہ سے بری کر دیئے گئے۔ جیسا کہ ہم آیندہ تاریخی شہادت سے ثابت کرینگے۔

جزیہ کا معاوضہ حفاظت ہونا۔ علمی و عملی طور سے ہمیشہ مسلم رہا اور سچ یہ ہے کہ اسی خیال نے اکثر اہل لغت کو اس طرف متوجہ ہونے نہ دیا کہ جزیہ فارسی زبان کا لفظ ہے وہ سمجھے کہ یہ لفظ جزا سے نکلا ہے جس کے معنی بدلہ کے ہیں اور چونکہ یہ بہی ایک معاوضہ اور بدلہ ہے لہذا اس مناسبت سے اُسکا نام جزیہ رکہا گیا۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم و خلفائے راشدین کے جو معاہدے تاریخوں میں منقول ہیں

---

[1] دیکھو معجم البلدان یاقوت حموی۔ ذکر صقلیہ۔ ۱۲

اُس نے عموماً پایا جاتا ہے کہ جزیہ اُن لوگوں کی محافظت کا معاوضہ تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والی ایلہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا اُسمیں یہ الفاظ مندرج فرمائے "یحفظوا ویمنعوا" یعنے اُن لوگوں کی حفاظت کی جائے اور دشمنوں سے بچائے جائیں[۱]۔ حضرت عمر نے وفات کے قریب جو نہایت ضروری وصیتیں کیں اُنمیں ایک یہ بھی تھی کہ غیر مذہب والے جو ہماری رعایا ہیں وہ خدا اور رسول کی ذمہ داری میں ہیں اور مسلمانوں کو انکی طرف سے انکے دشمنوں سے مقابلہ کرنا چاہیئے[۲]۔ اس موقع پر ہم بعض معاہدات اصلی الفاظ میں نقل کرتے ہیں جنسے نہایت صاف اور صحیح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ تھا۔ اور غیر مذہب والے جو مسلمانوں کی رعایا تھے یہی سمجھکر یہ معاوضہ ادا کرتے تھے۔

هذا كتاب من خالد بن الوليد لصلوبا ابن نسطونا وقومه انى عاهدتكم على الجزية والمنعة فلك الذمة والمنعة فما منعناكم فلنا الجزية والا فلا كتب سنة اثنتى عشرة فى صفر[۳]

یہ خالد ابن الولید کی تحریر ہے صلوبا ابن نسطونا اور انکی قوم کیلئے میں نے تم سے معاہدہ کیا جزیہ اور محافظت پر پس تمہاری ذمہ داری و محافظت ہمپر ہے جبتک ہم تمہاری محافظت کریں ہم کو جزیہ کا حق ہے ورنہ نہیں سنہ ۱۲ھ صفر میں لکھا گیا"۔

عمال اسلام نے عراق عرب کے اضلاع میں وہاں کے باشندوں کو جو عہد نامے لکھے اور جنپر بہت سے صحابہ کے دستخط تھے اُنکے مختصر الفاظ یہ ہیں۔

براءة لمن كان من كذا وكذا من الجزية التى صالحهم عليها الامير خالد بن الوليد وقد قبضت الذى صالحهم

اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے اس اس قدر کا جزیہ دینا قبول کیا ہے اور جنسے خالد بن ولید نے اُنسے مصالحت کی ہے یہ برات نامہ ہے خالد اور مسلمانوں نے

۱؎ دیکھو فتوح البلدان بلاذری صفحہ [illegible] - ۲؎ تاریخ کبیر ابو جعفر جریر طبری مطبوعہ یورپ جزء خامس صفحہ [illegible]

علیہ خالد والمسلمون لکم ید علی من بدل صلح خالد ما اقررتم بالجزیۃ وکنتم امانکم امان وصلحکم صلح ونحن لکم علی الوفاء ۔[1]

جس تعداد پر صلح کی وہ ہمکو وصول ہوئی۔ جو شخص خالد کی صلح کو بدلنا چاہے اُسکو تم لوگ مجبور کرسکتے ہو بشرطیکہ جزیہ ادا کرتے رہو۔ تمہاری امان امان ہے اور تمہاری صلح صلح (یعنی جس سے تم صلح کرو ہم بھی صلح کرینگے۔ اور جسکو تم امان دوگے ہم بھی امان دینگے)

اسکے مقابلہ میں عراق کی رعایا نے یہ تحریر لکھی۔

انا قد ادینا الجزیۃ التی عاهدنا علیها خالد ۔ علی ان یمنعونا وامیرهم البغی من المسلمین وغیرهم ۔ (طبری صفحہ مذکور)

ہم نے وہ جزیہ ادا کردیا جس پر خالد سے معاہدہ کیا تھا اس شرط پر کہ مسلمان اور نیز اور تمام قومیں اگر ہم کو گزند پہنچانا چاہیں تو جماعت اسلام اور اُنکے افسر ہماری حفاظت کے ذمہ دار ہوں۔

ان تحریری معاہدوں کے علاوہ جہاں جہاں صحابہ نے دعوت اسلام کی۔ جزیہ کی نسبت یہی خیال ظاہر کیا۔ مثلاً ۱۴ھ میں یزدگرد کے پاس جب صحابہ گئے تو نعمان بن مقرن نے جو سفارت کے سردار تھے گفتگو کے خاتمہ پر کہا۔ وان اتقیتمونا بالجزاء قبلنا ومنعناکم۔ یعنی اگر جزیہ ادا کرنے کے ذریعہ سے جان بچاؤ گے تو ہم قبول کرینگے اور تمکو تمہارے دشمنوں سے بچائینگے۔ یا جب سپہ سالار فارس سے گفتگو ہوئی تو حذیفہ بن محصن نے کہا والجزاء ونمنعکم ان احتجتم الی ذلک۔ یعنی یا جزیہ دو اور اس صورت میں جب تمکو ضرورت ہوگی تو ہم تمہاری حفاظت کرینگے۔" یہ معاہدے اور تقریریں صرف زبانی باتیں نہ تھیں بلکہ ہمیشہ اسپر عمل کیا گیا۔

ابو عبیدہ جراح نے شام میں جب متواتر فتوحات حاصل کیں تو ہرقل نے ایک

[1] تاریخ طبری صفحہ ۲۰۵۴ -

عظیم الشان فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے طیار کی مسلمانوں کو اُسکے مقابلہ میں شہر بی مستعدی سے ٹہرنا پڑا اور اُنکی تمام قوت و توجہ فوجوں کی ترتیب میں مصروف ہوئی۔ اُسوقت حضرت ابو عبیدہ امین افسر فوج نے اپنے تمام عاملوں کو جو شام کے مفتوحہ شہروں پر مامور تھے لکھ بھیجا کہ جسقدر جزیہ و خراج جہاں جہاں وصول کیا گیا ہے سب اُن لوگوں کو واپس دیدو جنسے وصول ہوا تھا۔ اور اُنسے کہدو کہ ہم نے تُمسے جو کچھ لیا تھا اس شرط پر لیا تھا کہ تمہاری دشمنوں سے تمہاری حفاظت کر سکیں۔ لیکن اب اس وقت کے پیش آجانے کی وجہ سے ہم تمہاری حفاظت کا ذمہ نہیں اُٹھا سکتے۔" ابو عبیدہ کے خاص الفاظ جنمیں عیسائیوں سے خطاب کیا یہ ہیں انما رددنا علیکم اموالکم لانه قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع و انکم قد اشترطتم علینا ان نمنعکم و انا لا نقدر علی ذلک وقد رددنا علیکم ما اخذنا منکم۔ عیسائیوں نے مسلمانوں کو دل سے دعا دی اور کہا کہ خدا پھر تمکو ہمارے شہروں کی حکومت دے۔ رومی ہوتے تو اس موقع پر واپس دینا تو درکنار جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ بھی لے لیتے چنانچہ سب سے پہلے اس حکم کی تعمیل حمص میں ہوئی جہاں حضرت ابو عبیدہ خود مقیم تھے۔ انہوں نے حبیب بن مسلمہ کو بلا کر کہا کہ جو کچھ ذمیوں سے وصول ہوا ہے سب اُنکو واپس کر دو اسکے بعد ابو عبیدہ دمشق میں آئے اور سوید بن کلثوم کو اس کام پر مقرر کیا کہ ذمیوں سے جسقدر رقم وصول ہوئی ہے سب اُنکو واپس کر دی جائے[1]

ان سب باتوں سے زیادہ واضح امر اس دعوے کے لیے دلیل بین ہے کہ اگر کسی غیر قوم نے فوجی خدمت پر رضامندی ظاہر کی تو وہ اُسی طرح جزیہ سے بری ہے جس طرح خود مسلمان۔

---

[1] دیکھو کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۸۰ و فتوح البلدان صفحہ ۱۳۷ و فتوح الشام ازدی صفحہ ۱۳۸-۱۴۰۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب حبیب بن مسلمہ نے قوم جراجمہ[1] پر فتح پائی تو اُن لوگوں نے فوجی خدمتوں میں بوقت ضرورت شریک ہونا خود پسند کیا اور اسوجہ سے وہ تمام قوم جزیہ سے بری رہی۔ نہ صرف جراجمہ بلکہ بہت سے نبطیوں اور اُنکے متصل کی آبادیوں نے یہ امر اختیار کیا اور جزیہ سے بری رہیں۔ خلیفہ واثق باللہ عباسی کے زمانہ میں وہاں کے عامل نے غلطی سے اُن لوگوں پر جزیہ لگایا تو اُنہوں نے خلیفہ کو اطلاع دی اور دربار خلافت سے اُنکی برأت کا حکم صادر ہوا[2]۔ جزیہ کا معاوضہ حفاظت ہونا اسقدر صاف صاف ظاہر کر دیا گیا تھا کہ معاہدوں میں یہانتک تصریح کر دی جاتی تھی کہ ذمی اگر صرف ایکسال فوجی خدمت میں شریک ہوں گے تو اُس سال کا جزیہ چھوڑ دیا جائیگا۔ چنانچہ خود حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کثرت سے یہ معاملہ پیش آیا۔ عتبہ بن فرقد نے جب آذربایجان فتح کیا تو معاہدہ میں یہ الفاظ لکھے علی ان یودوا الجزیۃ علی قدر طاقتهم۔ ومن حشر منهم فی سنة وضع عنه جزاء تلك السنة۔ یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ جزیہ ادا کریں۔ اور جو شخص کسی سال لڑائی میں بلایا جائیگا تو اس سال کا جزیہ معاف کر دیا جائیگا"۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب آرمینیہ کے بعض حصے فتح ہوئے تو سپہ سالار نے معاہدہ میں یہ الفاظ لکھے ان ینفروا لکل غارة وینفذوا لکل امر ناب اولم ینب رأه الوالی صلاحا علی ان توضع الجزاء عمن اجاب الی ذلك ومن استغنی عنه منهم وقعد فعلیه مثل ما علی اهل اذربیجان من الجزاء یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ یہ لوگ جب لڑائی پیش آئے یا کوئی ضرورت پیش ہو تو مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوں اس صورت میں اُنپر جزیہ نہیں لگایا جائیگا۔ لیکن جس شخص کی ضرورت ہو اور وہ بیٹھ رہے

---

[1] ایک عیسائی قوم تھی از شہر جراجمہ اور اُسکے مضافات میں آباد تھی معجم البلدان میں اس مقام کا ذکر تفصیلاً لکھا ہے۔

[2] فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۵۹ و ۱۶۱ -

تو انکو آذربائیجان والوں کی طرح جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ اسی معاہدہ میں یہ لفظ بھی ہے اور وہ صاف ہمارے دعوے کی تصریح ہے ولحشر عوض من جزائهم۔ یعنی لڑائی میں ذمیوں کا شریک ہونا جزیہ کا قائم مقام ہے[1]۔ خود حضرت عمرؓ نے متعدد دفعہ یہ احکام بھیجے تھے کہ اگر کسی ذمی سے اتفاقیہ کسی موقعہ پر مدد لو تو اس سال کا جزیہ چھوڑ دو۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جرجان وغیرہ ممالک میں جو معاہدہ ہوا، اسمیں یہ الفاظ تھے ومن استعنا به منکم فله جزاؤه فی معونته عوضا عن جزائه یعنی ہم اگر کسی ذمی سے اعانت لینگے تو اس اعانت کے بدلہ میں جزیہ چھوڑ دیا جائیگا۔

معاہدات میں یہ تصریح کہ جزیہ کے عوض میں ہم تمہاری اندرونی و بیرونی حفاظت کے ذمہ دار ہیں جب حفاظت پر قدرت نہ ہو تو جزیہ کو واپس کر دینا۔ جو قومیں فوجی خدمت پر آمادہ ہوں انکو جزیہ سے بری رکھنا۔ کیا ان واقعات کے ثابت ہونے کے بعد بھی شبہ ہو سکتا ہے کہ جزیہ کا مقصد وہی تھا جو ہم نے تیسری بحث کے آغاز میں بتایا ہے۔

جزیہ کے مصارف یہ تھے۔ لشکر کی آراستگی سرحد کی حفاظت۔ قلعوں کی تعمیر، رستے بنانا، سڑکوں اور پلوں کی طیاری۔ سررشتہ تعلیم۔ بے شبہ اس طرح اس خاص قسم سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا۔ اور پہنچنا چاہیے تھا۔ مسلمان لڑائیوں میں شریک ہوتے تھے۔ جانیں لڑاتے تھے۔ ملک کو تمام خطروں سے بچاتے تھے۔ پس جس طرح انکے جسم و جان سے ذمی رعایا مستفید ہوتی تھی، اگر ذمیوں کے مال سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا تو کیا بیجا تھا۔ اسکے علاوہ صدقہ کی رقم جو خاص مسلمانوں سے وصول کیجاتی تھی اسمیں بھی رعایا برابر کی شریک تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المال کے داروغہ کو لکھ بھیجا تھا کہ خدا کے اس قول میں انما الصدقات للفقراء والمساکین صدقات فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں، مسکینوں سے عیسائی اور یہودی مراد ہیں[2]

[1] تاریخ کبیر طبری

[2] کتاب الخراج امام ابویوسفؒ۔

جزیہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس روپیہ سالانہ تھی کسی کے پاس لاکھوں رُپے ہوں تو اس سے زیادہ دینا نہیں پڑتا تھا۔ عام شرح چھ رُپے اور تین رُپے سالانہ تھی۔ بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے۔ اور عورتیں۔ مفلوج۔ معطل العضو۔ نابینا۔ مجنوں۔ مفلس۔ یعنی جس کے پاس دوسو درہم سے کم ہو۔ یہ لوگ عموماً جزیہ سے معاف تھے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جسکی تعداد اسقدر قلیل تھی جس کے ادا کرنے سے فوجی پرخطر خدمت سے نجات ملجاتی تھی جسکی بنیاد نوشیروان عادل نے ڈالی تھی۔ کیا ایسی ناگوار چیز ہوسکتی ہے جیسی کہ اہلِ یورپ نے خیال کی ہے۔ کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اُس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اُسکے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نکرنا چاہیے۔ جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے اُنکو اسلام نے جسقدر حقوق دیئے کون حکومت اُس سے زیادہ دیسکتی ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے مضمون کے عنوان سے یہ بحث کسی قدر دور پڑجاتی ہے اسلیے اس موقع پر ہم یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے

مکینکس اور مسلمان

مکینکس یونانی لفظ ہے۔ انگریزی میں یہی لفظ نشین بنگیا ہے جسکو ہماری زبان میں کل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ فن آج کل اگرچہ بے انتہا ترقی کر گیا ہے لیکن اسکا وجود بہت قدیم زمانے سے گو یونان میں وہ علمی حیثیت سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اور مسلمانوں نے جب یونان کے علوم و فنون سیکھے تو صرف علم پر قناعت نہیں کی بلکہ اس فن سے عملی کام بھی لیے۔ عربی زبان میں اسکا نام علم الحرکات اور علم الحیل ہے لیکن یونان کا اصل لفظ بھی صورت بدلکر مستعمل ہے۔ لفظ منجنیق جو عربی و فارسی میں کثرت سے مستعمل ہے اور جسکے اشتقاق کے بیان میں ہمارے علمائے لغت نے سخت غلطیاں کی ہیں درصل اسی یونانی لفظ مکانک کا معرب ہے۔ البتہ اسقدر فرق ہے کہ منجنیق کا اطلاق اب عام حیثیت سے نہیں ہوتا بلکہ ایک خاص آلہ کا نام رکھدیا گیا ہے۔

مسلمانوں میں اس فن کی ابتدا اسوقت سے ہوئی جب دولت عباسیہ میں یونانی تصنیفات ترجمہ ہونی شروع ہوئیں۔ چنانچہ اور علوم و فنون کے ساتھ اس فن کی بھی تمام کتابوں کا ترجمہ ہوگیا انمیں سے ہمکو جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے انکی تفصیل ذیل میں ہے۔

کتاب عمل الآلۃ التی تطرح البنادق تصنیف ارشمیدس۔

کتاب الدوائر والدوالیب تصنیف ہرقل نجار۔

کتاب فی الاشیاء المتحرکۃ من ذاتہا تصنیف ایرن۔

کتاب الآلۃ الزمر البوقی۔ کتاب الآلۃ الزمر الیغی۔

کتاب الدوالیب تصنیف مارطس۔

کتاب الارغنون[1]۔

کتاب ایرن فی الجر الثقیل۔

ان کتابوں میں سے اول اور آخر کتاب آج بھی لندن کے کتب خانہ برٹش میوزیم میں موجود ہے پہلی کتاب میں تصویریں بھی بنی ہوئی ہیں[2]۔ یونانی تصنیفات سے مطلع ہو کر مسلمانوں نے خود اس فن میں نئی نئی باتیں اختراع کیں اور مستقل و جدید کتابیں لکھیں۔ بنو موسی نے جو مامون کے دربار کے مشہور فلاسفر تھے اس فن میں جو کتاب لکھی اور جسکا نام غلطی سے کتاب الحیل مشہور ہو گیا۔ نہایت محققانہ اور ایجادانہ کتاب ہے۔ مؤرخ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس کتاب میں ہر طرح کے مکانکل عمل کا بیان ہے[3]۔ مؤرخ ابن خلکان نے جو ساتویں صدی ہجری میں موجود تھا۔ لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو پڑھا ہے اسمیں عجیب عجیب نادر باتیں ہیں اور اس فن کی تمام کتابوں سے افضل ہے"

پروفیسر سیدیو SEDIIAT جو فرانس کا مشہور مصنف ہے اپنی کتاب Histoire Generate des Arabes.
(صفحہ ۲۴۹ جلد دوم) میں لکھتا ہے کہ "ہمکو اس بات کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے عہد میں میکینکس کا فن کمال کی کس حد تک پہنچ گیا تھا"

پروفیسر لیبان فرانسیسی Le Bon اپنی کتاب La Civilisation des Arabes میں لکھتا ہے کہ "عربوں کو میکینکس کی اور خصوصاً علی المکینکس کی بہت واقفیت حاصل تھی۔ وہ آلات جو اُن کے بنائے ہوئے آج بھی ہمکو مل سکتے ہیں اور وہ واقعات جو اُنکے متعلق قدیم مورخوں نے

---

[1] دیکھو کتاب الفہرست مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۸۵-۱۲ [2] دیکھو فہرست کتب عربی موجودہ کتب خانہ برٹش میوزیم زبان لاطینی صفحہ ۶۱۱-۱۲

[3] کتاب الفہرست صفحہ ۲۸۵-۱۲

لکھتے ہیں اُنسے عربوں کی لیاقت کا ایک بلند خیال پیدا ہوتا ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ عرب کے پاس پنڈلم (لنگر) والی گھڑیاں تھیں جو آج کی گھڑیوں سے بالکل مختلف تھیں۔ یہ بات اُن بیانات سے جو چند مصنفوں نے لکھے ہیں ثابت ہوتی ہے خصوصاً طالیہ Tndetu ابن جبیر کے بیان سے جو بارہویں صدی عیسوی میں فلسطین گیا تھا اور جس نے دمشق کی مسجد کی گھڑی کا حال لکھا ہے۔[1]

سب سے پہلی ایجاد اس فن کے متعلق جو بیان کی جاتی ہے وہ وہ گھڑی ہے جو ہارون الرشید نے شارلمین شہنشاہ فرانس کو بھیجی تھی۔ یورپ کے اکثر مورخوں نے اُسکا ذکر کیا ہے۔ اور پروفیسر سیدیو نے مکانکیس کی ترقی کے ثبوت میں اسی گھڑی کا نام لیا ہے ان مورخوں کا بیان ہے کہ اس گھڑی میں چھوٹے چھوٹے بارہ دروازے تھے ہر گھنٹہ کے گذرنے پر گھنٹوں کی تعداد کے موافق دروازے کھلتے تھے اور اُسی تعداد کے موافق تانبے کی گولیاں ایک آہنی توے پر گر کر آواز دیتی تھیں۔ یہ دروازے برابر کھلے رہتے تھے یہاں تک کہ جب دورہ پورا ہوجاتا تھا تو بارہ سوار دروازوں سے نکلکر گھڑی کی بالائی سطح پر چکر لگاتے تھے۔

مسٹر پامر نے اس گھڑی کے وجود سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ عرب کے مورخ اس واقعہ کا ذکر نہیں کرتے۔ لیکن مسٹر پامر کو معلوم نہیں کہ مورخین عرب نے سیکڑوں ہزاروں واقعات قلم انداز کردیئے ہیں جنکا ثبوت اور دوسرے طریقہ سے قطعاً معلوم ہے۔ مورخین عرب نے تو سرے سے شارلمین کی سفارت ہی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ کیا مسٹر پامر کو اس سے بھی انکار ہوگا۔ یورپ کے مورخوں نے جو اس واقعہ کا ذکر کیا ہے نہایت قوی حوالوں کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً پروفیسر سیدیو نے مارکیپنی IMATIQAN اور ایجی ناٹ EQINAATT کی تصنیفات کی شہادت پیش کی ہے۔ اور آخر الذکر شخص خود شہنشاہ شارلمین کے زمانہ میں موجود تھا۔

---

[1] دمشق کی مسجد کی گھڑی کا حال آگے کسی قدر تفصیل کے ساتھ آتا ہے۔ ۱۲

البتہ یہ تعجب ہے کہ ہرون الرشید نے شارلمین کو جو تحفے بھیجے تھے وہ ابتک فرانس کے
معبد پانیستون میں موجود ہیں لیکن گھڑی کا پتہ نہیں۔ احمد زکی مصری جس نے ۱۸۹۲ء میں یورپ
کا سفر کیا وہ اس عمارت کے ذکر میں لکھتا ہے کہ "یہاں ایک مشرقی سیاح کے لیے جو چیز زیادہ دلچسپی
کا سبب ہو سکتی ہے وہ 'وہ کمرہ ہے جسکی دیواروں پر شارلمین کی تصویر اس ہئیت سے بنائی ہے
کہ وہ ہرون الرشید کی سفارت کا استقبال کر رہا ہے اور سفارت کے ہات میں بیت المقدس کی
کنجیاں ہیں جو ہرون الرشید نے شارلمین کو تحفہ میں بھیجی ہیں۔ یہاں دو ریشمی پردے بھی ہیں جنکی
قیمت ۴۰ ہزار روپئے ہیں"۔

بہرحال اس گھڑی کا وجود ثابت ہو یا نہو لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ مسلمانوں
کے عہد میں اور بہت سی گھڑیاں اور مکانیکل آلات طیار ہوئے جنمیں سے بعض کا ذکر ہم اس موقع پر
لکھتے ہیں۔

علامہ ابن جبیر جس نے ۵۸۰ھ میں شام و حجاز کا سفر کیا تھا۔ اپنے سفرنامہ میں دمشق کی جامع مسجد
کے ذکر میں ایک گھڑی کا حال ان الفاظ میں لکھتا ہے کہ "باب جیرون کی دیوار میں طاق کی شکل کا
ایک دریچہ ہے اور اسمیں بارہ چھوٹے پیتل کے طاپچے ہیں۔ ان طاقچوں میں بارہ بارہ چھوٹے
چھوٹے دروازے ہیں۔ پہلے اور اخیر طاپچے کے نیچے دو باز بنے ہوئے ہیں جو پیتل کی تہالیوں پر
کھڑے ہیں۔ جب ایک گھنٹہ گذرتا ہے تو دونوں باز اپنی گردنیں بڑہاتے ہیں اور اپنی چونچ سے اُن
تہالیوں میں اس انداز سے پیتل کی گولیاں گراتے ہیں کہ جادو معلوم ہوتا ہے۔ گولیوں کے گرنے سے
گونج پیدا ہوتی ہے اور طاقچہ کا دروازہ جو اس گھنٹہ کے لیے بنا ہے خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ اسیطرح
جب ایک دورہ پورا ہو جاتا ہے تو تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں"۔

دنیا میں اول اول جب گھڑی کی ایجاد ہوئی تو اُس سے صرف گھنٹہ کا حال معلوم ہو سکتا تھا لیکن جتنے گھنٹے گذر چکتے تھے اُنکی تعداد معلوم نہیں ہو سکتی تھی مسلمانوں میں بھی اول اسی قسم کی گھڑیاں مرواج ہوئیں دمشق کی اس گھڑی میں دونوں باتیں دو مختلف ذریعوں سے معلوم ہوتی تھیں یعنی گھنٹے کے گذرنے کی اطلاع گولیوں سے ہوتی تھی جو مصنوعی بازوں کے منہ سے گرتی تھیں۔ اور گھنٹوں کی تعداد دروازوں سے معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ جتنے گھنٹے گذرتے تھے اُسی تعداد کے موافق دروازے خودبخود بند ہو جاتے تھے۔

اس گھڑی میں رات کے لیے اور تدبیر تھی اور وہ یہ کہ جو دائرہ ان طاقچوں کے گرد تھا اُسمیں تانبے کے بارہ حلقے بنے ہوئے تھے۔ ہر حلقہ میں دیوار کی طرف شیشہ لگا ہوا تھا شیشوں کے پیچھے شمع تھی جو پانی کے ذریعہ سے حرکت کرتی تھی۔ شمع گھنٹوں کی ترتیب کے موافق اُن حلقوں کے سامنے آتی جاتی تھی اور جب حلقہ کے سامنے آتی تھی وہ سرخ دکھائی دینے لگتا تھا یہاں تک کہ صبح ہوتے ہوتے تمام حلقے سرخ ہو جاتے تھے[1]

خلیفہ المستنصر باللہ عباسی المتوفی سنہ ۶۴۰ھ نے۔ بغداد میں جو مشہور مدرسہ قائم کیا تھا اور جسکا نام مستنصریہ تھا اُسکے لیے ایک نہایت عجیب غریب گھڑی طیار کرائی تھی۔ اُس گھڑی کی صورت یہ تھی کہ لاجورد کا ایک حلقہ آسمان کی شکل کا بنایا تھا اور اُسمیں ایک آفتاب تھا جو برابر حرکت کرتا رہتا تھا۔ علامہ ابن جوزی نے اس گھڑی کی تعریف میں یہ چند اشعار لکھے ہیں۔

تهدی الی الطاعات ساعاته الناس بالخیر هم یهتدون صورة فیه فلک دائر

والشمس تجری مالها من سکون دائرة من لازورد حلت نقطة تبر فیه سر مصون

---

[1] سفرنامہ ابن جبیر مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۷۰ و ۲۷۱۔

[2] یہ تمام تفصیل آثار البلاد قزوینی میں ہے دیکھو کتاب مذکور مطبوعہ ۱۸۴۸ء مقام جرمن صفحہ ۲۰۰۔

گھڑیوں کے سوا اس قسم کے اور آلات کا بھی پتہ لگتا ہے۔ سلطان عبدالمومن۔ جو مراکش کا مشہور بادشاہ گذرا ہے اسکو حضرت عثمانؓ کے اُن قرآنوں میں سے ایک قرآن مجید ہات آگیا تھا جو انہوں نے اپنے اہتمام سے لکھوا کر مصر و شام و بصرہ و کوفہ میں بھجوائے تھے۔ عبدالمومن نے اس قرآن کی نہایت قدر کی اور اُسکے لیے ایک کَل کا صندوق طیار کرایا جسکی کیفیت علامہ مقری نے اس طرح لکھی ہے "یہ صندوق عجیب حکمت سے بنایا گیا تھا جب اسمیں کنجی ڈالکر پھراتے تھے تو اُسکے پٹ کھلجاتے تھے اور اندر سے ایک خانہ نکلتا تھا جسمیں ایک رحل ایک کرسی پر رکھی ہوئی ہوتی تھی۔ رحل بغیر کسی کے ہات لگائے خود کھلتی تھی۔ جب رحل اور چوکی بالکل باہر آجاتی تھی تو خانہ از خود بند ہوجاتا تھا۔ کنجی کو جب اُلٹی طرف پھیرتے تھے تو خانہ پھر کھلجاتا تھا۔ اور چوکی و رحل خود صندوق میں جاکر بند ہوجاتی تھیں[1]۔

البتہ افسوس ہے کہ اس فن سے کوئی بڑا کام نہیں لیا گیا نہ عام پبلک کاموں میں اس سے کچھ مدد لی گئی۔ علم جرِّ ثقیل پر مسلمانوں کی مستقل تصنیفات موجود ہیں لیکن ہمکو معلوم نہیں کہ مسلمانوں نے دنیا کے ہر حصہ میں جو بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں انمیں کبھی جرِّ ثقیل سے کام لیا گیا۔ خلیفہ المتوکل باللہ عباسی کے عہد میں کچھ خفیف سا پتہ چلتا ہے۔ لیکن وہ اسقدر غیر معین اور مشتبہ ہے کہ ہم اس موقع پر اُسکا ذکر نہیں کر سکتے۔

---

[1] نفح الطیب مطبوعہ یورپ جلد اول صفحہ ۴۰۵ - ۱۲

جو

مصنف نے ندوۃ العلما کے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۲- اپریل سنہ ۱۸۹۵ء میں پڑھا

الحمد للہ والصلوٰۃ علی رسولہ وآلہ واصحابہ

جناب صدر انجمن و دیگر بزرگان قوم

آج اسوقت مجھکو جس مضمون پر تقریر کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ زمانہ موجودہ کے لحاظ سے ہمارے علما کے فرائض کیا ہیں یعنی زمانہ موجودہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے علما پر کیا ذمہ داریاں ہیں ملک اور جماعت اسلامی کا اُنپر کیا حق ہے؟ قوم کے پیشے انکو کیا کرنا ہی؟- اور اسوقت تک اُنھوں نے قوم کے لیے کیا کیا ہے؟-

یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور کچھ شبہ نہیں کہ جماعت اسلام کی بہبودی کا بہت کچھ بلکہ تمام دارومدار انھی سوالات پر ہے-

اے حضرات! جس زمانہ میں یہاں اسلامی حکومت قائم تھی۔ اُسوقت قوم کے دینی اور دنیوی دونوں قسم کے معاملات۔ علما کے ہاتھ میں تھے۔ نماز روزہ وغیرہ کے احکام بتلانے کے علاوہ۔ علما ہی اُنکے مقدمات فیصل کرتے تھے۔ علما ہی جرایم پر حد و تعزیر کی سزا دیتے تھے۔ علما ہی قتل و قصاص کے احکام صادر کرتے تھے۔ غرض قوم کی دین و دنیا دونوں کی عنانِ اختیار علما کے ہاتھ میں تھی۔ اب جبکہ انقلاب حکومت ہوگیا اور دنیوی معاملات گورنمنٹ کے قبضۂ اختیار میں آگئے تو ہمکو دیکھنا چاہیے کہ قوم سے علما کا کیا تعلق باقی ہے۔ یعنی گورنمنٹ نے کسقدر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے ہیں اور کسقدر باقی رہ گئے ہیں جو درحقیقت علما کا حق ہے اور جسمیں اندازی

کرنی خود گورنمنٹ کو مقصود ہے۔

علما کی موجودہ حالت۔ ان کی عزلت نشینی بلکہ بے پروائی نے عام طور پر یہ یقین دلا دیا ہے کہ انکو جو تعلق قوم سے باقی رہ گیا ہے وہ صرف مذہبی تعلق ہے۔ یعنی یہ کہ صرف نماز و روزہ وغیرہ کے مسائل بتا دیا کریں۔ باقی معاملات اُنکے دسترس سے باہر ہیں اور اُنکو ان معاملات میں دست اندازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

لیکن میرے نزدیک یہ خیال غلط اور محض غلط ہے۔ گورنمنٹ نے جو حقوق اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں بیشبہ علما کو اُنسے کچھ تعلق نہیں ہے لیکن وہ حقوق ہیں کیا؟ مالگذاری کا وصول کرنا، امن و امان کا قائم رکھنا، دنیوی معاملات کے فیصلہ کے لیے عدالتوں کا قائم کرنا، عہدہ داران ملکی کا مقرر کرنا، یہ اور خاص اسی قسم کے اُمور ہیں جو گورنمنٹ نے اپنے اختیار میں لیے ہیں لیکن قوم کی زندگی کے اجزا صرف اسیقدر نہیں ہیں۔

قوم کی اخلاقی زندگی جو تمام ترقیوں کی جڑ ہے۔ قوم کی علمی حالت جسپر ترقی اور تنزل کا مدار ہے۔ قومی رسم و دستورات جنسے قوم بنتی یا بگڑتی ہے اور سب سے زیادہ قوم کی دماغی زندگی یعنی خیالات کی وسعت، بلند حوصلگی، روشن ضمیری، آزاد خیالی، ان تمام اوصاف کے سرچشمہ ہمارے علما اور علما کی تلقین و ہدایت ہے۔ شادی و بیاہ وغیرہ کی وہ مسرفانہ رسمیں جنہوں نے سیکڑوں ہزاروں خاندان تباہ کر دیے ہیں۔ گورنمنٹ کا اُنپر کچھ زور نہیں چلسکتا۔ لیکن الحمد للہ اس گئی گذری حالت میں بھی علما کو قوم پر وہ اختیار حاصل ہے کہ آج اگر یہ بزرگ متفق ہو کر کمر بستہ ہو جائیں تو تمام ہندوستان میں اس سرے سے اُس سرے تک یہ خانہ برانداز رسمیں یک لخت معدوم ہو جائیں قوم کے اخلاق جو روز بروز تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ اور گورنمنٹ کی تعلیم مطلق اُس کی اصلاح نہیں کر سکی۔ اور نہ کر سکتی لیکن اگر علما آمادہ ہوں اور مناسب تدبیروں سے کام لیں تو قوم میں

پھروہ اخلاقی خوبیاں پیدا ہوسکتی ہیں جو سو دو سو برس پہلے موجود تھیں۔

الحاد اور دہریت کی طرف میلان جو روز بروز عام ہوتا جاتا ہے اسکا روکنا اگر گورنمنٹ کو ممکن ہوتا تو وہ زیادہ نہیں تو مذہب عیسوی کو تو اس سے محفوظ رکھ سکتی۔ لیکن ہمارے علما اگر معقول طریقہ پر اسکو روکنا چاہیں تو اسی طرح اسکا قلع وقمع کر سکتے ہیں جس طرح یونانی فلسفہ کے پھیلنے کے وقت۔ امام غزالی۔ امام رازی۔ قاضی عضد۔ ابن رشد۔ نے زندقہ والحاد کا استیصال کردیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوا ہوگا کہ قوم کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اب بھی علما ہی کا حق ملکیت ہے اور وہ ہی اس حصہ کے فرمانروائے کامل الاختیار ہیں۔ یا ہوسکتے ہیں۔

غرض اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ علما کو قوم پر اب بھی نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوسکتے ہیں۔ ان اختیارات کے حاصل ہونے کی شاید علما کو ضرورت نہو۔ لیکن قوم کو اسکی ضرورت اور سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ علما جب تک قوم کے خیالات، قوم کے اخلاق، قوم کے دل و دماغ قوم کی معاشرت، قوم کی تمدن۔ غرض قومی زندگی کے تمام بڑے بڑے حصوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں نہ لینگے۔ قوم کی ہرگز ترقی نہیں ہوسکتی۔

لیکن ان اختیارات کے ہات میں لینے کے وقت علما پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہونگی اور انہی ذمہ داریوں کو میں علمائے حال کے فرایض سے تعبیر کرتا ہوں جو میرے مضمون کا عنوان ہے چنانچہ ان فرایض کو میں بہ تفصیل ذیل بیان کرتا ہوں۔

علما کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ایک مجموعی قوت پیدا کریں۔ یعنی تمام ہندوستان کے علما میں ایک خاص رشتہ اتحاد قائم ہو۔ تمام علما ایک دوسرے کے نام سے، مقام سے، حالات سے واقف ہوں آپس میں خط وکتابت ہو، مہتم بالشان امور میں تمام علما مشاورت اور استصواب سے کام لیں۔ کبھی کبھی وہ صرف اجتماع واتحاد کی غرض سے ایک جگہ جمع ہوجایا کریں اور

اس مقصد کے لیے ندوۃ العلما سے زیادہ عمدہ موقع نہیں ملسکتا۔

اے حضرات! علما کے باہمی اتفاق کی نسبت بار بار کہا جاچکا ہے اور اگر مجکو بھی یہی کہنا ہوتا تو کچھ ضرورت نہ تھی کہ جو مضمون سیکڑوں دفعہ پامال ہوچکا ہے میں بھی اسی کا اعادہ کروں لیکن مجکو ایک خاص پہلو کی طرف خیال دلانا ہے۔

اتفاق و اتحاد کا جو طریقہ اب تک لوگوں نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے۔ کہ تمام علما مسائل فقہیہ میں ہم مذہب اور ہم خیال ہوجائیں۔ اور اسوقت نہایت اعلی درجہ کا اتفاق واتحاد قائم ہوجائیگا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا ایسا اتفاق کسی زمانہ میں کبھی ہوا ہے؟ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے مبارک زمانہ میں جبکہ تمام مسلمان کنفس واحدۃ تھے کیا مسائل میں اختلاف آراء نہ تھا؟ جس شخص نے صحیح ترمذی مطالعہ کی ہے اور قریباً ہر مسئلہ کے متعلق اُسکے تراجم ابواب دیکھے ہیں کیونکر اس بدیہی واقعہ سے انکار کرسکتا ہے؟

وضو۔ تیمم۔ قرأت۔ اور نماز کے دیگر واجبات وسنن کے متعلق کیا تمام صحابہ ہر مسئلہ میں قاطبۃً متفق الرائے تھے؟ کون ایسا غلط دعوی کرسکتا ہے لیکن کیا ان اختلاف مسائل کی وجہ سے انمیں کسی قسم کی کدورت تھی؟ کسی طرح کا رنج تھا؟ کسی طرح کی اجنبیت تھی؟ حاشا اللہ کبھی نہیں، ہرگز نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اتحاد واتفاق کے لیے یہ ضرور نہیں کہ آپس میں کسی طرح کا اختلاف رائے نہو۔ اسلیے ہمکو اتحاد و اتفاق کی حدود متعین کرلینی چاہئیں یعنی اختلاف واتفاق کے دائرے الگ الگ ہوں۔ ایک عالم کو کسی مسئلہ میں دوسرے سے اختلاف ہے تو اختلاف کا اثر اسی مسئلہ تک محدود رہے۔ یہ نہو کہ اس اختلاف کی وجہ سے اور تمام تعلقات بھی منقطع ہوجائیں جو اختلاف سے کچھ تعلق نہیں رکھتے۔ اسکی نہایت عمدہ مثال امام بخاری اور امام مسلم کا واقعہ ہے۔ امام مسلم

حدیث معنعن کے شرائط اتصال میں۔ امام بخاری سے اختلاف رکھتے تھے چنانچہ اپنی کتاب کے میں امام بخاری کا مذہب بیان کرکے کہاہے کہ یہ مذہب محض لغو اور باطل ہے اور اس قابل نہیں کہ اسکے رد کی طرف توجہ کی جائے" لیکن باوجود اسکے جب امام بخاری سے ملنے گئے تو نہایت محبت اور تعظیم سے اُنکی پیشانی چومی اور کہا کہ دعنی اقبل رجلاك یعنی اجازت دیجئے کہ آپکے پاؤں چوموں۔

قرون اولی میں اسی اُصول پر عمل تھا یعنی اختلاف واتفاق کی جدا جدا حدیں تھیں اور یہی وجہ ہے کہ اُس زمانہ میں باوجود اختلافات کے اتحاد واتفاق کا زور پوری طرح قائم تھا۔ صحابہ بیسیوں مسائل میں مختلف الرائے تھے لیکن عام اتحاد واتفاق میں اختلاف کا پرتو تک نہ تھا۔ قرن ثانی اور اوائل قرن ثالث کا بھی یہی حال تھا۔

آج جس چیز کی وجہ سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی ہے جسنے ہماری طاقت کو بالکل گھٹا دیا ہے جسکی وجہ سے گورنمنٹ کی نگاہ میں اس گروہ کی عظمت نہیں رہی جسکی وجہ سے مخالفین کو ہمیشہ شماتت کا موقع ملاہے وہ یہ ہے کہ ہم اختلاف واتفاق کو اصلی حدود پر نہیں رہنے دیتے۔

بارہا سناہے کہ کوئی مجمع۔ عام جماعت اسلام کے فائدہ کی غرض سے منعقد ہوا مثلاً دستار بندی کا جلسہ کسی مدرسہ عربی کا جلسہ۔ اصلاح تعلیم کا جلسہ وغیرہ وغیرہ۔ تو وہ لوگ جلسہ میں شریک تک نہوئے جنکو بانیان جلسہ سے مسائل مختلف فیہا کے بارہ میں اختلاف تھا۔

اے حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ یہی ندوۃ العلما جسمیں آپ اسوقت تشریف فرما ہیں اگر اتفاق واتحاد کے ٹھیک اُصول پر قائم ہوجائے تو وہ کتنی بڑی عظیم الشان طاقت بن سکتی ہے۔ اُسوقت ندوہ دعوی کرسکتی ہے کہ اوقاف کے لاکھوں روپئے جو متولیوں کے ہاتھ سے نہایت بیدردی سے برباد ہو رہے ہیں ندوہ کے ہاتھ میں دیئے جائیں اور گورنمنٹ نہایت

خوشی سے اس دعوی کو قبول کریگی۔

ندوہ دعوی کرسکتی ہے کہ انگریزی مدارس میں عربی و فارسی کا نصاب تعلیم جو اسوقت ابتری کی حالت میں ہے اُسکی اصلاح کردی جائے اور گورنمنٹ کو اس دعوے پر بہت کچھ لحاظ ہوگا۔

ندوہ دعوی کرسکتی ہے کہ جس طرح قدیم زمانہ میں **عدالت صدر** میں فقہی مسائل کیلیے قاضی و مفتی مقرر کیے جاتے تھے وہ قاعدہ نئے سرسے قائم کیا جائے۔

ندوہ کو اسوقت یہ قوت حاصل ہوگی کہ جماعت اسلام اسکی ہدایتوں کی پابند ہو۔ اسکے فتوؤں کے آگے سر جھکائے۔ اسکے فیصلوں سے سرتابی نکرسکے۔ اس صورت میں ندوہ قوم کو تمام بیہودہ مراسم سے خلاف شرع باتوں سے ناجائز امور سے بزور روک سکتی اور جماعت اسلام کو نماز کا روزہ کا حج کا زکوۃ کا بزور پابند کرسکتی ہو۔ یہ زور تلوار کا نہیں ہوگا۔ بلکہ اتباع شریعت کا اور اتفاق باہمی کا۔

لیکن یہ قوت اس طرح نہیں حاصل ہوسکتی ہے کہ سال میں ایک دفعہ ندوہ نے اجلاس کیا اشتہارات کا ڈھنڈورا پیٹکر باہر والوں کو جو حقیقت سے ناواقف تھے بُلالیا۔ عُلما۔ عاجزی سے تقاضے سے خوشامد سے سفارش سے مجلس میں شریک ہوگئے۔ ندوہ اگر یوں ہوئی تو سمجھیے کہ اور انجمنوں کی طرح وہ بھی شہر کا ایک مشاعرہ ہے۔

ندوہ کو یہ قوت اُسوقت حاصل ہوگی جب تمام علما اسکو اپنا ذاتی کام سمجھیں بغیر کسی درخواست کے تقاضے کے منت کیے دور دور سے سفر کرکے آئیں اور سال بھر اُسکی اُدھیڑبن میں رہیں کسقدر افسوس کی بات ہے کہ اہل حدیث اور احناف میں لڑائی ہوکر مقدمہ عدالت تک جائے تو بن بلائے دونوں فریق کے علما سیکڑوں کوس سے دوڑے ہوئے آئیں اور ندوہ میں بُلایا جائے تو منتوں کو وہ خوشامدیں کرنی پڑیں جو کسی تقریب میں میزبان کو مہمانوں کے بلانے میں کرنی پڑتی ہیں۔

جس قوم کو اختلاف کی باتوں میں وہ شیفتگی ہو اور اتفاق میں یہ بے پروائی اور بیدلی۔ اُسکا خدا ہی حافظ ہے۔

حضرات! ندوہ کے قالب میں جو روح ہے آپ اُسکا اندازہ بھی نہیں کر سکتے، یہ مجلس صرف ایک برس سے قائم ہے۔ ابھی تک اِسنے کوئی عملی کارروائی نہیں کی ہے۔ انتظام کا کوئی جلوہ علانیہ نمایاں نہیں ہوا۔ تاہم اِسنے وہ اثر اور زور پیدا کر لیا ہے جو اور مجلسوں کو باوجود مدت ہائے دراز اور دنیوی وجاہتوں کے اب تک حاصل نہیں ہوا۔

اسکی ایک پکار پر کہاں کہاں سے لبیک کی صدائیں آئیں۔ کسقدر دور و دراز مسافتوں کو طے کر کے لوگ یہاں تک پہنچے۔ لوگوں کی نگاہیں کس ادب کس جوش کس محبت سے اسپر پڑ رہی ہیں۔ اب یہ امر علما کے ہاتھ میں ہے کہ ندوہ کو اس بلند درجہ پر پہنچائیں جو اسکے رتبہ کو شایاں ہے۔ یا خدا نخواستہ۔ نا اتفاقی سے غفلت سے رشک سے غلط فہمی سے۔ اسکو اس طرح برباد کر دیں جس طرح قوم کی اور تمام کوششیں نا اتفاقی سے برباد ہوتی رہی ہیں۔

دوسرا فرض

دوسرا بہت بڑا فرض جو علما پر ہے وہ اس دہریت اور الحاد کے اثر کا روکنا ہے جو آجکل یورپ میں پھیلکر ہندوستان کی طرف بڑھتا آتا ہے۔ غالباً اس مرض کے پھیلنے سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ گفتگو جو کچھ ہے وہ علاج کے طرز و طریقہ میں ہے۔ لیکن میرے نزدیک ہمکو اس باب میں زیادہ خوض و فکر کی حاجت نہیں ہے۔ یہ بیماری پہلے بھی ایک دفعہ اسلامی ممالک میں پھیل چکی ہے اور اطبائے شریعت یعنی علمائے سلف کا علاج اسکے دفع کرنے میں کارگر ثابت ہوا۔ عباسیوں کا زمانہ تھا کہ **فلسفہ یونانی** کا ترجمہ ہوا اور ساتھ ہی چاروں طرف الحاد کی ہوا چل گئی۔ اکثر فقہا اور بعض محدثین نے اسکا یہ علاج تجویز کیا کہ سرے سے فلسفہ پڑھا یا نجائے۔ یہاں تک کہ علم کلام کو بھی اس لحاظ سے ممنوع قرار دیا کہ اسمیں عقلیات کی آمیزش تھی۔ امام

شافعیؒ کا قول ہے کہ حکمی فی اہل الکلام ان یضربوا بالجرید ویطاف بہم فی القبایل یعنی اہل کلام کے بارہ میں میرا یہ فیصلہ ہے کہ انکو دُرّے لگائے جائیں اور قبائل میں انکی تشہیر کیجائے" اس علاج نے بلحاظ حالت موجودہ کسی قدر فائدہ دیا۔ یعنی بعض نیک دل فلسفہ پڑہنے سے رُک گئے۔ لیکن پورا نفع نہوا۔ کیونکہ سیکڑوں ہزاروں مسلمان منطق و فلسفہ پر ایسے فریفتہ ہوگئے تہے کہ اسکو بالکل چھوڑ نہیں سکتے تہے۔ آخر علما نے دوسرا علاج سوچا۔ یعنے فلسفہ کے مسائل پر اطلاع حاصل کر کے فلسفہ کے رد کے لیے علم کلام ایجاد کیا۔ اس علاج کے مجوز امام غزالی۔ امام رازی۔ ابن رشد۔ قاضی عضد۔ وغیرہ تہے اور واقعی انکی یہ تدبیر نہایت کارگر نکلی۔ اسی کا اثر ہے کہ اگرچہ درس نظامیہ میں تمام علوم و فنون سے زیادہ منطق و فلسفہ کی کتابیں زیر درس ہیں۔ تاہم مذہبی عقائد کو اس سے کچھ ضرر نہیں پہنچتا۔

ہمارے زمانہ میں بہی اسی مرض نے ظہور کیا ہے اور پہلی قسم کا علاج بہی ہو چکا ہے۔ اب اگر وہ علاج مفید ثابت ہو تو فبہا ورنہ دوسری قسم کا علاج شروع کیا جائے۔ اور امام غزالی اور امام رازی کی روحیں تازہ کیجائیں۔

ترکی حکومت میں اس ضرورت کو تسلیم کر کے علامہ حسین جسر نے جو تمام روم و شام میں علوم دینیہ و عقلیہ کا اُستاد تسلیم کیا جاتا ہے ایک کتاب تصنیف کی جسکا نام حمیدیہ ہے۔ تمام مسلمانوں نے اس تصنیف کی نہایت قدر کی اور خود سلطان المعظم خلد اللہ دولتہ نے علامہ مذکور کو اس کتاب کے صلہ میں بہت کچھ صلے اور عطیہ عنایت کیے۔ یہ کتاب ترکی زبان میں بہی ترجمہ کی گئی اور عام طور پر اسکا رواج ہو گیا ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے اور اگرچہ میرے نزدیک وہ موجودہ ضرورت کے لیے ناکافی ہے۔ تاہم اس بات سے مسرت ہوتی ہے کہ اس نے ایک عمدہ کام کی بنیاد ڈالی۔ یہ دوسروں کا فرض ہے کہ اس بنیاد پر مضبوط اور مستحکم عمارتیں بنائیں۔

تیسرا فرض

تیسرا امر جسکی طرف میں علما کی توجہ مائل کرنا چاہتا ہوں علوم اسلامیہ کے درس و تدریس میں وسعت پیدا کرنا ہے

اے حضرات۔ اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ پچاس ساٹھ برس سے ہماری علمی حالت برابر تنزل کی طرف بڑھ رہی ہے جس درجہ کے علما پچاس برس پہلے موجود تھے اُس زمانہ کے بعد اُس درجہ کے علما نہیں پیدا ہوے اور زمانہ مابعد میں جس رتبہ کے علما پیدا ہوے اُس زمانہ کے بعد اُس درجہ کے بھی پیدا نہیں ہوئے حضرت شاہ عبد العزیز صاحب شاہ عبد القادر صاحب مفتی محمد صدر الدین صاحب مولوی فضل حق صاحب جیسے علما پیدا ہونے۔ اب گویا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ اب تو یہ بھی توقع نہیں کہ مولوی عبد الحی صاحب مرحوم۔ مولوی ارشاد حسین صاحب مرحوم۔ مولانا احمد علی صاحب مرحوم جیسے بزرگ بھی قوم میں پیدا ہوں۔ تصنیفات کا یہ حال ہے کہ عربی زبان میں اب بہت کم کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ اُردو زبان میں جو کتابیں لکھی جاتی ہیں وہ بھی کچھ محققانہ نہیں ہوتیں۔ بلکہ صرف چند نزاعی مسئلوں کے متعلق اِدھر اُدھر کی خوشہ چینی ہوتی ہے۔ پھر کیا اس کی یہ وجہ ہے کہ اب علوم عربیہ کی قدر دانی نہیں رہی۔ اور ان علوم کے پڑھنے والوں کو مناصب و عہدے نہیں ملتے۔ لیکن ذرا غور سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اِس بات کی وجہ نہیں ہو سکتی۔

خدا کا شکر ہے اور ہم اسپر فخر کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے علم کو کبھی تحصیل دولت کے لیے نہیں پڑھا۔ نہ علما کسی زمانہ میں بہت دولتمند یا صاحب جاہ و منصب تھے۔ ملا نظام الدین۔ ملا حسن۔ ملا کمال۔ شاہ ولی اللہ صاحب شاہ عبد العزیز صاحب کو کونسی دولت و ثروت حاصل تھی؟

پھر کیا اسکی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ علوم کی تحصیل کے سامان کم ہیں؟ یہ بھی صحیح نہیں اب جس کثرت سے ہندوستان کے ہر گوشہ میں عربی مدارس موجود ہیں پہلے کبھی نہ تھے جسقدر کتابیں اب چھپکر شایع ہو گئیں۔ اگلے زمانہ میں کہاں دستیاب ہوتی تھیں۔ سفر کے وسائل اور ذرایع جیسے

اب آسان ہوگئے ہیں پہلے کب تھے۔

پھر کیا اسکی یہ وجہ ہے کہ یہ پیسر زمانہ ہے۔ اور اس بڑے زمانہ کا اقتضا ہی یہ ہے کہ اگلی سی ہمتیں اور اگلی سی حوصلہ مندیاں زمانہ سے مفقود ہوجائیں؟ لیکن اگر ایسا ہے تو زمانہ تمام دنیا کو محیط ہے اسلیے دنیا کے ہر گوشہ میں ایسی ہی پستی اور ایسا ہی تنزل پایا جانا چاہیے۔ حالانکہ دنیا کے ہر حصوں میں علوم و فنون کی بہار آرہی ہے۔ میں اس وقت اجمال کے ساتھ دکھانا چاہتا ہوں کہ دنیا کے اور حصوں میں انہی علوم و فنون کو کسقدر ترقی ہے اور ترقی کے کیا کیا وسائل پیدا ہوگئے ہیں۔

اے حضرات! اگرچہ ہندوستان کی موجودہ حالت دیکھکر یہی قیاس ہوتا ہے کہ اب علمی ترقی کے میدان میں کوئی نئی وسعت پیدا نہیں ہوسکتی۔ لیکن شام و مصر اور بالخصوص یورپ کی علمی رفتار کے لحاظ سے میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ اس زمانہ میں جو سامان پیدا ہوگئے ہیں اور علوم و فنون کے متعلق نظر و فکر کے جو طریقے اب ایجاد ہوئے ہیں پہلے انکا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اگرچہ ممکن تھا کہ میں اس مضمون پر منطق۔ حکمت۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ طبعیات وغیرہ ہر ایک علم کے لحاظ سے بحث کرتا۔ لیکن اسقدر وقت و فرصت نہیں ہے۔ اسیلیے صرف فن ادب کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔

اے حضرات! فن ادب کوئی معمولی فن نہیں ہے قرآن مجید اور احادیث کے سمجھنے اور انکے نکات سے واقف ہونیکا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے مفسرین اور محدثین ادب میں نہایت کمال رکھتے تھے فن ادب میں ہمارے ہاں صرف مقامات حریری۔ متنبی۔ سبعہ معلقہ درس میں داخل تھا۔ اور بعض لوگ تیموری نفحۃ الیمن بھی پڑھتے تھے۔ صرف یہی نہیں تھا کہ درسی کتابیں انہی میں منحصر تھیں۔ بلکہ ادب کا کل سرمایہ جو ہمارے

ملک میں دستیاب ہوسکتا تھا وہی کتابیں یا انکی شرحیں اور حاشیے تھے۔

اب خیال فرمائیے کہ آج کل ادب کا کسقدر سرمایہ پیدا ہوگیا ہے۔ جاہلیۃ اور شروع اسلام کے اشعار کی نسبت مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید کے مطالب سمجھنے کے لیے انپر اطلاع حاصل ہونی ضرور ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے الشعر دیوان العرب فاذا خفی علینا الحرف من القرآن رجعنا الی دیوانها۔ انہی کا قول ہے اذا سألتمونی عن غریب القرآن فالتمسوها فی الشعر۔ جن اشعار کو حضرت عبداللہ بن عباس نے فہم قرآن کے لیے ضروری سمجھا انمیں سے ہمارے پاس صرف سبعہ معلقہ موجود تھا۔ لیکن اب شام و مصر وغیرہ میں اشعار عرب کا بے انتہا ذخیرہ موجود ہوگیا ہے۔ شعرائے جاہلیۃ و مخضرمین میں سے امراء القیس۔ زہیر بن ابی سلمی۔ لبید بن ربیعۃ العامری۔ نابغہ ذبیانی۔ علقمۃ الفحل۔ عروۃ بن الورد۔ حاتم طائی۔ اوس بن حجر۔ خنساء۔ عنترہ بن شداد العبسی۔ طرفہ بن عبد بکری۔ عادرۃ کے دیوان چھپ گئے ہیں۔ قبیلہ ہذیل جنکی نسبت تسلیم کیا گیا ہے کہ عرب کے تمام قبائل میں سب سے فصیح تر تھے۔ اس قبیلہ کے تمام شعرا کا کلام ایک مجموعہ میں چھاپا گیا ہے خلیفہ منصور عباسی نے خلیفہ مہدی کی تعلیم کے لیے اشعار عرب کا جو مجموعہ طیار کرایا تھا اور جسکو علامہ مفضل ضبی نے جمع کیا تھا بیروت میں چھپکر شائع ہوا ہے۔

۱۰ قصیدے جو مختارات اشعار العرب کہلاتے ہیں پورے چھپ گئے ہیں۔ جمہرۃ العرب شائع ہوچکا ہے۔ اسلامی شعرا میں سے جنکا کلام مستند مانا گیا ہے انہیں سے حطیئۃ۔ عمر بن ابی ربیعہ۔ اخطل۔ فرزدق۔ ابو محجن ثقفی کا دیوان چھپ چکا ہے۔ اور زمانہ ما بعد کے شعرا کا کلام تو نہایت کثرت سے شائع ہوچکا ہے۔ عباس بن الاحنف۔ صریع الغوانی۔ عبداللہ بن المعتز۔ ابوتمام۔ ابوعبادہ بحتری۔ ابوالعتاہیۃ۔ ابو فراس۔ ابو نواس۔ کہ انمیں سے ہر ایک فن شعر کا امام تھا۔ سب کے دیوان

چھپ چکے ہیں۔ انکے سوا ادب کی وہ کتابیں جنہیں کثرت سے اشعار عرب مذکور ہیں بکثرت شائع ہوچکی ہیں۔

یہ تو فقط اس سرمایہ کا بیان تھا جو فن ادب میں اب موجود ہے لیکن جب آپ یہ خیال فرمائینگے کہ اس فن کے متعلق پہلے واقفیت اور تحقیقات کا کیا طرز تھا؟ اور اب کیا ہے؟ تو اور بھی تعجب ہوگا پہلے یہ طریقہ تھا کہ سبعہ معلقہ کے ساتوں قصیدے معمولی طور سے پڑھا دیئے جاتے تھے اور شوقین طالب علم لغات کو حفظ کر لیتے تھے۔ اسکے سوا انکو کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ شعرا کون تھے؟ انکو اور شاعروں سے کیا نسبت ہے؟ انکے کلام میں کیا کیا خوبیاں ہیں؟ کہاں کہاں انہیں بلاغت کی کمی ہے؟ لیکن اب ان امور کی تحقیق کیجاتی ہے کہ عرب میں شاعری کب پیدا ہوئی؟ کن اسباب سے پیدا ہوئی؟ کس قبیلہ میں اول اسکا رواج ہوا؟ اقسام شعر میں سے کون کونسی قسمیں کس کس زمانہ میں ایجاد ہوئیں؟ شعراے جاہلیت نے کن کن مضامین پر شعر لکھے؟ انہیں عہد بعہد کیا کیا ترقیاں ہوئیں؟ بلاغت کے کون کونسے اسلوب انہوں نے استعمال کیے؟ انکی شاعری سے عرب پر کیا اثر پڑا؟ اسلامی شعرا نے فن شعر میں کیا تصرفات کیے؟ زبان کو کیونکر صاف کیا؟ کتنے الفاظ چھوڑ دیے؟ کن کن نئے مضامین پر اشعار لکھے؟ اسی طرح عہد بعہد اس فن میں کیا کیا ترقیاں ہوئیں؟

ادب کی طرح اور علوم و فنون میں بھی تحقیقات کا طرز بدلگیا ہے لیکن انکے بیان کرنے کے لیے وقت نہیں۔

اے حضرات! علما کا ایک اور سب سے بڑا فرض۔ بلند حوصلگی اور عالی ہمتی کا پیدا کرنا ہے اس سے میرا یہ مراد نہیں کہ وہ بڑی بڑی نوکریوں کی خواہش کریں۔ دولت کے جمع کرنے کی تدبیریں سوچیں۔ بلکہ میری مراد علمی اور مذہبی حوصلہ مندی ہے۔ وہ حوصلہ مندی جسکا یہ اثر تھا کہ محدثین ایک ایک حدیث کے لیے ہزاروں کوس کا سفر کرتے تھے؟ جسکا یہ اثر تھا کہ اندلس کے طلبا ہندوستان میں

تحصیل علم کے لیے آتے تھے؟ جسکا یہ اثر تھا کہ ابن بیطار نے نباتات کے دریافت کے لیے اندلس سے چلکر یونان۔ اور بحر روم کے تمام جزائر کی خاک چھان ڈالی تھی؟ جسکا یہ اثر تھا کہ جغرافیہ کی تحقیقات کے لیے علامہ بشاری نے ۲۰ برس۔ دنیا کے سفر میں صرف کر دیئے تھے؟ جسکا یہ اثر تھا کہ ابو الفرج اصفہانی نے ۵۰ برس صرف کر کے کتاب الاغانی لکھی اور دنیا کو علم ادب کے بڑے بڑے کتبخانوں سے مستغنی کر دیا۔ جسکا یہ اثر تھا کہ اصمعی۔ محاورات عرب کی تحقیقات کے لیے عرب کے بیابانوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔

اے حضرات کیا موجودہ زمانہ میں ان حوصلہ مندیوں کی ایک بھی مثال پائی جاتی ہے اور کیا ان حوصلہ مندیوں کے بغیر علما اپنے فرض سے ادا ہو سکتے ہیں۔

افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ علمی حوصلہ مندی اسقدر مفقود ہوگئی ہے کہ ہم اُس کے امکان کا بھی تصور نہیں کر سکتے حالانکہ وہ حوصلہ مندیاں۔ دوسری قوموں میں موجود ہیں۔ اور اگر آپ اجازت دیں تو میں مثال کے طور پر صرف ان عجیب و غریب کوششوں کا ذکر کروں جو یورپ نے خاص ہمارے علوم و فنون کی ترقی دینے میں کی ہیں۔

(۱) سب سے بڑا احسان جو یورپ کا عربی زبان اور عربی علوم و فنون پر ہے یہ ہے کہ عربی کی وہ کتابیں جو مسلمانوں کے لیے مایۂ فخر ہیں اور باوجود اسکے اسقدر نایاب تھیں کہ کہیں انکا پتہ بھی نہیں لگتا تھا۔ یورپ نے نہایت تلاش سے بہم پہنچائیں؟ ان کی تصحیح کی؟ حاشیے چڑھائے؟ اختلاف نسخ قلمبند کیے؟ مضامین و الفاظ کی فہرست مرتب کی۔ اور نہایت حسن و خوبی کے ساتھ چھاپکر شتہر کیا ان محنتوں کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جس جرمن پروفیسر نے کتاب الفہرست کی تصحیح و ترتیب کی اُسکے پورے بیس سال اس کام میں صرف ہوئے۔ پروفیسر رایٹ اٹھارہ برس سے جریر کے دیوان کے مرتب کرنے میں مصروف ہے۔ برلن کی ایک کمیٹی نے لاکھ روپئے صرف اسی کام

کے لیے وقف کر دیئے کہ **طبقات بن سعد** کا پورا نسخہ جو بارہ جلدوں میں ہے چھاپ دیا جائے چنانچہ خاص اسی غرض سے پروفیسر زاخو۔ اپریل ۱۸۹۵ء میں مصر پہنچا۔ اور اب تک وہیں مقیم ہے۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔

اسوقت تک عربی کی جسقدر نایاب کتابیں یورپ نے چھاپ کر شائع کیں۔ اُن سب کا نام تو میں گنا نہیں سکتا۔ لیکن تاریخ کی تصنیفات کی ایک فہرست ذیل میں لکھتا ہوں جنمیں سے اکثر خود میری نظر سے گذری ہیں۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو یورپ کے چھاپنے سے پہلے ناپید تھیں اور ہمارے ہندوستان کے علما۔ اب بھی انکے نام سے بیخبر ہیں۔ انہیں سے بعض مصر وغیرہ میں چھپی ہیں تو یورپ ہی کے نسخہ سے منقول ہو کر چھپی ہیں۔

[1] تاریخ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری تمام وکمال ۱۲ جلد۔ [2] اخبار الطوال ابو حنیفہ دینوری۔ [3] کتاب التنبیہ الاشراف للمسعودی۔ [4] انساب الاشراف للبلاذری۔ [5] تاریخ یعقوبی۔ [6] فتوح البلدان بلاذری [7] کتاب الفہرست ابن الندیم بغدادی۔ [8] رحلۃ بن جبیر۔ [9] المعجب۔ [10] البیان المغرب فی اخبار المغرب للمراکشی [11] سیرۃ صلاح الدین للقاضی بہاؤالدین بن شداد۔ [12] الفتح القسی للعماد الاصفہانی۔ [13] ذیل للطبری۔ [14] المشتبہ للذہبی۔ [15] معجم بن آبار۔ [16] اخبار مکۃ للازرقی۔ [17] المنتقی باخبار ام القریٰ۔ [18] اعلام باعلام بیت اللہ الحرام [19] ستہجا فی عجائب لمصار۔ [20] الآثار الباقیۃ عن القرون الخالیۃ۔ [21] کتاب الاعتبار لابن منقذ۔ [22] المام للمقریزی [23] البیان والاعراب بما بارض مصر من الاعراب۔ [24] کتاب الہند للبیرونی۔ [25] الخبر عن اول دولۃ من دول الاشراف العلویین۔ [26] عیون والحدائق۔ [27] زبدۃ الحلب فی تاریخ حلب۔ [28] تاریخ آل سلجوق۔ [29] زبدۃ النصرۃ فی اخبار الوزراء السلجوقیۃ۔ [30] سلسلۃ التواریخ۔ [31] اخبار العصر۔ [32] اخبار مجموعہ فی فتح الاندلس۔ [33] تاج التراجم لقاسم بن قطلوبغا۔ [34] الفخری فی الآداب السلطانیۃ۔ [35] مروج الذہب للمسعودی۔ [36] کتاب الصلۃ لابن بشکوال۔ [37] تکملہ کتاب الصلۃ۔ [38] بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال اہل الاندلس۔ [39] طبقات المفسرین للسیوطی۔ [40] اخبار ملوک مغرب

والفارس للمقریزی۔ عجائب الہند لبزرگ بن شہریار۔ مکتبۃ صقلیۃ۔ تہذیب الاسماء للنووی۔ کتاب الانساب للمقدسی۔ فتوح الشام للازدی۔ مختصر طبقات الحفاظ للسیوطی۔ معارف ابن قتیبۃ ۔

ان کتابوں کے علاوہ یورپ نے جغرافیہ کی تصنیفات کا پورا سلسلہ مرتب کرکے چھاپا۔ ہمارے خیال میں بھی نہ تھا کہ جغرافیہ کے فن میں (جو اس ملک میں خاص انگریزوں کی بدولت آیا ہے اور اسی وجہ سے ہمارے مُلا اس سے بالکل ناآشنا ہیں) مسلمانوں نے کوئی خاص کمال پیدا کیا تھا۔ لیکن ان تصنیفات کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے پہلے اسکی کیا حالت تھی اور مسلمانوں نے اسکو کہانسے کہاں تک پہنچا دیا؟ کسکو خیال تھا کہ تیسری صدی ہجری میں عرب کا ایسا جغرافیہ طیار ہوا ہوگا۔ جو بالکل آج کل کی تحقیقات کے موافق ہے۔ جسمیں عرب کے ایک ایک شہر؛ ایک ایک گاؤں کی تفصیل ہے اور ہر ہر گاؤں کی پیداوار؛ عمارتوں، معدنیات؛ اشجار؛ نباتات؛ جانور؛ تجارت وغیرہ کے حالات تفصیل سے مذکور ہیں۔ عرب کا جغرافیہ ابن الحائک ہمدانی نے ۳۳۴ھ میں لکھا تھا جو یورپ میں بمقام لیڈن ۱۸۸۴ء میں چھاپا گیا۔

جغرافیہ کے سلسلہ میں جو نایاب کتابیں یورپ میں چھاپی گئیں اُنکے نام حسب ذیل ہیں۔

معجم البلدان یاقوت حموی چار جلد۔ مشترک یاقوت حموی۔ مراصد الاطلاع۔ احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم۔ جغرافیہ ابن حوقل بغدادی۔ مختصر کتاب البلدان لابن الفقیہ الہمدانی۔ کتاب البلدان للیعقوبی۔ تقویم البلدان۔ المسالک والممالک لابن خرداذبہ۔ مسالک الممالک للاصطخری۔ نزہۃ المشتاق للشریف الادریسی۔

یہ سب بڑی بڑی ضخیم کتابیں ہیں اور انکے دیکھنے سے مسلمانوں کی علمی کوششوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۴) دوسری تیسری صدی میں جو نئے الفاظ عربی تصنیفات خصوصاً تاریخ میں شامل

ہوتے گئے۔ لغت کی کتابوں میں کہیں انکا پتہ نہیں لگتا۔ تاریخ طبری۔ وبلاذری۔ اور مقریزی میں
سیکڑوں اور ہزاروں الفاظ ایسے موجود ہیں جو قاموس۔ لسان العرب۔ شرح قاموس۔ وغیرہ
بڑی بڑی کتابوں میں نہیں ملتے۔ اور مجکو اسکا خاص تجربہ ہو چکا ہے۔ یورپ نے اس مشکل کی عقدہ
کشائی کی۔ فرانس کے ایک پروفیسر نے جسکا نام دوزی ہے خاص اس قسم کے لغات پر ایک
کتاب لکھی۔ جو دو جلدوں میں چھپکر شائع ہوئی ہے اور جسمیں سترہ سو صفحے ہیں۔ یہ کتاب میرے مطالعہ
میں ہے اور میں ہر دفعہ مصنف کی محنت اور تحقیق پر حیران رہ جاتا ہوں۔ ہمارے ملک کے علما شاید
یورپ کی وسعت نظر اور کثرت معلومات کا اعتراف نکریں لیکن مصر وشام کے فضلا، ان تصنیفات
کو پڑھکر کیونکر انکار کرسکتے تھے۔ چنانچہ علامہ حمزہ فتح اللہ جو مصر میں فن ادب کا استاد الکل ہے
اسنے اپنے رسالہ باکورۃ الکلام میں علانیہ تسلیم کیا کہ نحن فی اللغۃ العربیۃ کالعایلۃ علیھم
یعنی "عربی زبان میں ہم لوگ یورپ کے بال بچے ہیں"

(۴) عربی زبان میں ایسی کوئی تصنیف موجود نہ تھی اور نہ کبھی لکھی گئی جو مسلمان فلاسفروں
کی تصنیفات کی ریویو کے طور پر ہو اور جس سے یہ ظاہر ہو کہ یونانیوں کے کیا مسائل تھے اور حکمائے
اسلام نے اسپر کیا ترقی کی۔ یورپ میں اس قسم کی تصنیفات کثرت سے لکھی گئیں اور برابر لکھی جا رہی ہیں
ارسطو کی قاطیغوریاس جسکو حنین بن اسحاق نے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ اصل یونانی زبان میں
معہ عربی ترجمہ کے چھاپی گئی ہے اور اسکے دیباچہ میں اس امر پر بحث کی ہے کہ یہ ترجمہ کہاں تک
صحیح اور اصل کے مطابق ہے۔

جرمن کے ایک پروفیسر نے فارابی کی تمام تصنیفات اور مسائل پر تین سو صفحوں میں ایک
مفصل ریویو لکھا۔ اسی طرح امام غزالی کی تصنیفات پر تین سو صفحوں میں ایک کتاب لکھی گئی۔
میں نے یہ دونوں کتابیں دیکھی ہیں۔ اگرچہ افسوس ہے کہ جرمن زبان نہ جاننے کی وجہ سے انکے

متمتع نہیں ہوسکا۔

پروفیسر مونک نے فرنچ زبان میں خاص اس بحث پر کہ مسلمانوں نے یونانیوں کے علوم کی کیونکر تحصیل کی اور کسنے یہودیوں نے کیونکر سیکھا۔ ایک مستقل کتاب لکھی ہے چنانچہ میں نے اس کتاب کے بعض مقامات سبقاً سبقاً پڑھے ہے۔ پروفیسر رینان نے حکیم ابن رشد کے فلسفہ پر چارسو صفحوں میں ایک عجیب غریب کتاب لکھی جسمیں اُسنے تفصیلاً بیان کیا ہے کہ جرمن وغیرہ ممالک میں کئی سو برس تک خاص ابن رشد کا فلسفہ جاری رہا اور وہاں بہت سے فرقے پیدا ہوگئے تھے جو اپنے تئیں بجائے ارسطو و فلاطوں کے ابن رشد کی طرف منسوب کیا کرتے تھے۔

پارسال مقام جنیوا میں جو اورینٹل کانفرنس منعقد ہوئی۔ اُسمیں ایک یہ تجویز منظور ہوئی کہ ایک کمیٹی قائم ہو جسمیں عربی زبان کے بڑے بڑے کامل الفن ممبر مقرر کیے جائیں اسی کمیٹی کا یہ کام ہوگا کہ مسلمانوں نے فلسفہ۔ ہئیت طب اور لٹریچر میں جو ترقی کی۔ اسکی ایک مفصل انسائیکلوپیڈیا۔ طیار کرے۔ چنانچہ اسی کانفرنس میں یہ کمیٹی قائم ہوگئی اور بڑے بڑے عربی داں پروفیسر اسکے ممبر مقرر ہوئے۔

اے حضرات علما۔ جبکہ دوسری قومیں خود ہمارے علوم و فنون میں ایسی عجیب و غریب کوششیں کررہی ہیں اور عربی زبان کے میدان میں اسقدر وسعت پیدا ہوگئی ہے تو کیا ہم کو اسی پر قناعت کرنی چاہیئے کہ ایک محدود نصاب کی چند کتابیں پڑھائے جائیں اور تمام عمر اسی محدود دائرہ میں بند پڑے رہیں۔

علمی حوصلہ مندی جسکو میں نے علما کا فرض بتایا ہے اسکا یہ اقتضا ہے کہ اگلوں نے ہمارے لیے جو سرمایہ چھوڑا تھا۔ دنیا سے ہم جائیں تو اُسمیں اضافہ کرکے جائیں۔ یہ خیال غلط اور بالکل غلط ہے کہ علمی کارخانہ میں کام کرنے کے لیے اب کچھ باقی نہیں رہا۔ ابھی بہت وسعت ہے

اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔

فیض روح القدس ار باز مدد فرماید ۔۔۔ دیگراں نیز کنند انچہ مسیحا مے کرد

یہ پورا خطبہ ندوۃ العلما کے اجلاس میں نہیں پڑھا گیا تھا۔ بلکہ اسکے جستہ جستہ مقامات کو لے لیا گیا تھا۔

النظر

فی

السفر الی الموقتہ

اسلام کی اُن وسیع آبادیوں میں جو مشرق سے لیکر مغرب تک پھیلی ہوئی ہیں، اگرچہ قومیت کا، نسل کا، شکل و صورت کا، رسم و رواج کا، عادات و خصائل کا سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ تعجب اور سخت تعجب ہے کہ ترقی اور تنزل کی سطح ہر جگہ قریباً یکساں ہے۔ مثلاً ہندوستان کی جو یہ حالت ہے کہ چند برس پہلے تمام قوم پر ایک عام غفلت طاری تھی۔ تقلید اور رسم و رواج کی قوم کا رُواں رُواں جکڑ رکھا تھا۔ آزادی اور بلند خیالی کی روح فنا ہوگئی تھی۔ پھر مغربی تعلیم کے اثر نے ایک خفیف جنبش پیدا کی۔ لوگ آہستہ آہستہ جاگنے لگے، روز بروز اپنی پستی اور تنزل کا احساس ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اب ملک کے ہر حصہ میں ترقی کی پکار ہے اور ہر طرف جوش کا ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ تاہم اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ زیادہ تر زبانی باتیں ہیں۔ جو کچھ کہا جاتا ہے کیا نہیں جاتا جسقدر زبان میں زور ہے ہاتھ میں نہیں ہے۔ عملی زندگی جو ترقی کی روح ہے اُس میں صرف اسقدر ہے کہ چند نئے تعلیم یافتہ لوگوں پر نیا رنگ چڑھ گیا ہے۔ انکی تصنیفات و تالیفات میں یورپ کی جھلک آگئی ہے۔ کچھ لوگ یورپ ہو آئے ہیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہے قلم کے ذریعہ سے اسکا تماشا ہلکا خاکہ کھینچکر قوم کو دکھلایا ہے۔ چند نوجوانوں نے یونیورسٹیوں کی ڈگریاں لی ہیں اور اپنی محنت

لیاقت، قابلیت کو سرکاری ملازمت پر نذر چڑھا دیا ہے۔

بعینہ یہی حالت مصر و شام اور خاص دار السلطنۃ قسطنطنیہ کی ہے۔ اس سلسلہ مشابہت میں اسوقت ہمکو جس خاص حصّہ سے بحث ہے وہ یورپ کا سفر اور سفرناموں کی تصنیف کا رواج ہے۔ مصر و شام میں سب سے پہلے جسنے یورپ کا سفر کیا وہ علامہ رفاعہ بک ہے۔ مصر میں جب یورپ کی تہذیب کا چرچا ہوا تو سلطنت کی طرف سے چند نوجوان یورپ میں تعلیم پانے کے لیے بھیجے گئے۔ اور علامہ موصوف انکا اتالیق مقرر ہو گیا۔ علامہ مذکور نے سفر سے واپس آکر حالات سفر اور خاص پیرس (دار السلطنۃ فرانس) کے متعلق ایک مفصل کتاب لکھی جو ۱۲۵۰ہجری میں بمقام مصر چھاپی گئی۔ عربی زبان میں یہ پہلا سفرنامہ تھا جو یورپ کے نئے تمدن کے زمانہ پر لکھا گیا۔ اسکے بعد اور لوگوں نے یورپ کے سفر کیے اور وہاں کے حالات میں کتابیں لکھیں۔ مثلاً کشف المخبّا۔ رحلہ حسن آفندی۔ رحلۃ الشیخ سلیم۔ ارشاد الالبّا۔

اس سلسلہ میں سب سے اخیر تصنیف وہ کتاب ہے جسکا نام السفر الی المؤتمر ہے اور جو ہمارے اس آرٹکل کا عنوان ہے۔ اس سفرنامہ کا مصنف احمد زکی آفندی ہے جو مصر کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان مشہور مصنف۔ اور خدیو کے محکمہ ترجمہ کا رئیس المترجمین ہے۔ یہ مصنف یورپ کی مشرقی کانفرنس کے نویں جلسہ میں جو ۱۸۹۲ء میں بمقام لندن منعقد ہوا تھا۔ خدیو کی طرف سے سفیر ہو کر گیا تھا۔ اسنے وقتاً فوقتاً حالات سفر کے متعلق اپنے دوستوں کو خطوط لکھے اور سفر سے واپس آکر اُن خطوط کو مرتب کر کے سفرنامہ کی صورت میں شائع کیا۔ ملک کی قدردانی سے پہلے اڈیشن کی جلدیں نہایت جلد نکل گئیں اور مصنف نے مناسب اضافہ کو کے اُسکو دوبارہ چھپوایا۔ مجکو فخر ہے کہ خود مصنف نے اس اڈیشن کا ایک نسخہ مجکو تحفہ کے طور پر بھیجا

جو اسوقت میرے سامنے رکھا ہوا ہے۔

سفرنامہ کا طرز عبارت

سب سے پہلے اس سفرنامہ کے پڑھنے کے وقت جس چیز پر نگاہ پڑتی ہے وہ کتاب کی طرز عبارت اور انداز بیان ہے۔ اس کتاب کی طرز تحریر میں یورپ کا اسقدر زیادہ اثر ہے کہ پہلی ہی نگاہ میں محسوس ہوتا ہے۔ اگرچہ اس عام قاعدہ کے خیال سے کہ مغلوب قومیں ہمیشہ غالب قوموں کی ہر چیز میں پیروی کرتی ہیں۔ مصنف معذور کہا جا سکتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تقلید نے کتاب کی خوبی کا معیار گھٹا دیا ہے۔ بے شبہہ بہت سی ایسی زبانیں ہیں جو یورپ کی تقلید کی وجہ سے ترقی کے سانچہ میں ڈھلی ہیں اور خصوصاً ہماری اردو میں تو جو کچھ آب و تاب۔ رنگینی و لطافت، جوش و اثر پیدا ہوا ہے سب انگریزی کی بدولت ہے۔ لیکن عربی کی حالت مختلف ہے۔ عربی زبان یا تو اسقدر بلند رتبہ اور تمام خصوصیتوں میں کامل ہے کہ دوسری کسی زبان کا اُس سے جوڑ نہیں ملتا یا اسکا اسلوب بیان اور طرز ادا۔ انگریزی سے اسقدر مختلف ہے کہ دونوں کا پیوند بدنما ہو جاتا ہے۔

مصنف کے سفر کا اجمالی نقشہ یہ ہے کہ وہ اسکندریہ سے چلکر برنڈزی کی راہ سے نیپولی سے اٹلی۔ فلورنس۔ بیزا۔ جنیوا۔ ہوتا ہوا فرانس پہنچا ہے۔ فرانس کی سیر کر کے وہ لندن روانہ ہوا اور مشرقی کانفرنس کے جلسہ میں شریک ہو کر انگلستان کے اکثر مقامات کی سیر کی، پھر پرتگال پہنچا اور دوبارہ لندن کو واپس آیا۔ لندن سے فرانس اور فرانس سے اسپین گیا اور یہ اسکے سفر کی اخیر منزل تھی۔ اگرچہ راہ میں جو مقامات آتے گئے ہیں ہر ایک کے متعلق مصنف نے کچھ کچھ لکھا ہے۔ لیکن لندن اور پیرس کے حالات میں نہایت تفصیل کی ہے۔ اسپین کا حال اگرچہ باستثنار لندن و فرانس زیادہ لکھا ہے لیکن مسلمانوں کو اس چھوڑے ہوئے دیس سے جو دلچسپی ہے اُسکے لحاظ سے گویا کچھ نہیں لکھا۔ اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ کتاب کی اصلی موضوع یعنے مشرقی کانفرنس پر بہت کم لکھا۔ جلسہ کے حالات نہایت اختصار سے لکھے۔ جو تحریریں خود پیش کیں۔ اُنکا ایک نقشہ دیا ہے لیکن انصاف یہ ہے

کردہ تحریرات، کانفرنس کے رتبہ کے شایاں نہیں۔

سفرنامہ کی خصوصیات

ایک خاص بات جو اس کتاب میں ہے وہ یہ ہے کہ مصنف اگرچہ یورپ کے ملکوں کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ہر موقع پر اسلامی معلومات کے دلچسپ نکتے ایسے تناسب اور موزونی سے اضافہ کرتا جاتا ہے جس سے اسکی لٹریچر اور وسعت نظر۔ دونوں کا کمال ثابت ہوتا ہے۔ یورپ کے جن مقامات کا عربی جغرافیوں میں پتہ لگانا مشکل ہے ہر موقع پر مصنف اُنکے عربی ناموں کی تصریح کرتا ہے جس سے قطع نظر اسکے کہ عرب جغرافیہ نویسوں کا کمال معلوم ہوتا ہے۔ عربی تاریخوں کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے اور وہ سفرنامہ کی جان ہے کہ مصنف ہر موقع پر اُن اسباب کی تلاش کرتا ہے جنکی وجہ سے یورپ کو آج یہ ترقی نصیب ہوئی ہے۔

لنڈن کے ذکر میں وہ لکھتا ہے کہ یہاں تمام لوگ وقت کو اسقدر عزیز رکھتے ہیں کہ جب کسی شخص سے کوئی بات پوچھو تو وہ نہایت جلدی کے ساتھ "ہاں" یا "نہیں" کہکر فوراً وہ کام کرنے لگتا ہے جسمیں پہلے سے مشغول تھا۔ اگر زیادہ ضرورت ہوئی تو نہایت مختصر چند الفاظ میں جواب دیگا اور ساتھ ہی جو کام کر رہا تھا کرتا جائیگا۔ کتب خانوں، کمپنیوں کے دفتروں، اور عام تجارتی کارخانوں میں ہر موقع پر یہ الفاظ اور جملے لکھے ہوئے ہوتے ہیں "چپ ہو" "صرف کام کی بات کہو"، "بولنا منع ہے"

لنڈن کی ترقی کا اندازہ وہ اس بات سے کرتا ہے کہ تمام شہر میں ایک عام حرکت ..... پائی جاتی ہے۔ سڑکوں اور گذر گاہوں پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا آدمیوں کا سیلاب آگیا ہے لیکن باوجود اسکے غل اور شور کا کیا ذکر ہے آواز تک نہیں آتی۔ ہر شخص سر جھکائے تیز بھاگا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اسکو کوئی بڑا ضروری کام درپیش ہے"۔

حقیقت میں یورپ کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہر شخص ہر وقت نہایت مستعدی کی

اپنے کام میں مشغول رہتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی دُھن میں لگا ہوا ہے بخلاف اس کے ہمارے ملک میں ایک عام فسردگی، کاہلی، بے پروائی پائی جاتی ہے۔

اٹلی اور انگلستان و فرانس کی ترقیوں کے ذکر میں وہ لکھتا ہے کہ اِن لوگوں کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ قومی خدمت کی نہایت قدر کیجاتی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی شخص نے قوم کے لیئے کوئی بڑا کام کیا ہے تو گو وہ ذاتی افعال کے لحاظ سے کیسا ہی بدچلن، بدمعاش، کمینہ، دنی الطبع ہو تاہم تمام قوم اُسکو اپنا سرتاج بنائیگی۔ ہر موقع پر اُسکا نام فخر سے لیا جائیگا۔ اُسکی یادگاریں قائم کی جائنگی اور اُسکی بُرائیوں کا مطلق تذکرہ نہوگا۔"

اسکے مقابلہ میں ہمارے ملک کا حال دیکھو کہ اگر کسی شخص نے قوم کے لیے اپنے آپ کو فدا بھی کر دیا ہو، تاہم قوم کو صرف اُسکے عیوب پر نظر ہوگی اور اُسکی خوبیوں کا ذکر تک نہ آئیگا۔ ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

مصنف نے یورپ کے تمام شہروں میں سے لنڈن کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں لیکن چونکہ ہمارے ملک کے اکثر تعلیم یافتہ لنڈن کے حالات سے خود واقفیت رکھتے ہیں اسلیے ہم اس حصہ کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں۔ البتہ فرانس کے حالات جو مصنف نے بیان کیے ہیں اسکا مختصر سا خاکہ کھینچنا ناموزوں نہوگا۔

پیرس کا ذکر

فرانس کی دارالسلطنتہ پیرس کا ذکر وہ ان الفاظ سے شروع کرتا ہے "یہ پیرس ہے جو دنیا کا انتخاب اور عالم کا سیرگاہ ہے، یہ پیرس ہے جو عظمت و شان کی تصویر اور نزاکت و لطافت کا پیکر ہے یہ پیرس ہے جو علوم کی کان اور دائرہ عرفان کا مرکز ہے، یہ پیرس ہے جسکی تعریف میں گو کتنا ہی مبالغہ کیا جائے تاہم اسکی اصلی تعریف ادا نہیں ہو سکتی۔ اسلیے مجکو صرف یہ کہنا چاہیے کہ وہ بہشتوں کی بہشت ہے انہیں نہیں بلکہ وہ پیرس ہے۔"

اس عظیم الشان دارالسلطنۃ کی عجیب و غریب باتوں میں سے مصنف نے سب سے پہلے عورتوں کی حالت پر تعجب کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ "نوع انسانی کا وہ نصف حصہ (عورت) جو ہمارے ملک میں بالکل بیکار چیز ہے۔ یہاں وہی تمام ترقیوں کی روح ہے اور اسکی اسقدر عزت کی جاتی ہے کہ فرانس کا یہ مشہور مقولہ ہے کہ "جو عورت کی مرضی ہے وہی خدا کی مرضی ہے"۔

مصنف نے اگرچہ عورتوں کی قابلیت کی نہایت تعریف لکھی ہے اور لکھا ہے کہ وہ تمام علوم و فنون میں نہایت اعلیٰ درجہ کا کمال پیدا کرتی ہیں، یہاں تک کہ انشاپردازی مضمون نگاری۔ شاعری۔ مقرری۔ مصوری۔ وکالت۔ طبابت۔ ایجاد۔ صنائع۔ ان تمام فنوں میں اعلیٰ درجہ کی کامل عورتیں موجود ہیں۔ تاہم اسکو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ یورپ میں جو عورتوں کو آزادی حاصل ہے وہ سخت اعتراض کے قابل ہے۔

اسکے بعد مصنف نے متعدد عنوانوں کو تفصیل سے لکھا ہے مثلاً عجائب خانے۔ کلیں۔ کتبخانے۔ مذہبی عمارتیں۔ نباتات کا باغ۔ مدارس اور خیراتی کارخانے۔ تھیٹر وغیرہ وغیرہ۔

عجائب خانوں میں سے دو تین عجائب خانے ذکر کے قابل ہیں۔ ایک عجائب خانہ، خاص فنون اور صناعیوں کا ہے۔ اسمیں بہت سے کمرے اور ایک کتب خانہ ہے جسمیں تیس ہزار کتابیں ہیں۔ اور یہ کل کتابیں فقط صنعت کے متعلق ہیں۔ رات کو فن صنعت پر لکچر دیا جاتا ہے اور ہر شخص کو بغیر کسی فیس کے اسمیں شریک ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ لکچرار عموماً وہ ہوتے ہیں جو فن صنعت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔

اس عجائب خانہ میں ہر قسم کے آلات اور کلیں جو قدیم زمانہ میں تھیں یا اب پیدا ہوئی ہیں مہیا کی گئی ہیں۔ زراعت۔ رصد۔ نقاشی۔ تصویرکشی۔ رنگ سازی۔ جرثقیل۔ وغیرہ کے نہایت قدیم اور جدید آلات نہایت کثرت سے موجود ہیں۔

ایک عجائب خانہ ہے جسکا صرف یہ مقصد ہے کہ دنیا کے ہر حصہ کے انسانوں کی طرز معاشرت اور طریقہ تمدن کو دکھایا جائے۔ اسمیں چالیس ہزار مجسم تصویریں ہیں۔ قدیم زمانہ کی تمام وحشی اور مہذب قوموں کو اُسی حالت اور وضع و لباس میں دکھایا ہے جسمیں وہ زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک **عجائب خانہ** فن تربیت کا ہے۔ اسمیں تمام کتابیں، رسالے، نقشے، تصویریں۔ فن تربیت سے متعلق ہیں۔ اس عجائب خانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ اور اُسکے مختلف دوروں میں تعلیم و تربیت کے کیا طریقے تھے۔ تربیت کے متعلق کس قسم کے آلات سے کام لیا جاتا تھا۔ خاص فن تربیت کے متعلق جسقدر کتابیں یہاں ہیں اُنکی تعداد ۶۸۴۸ ہے۔

ایک **عجائب خانہ** خاص مذہبی ہے یعنی دنیا کے تمام مختلف مذہبوں کو محسوس صورت میں دکھایا ہے۔ اس عجائب خانہ کی بنیاد پروفیسر جمیس نے ڈالی تھی جسنے تمام مشرقی ملکوں میں سفر کیا تھا اور مختلف مذاہب کے متعلق دس لاکھ رُپئے کی قیمت کی کتابیں مہیا کی تھیں۔ یہ تمام کتابیں اسنے عجائب خانہ میں وقف کر دیں۔ چنانچہ خاص چین۔ جاپان اور مصر کے مذاہب کے متعلق ستر ہزار کتابیں ہیں۔ بہت سے ہیکل اور مندر ہیں۔ فرعون کے زمانہ میں قیامت کے متعلق جو خیالات تھے۔ اُنکی تصویریں ہیں۔ عبادت اور پرستش کے جو جو طریقے جس جس زمانہ میں رائج تھے سب کے نمونے ہیں۔ غرض اس عجائب خانہ سے ایک سرسری نگاہ میں دنیا کی تمام قوموں کے مذہبی اعمال اور مذہبی خیالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

کتب خانے کثرت سے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ مشہور اور عظیم الشان کتب خانہ قومی کتبخانہ ہے۔ اسکو چارلس اول نے ۱۵۹۵ء میں قائم کیا تھا۔ اُسوقت اسمیں صرف بارہ ہزار کتابیں تھیں ۱۸۹۸ء میں مطبوعہ کتابوں کی تعداد تین لاکھ ہو گئی اور اب کم و بیش تیس لاکھ کتابیں ہر قسم کی موجود ہیں۔

اس کتب خانہ کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں مطبوعہ کتابیں، نقشے، جغرافیہ کے مجموعے ہیں۔ دوسرے میں قلمی کتابیں ہیں۔ تیسرے میں پرانے کتبے اور پتھر ہیں۔ کتابوں کے مطالعہ کرنیکا جو کمرہ ہے اسمیں ہر وقت ۲۵ ہزار کتابیں موجود رہتی ہیں جغرافیہ کے متعلق جسقدر کتابیں اور نقشے اس کتب خانہ میں ہیں تمام دنیا میں نہیں ہیں صرف اٹلس اور نقشوں کی تعداد ڈہائی لاکھ ہے قلمی کتابیں ۹۰۱۱۹ ہیں جنمیں آٹھ ہزار کتابیں تصویر دار اور مذہب و مطلا ہیں۔

مصنف نے حالات کی تفصیل کے بعد اسکے سالانہ مصارف کا نقشہ دیا ہے اور لندن کی برٹش میوزیم سے موازنہ کیا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے۔

سالانہ مصارف کتبخانہ پیرس

تنخواہ ملازمین	۳۶۰۰۰۰	فرنک
اسباب وغیرہ	۷۲۰۰۰۰	فرنک
طیاری فہرست	۸۰۰۰۰	فرنک
جلد بندی	۲۵۰۰۰	فرنک

مختصر یہ کہ مجموعی مصارف ۸۸۰۰۰۰ ہے لیکن برٹش میوزیم کا سالانہ صرف ۱۲۵۰۰۰۰ ہے

تعلیم کو جو یہاں وسعت حاصل ہے اسکے لحاظ سے مصنف کو بہت سے کالجوں اور اسکولوں کا ذکر کرنا چاہیے تہا۔ مگر اسنے صرف دو تین مدرسوں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے اور حقیقت میں جس جدت کی وجہ سے اسنے انتخاب کیا وہ بیجا بہی نہیں۔ انہیں سے ایک مدرسہ اندہوں کا ہے ہمارے ملک میں تو آنکھ والوں کی تعلیم کا بہی رونا ہے لیکن وہاں اندہوں کی تعلیم کا جو انتظام ہے نہایت حیرت انگیز ہے۔ فرانس کو اس اولیت کا شرف بہی حاصل ہے کہ اول اسنے اس قسم کی تعلیم کی بنا ڈالی یعنی پروفیسر ہاوی نے ۱۷۸۴ء میں اندہوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ کہولا اور تمام

اندہوں کا مدرسہ

تعلیم کی بناڈالی۔ یعنی پروفیسر ہادی نے ۱۷۸۴ء میں اندھوں کی تعلیم کا مدرسہ کھولا اور تمام دنیا میں اس قسم کا یہ پہلا مدرسہ تھا۔ یہ مدرسہ اب بھی موجود ہے۔ اسمیں اسوقت ۱۵۰ لڑکے اور ۱۰۰ لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں۔ مدت تعلیم دس برس ہے۔ اسمیں ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم اُبھرے حرفوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اور تمام کتابیں جو انکو پڑھائی جاتی ہیں اسی قسم کے حروف میں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ اسکے سوا عملی تعلیم بھی ہوتی ہے اور کاتنا۔ بُننا۔ خرادنا۔ سینا۔ پرونا۔ سکھایا جاتا ہے۔ موسیقی کی تعلیم نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے۔ مدرسہ کے کتب خانہ میں ڈہائی ہزار کتابیں ہیں جو اُبھرے ہوئے حرفوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس مدرسہ اور دیگر قسم کے دیگر مدارس سے اس درجہ کے لوگ تعلیم پاکر نکلے کہ آنکھ والے بھی انکی قابلیت کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ انہیں سے بعض نہایت نامور پروفیسر گذرے ہیں جنکی شہرت آج تک ضرب المثل ہے۔

ایک کمیٹی۔ خاص اندھوں کی تعلیم اور انکی اعانت کےلیے قائم ہے۔ ڈیڑھ لاکھ فرنک اسکا سرمایہ ہے اور قریباً ۲۴ ہزار فرنک سالانہ آمدنی ہے۔ یہ تمام رقم اندھوں کی تعلیم و تربیت و دیگر ضروری مصارف میں صرف کیجاتی ہے۔ اسوقت اس کمیٹی کے ۵۰۰ ممبر ہیں اور روز بروز ممبروں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اندھوں کےلیے متعدد اخبارات بھی ہیں جنمیں سے ایک بالکل اُبھرے ہوئے حرفوں میں چھپتا ہے"

اس سے زیادہ تعجب انگیز گونگوں کا مدرسہ ہے مصنف کا بیان ہے کہ میں نے جسوقت انکی تعلیم کی کیفیت دیکھی تو حیرت زدہ رہگیا۔ پروفیسر یا شاگرد ہاتھ کے اشارہ سے بالکل کام نہیں لیتے اور باوجود اسکے ہر قسم کے مضامین کی تعلیم ہوتی ہے۔ مصنف نے سمجھا تھا کہ بلند آوازی سے کام لیا جاتا ہوگا۔ چنانچہ اُسنے پکار پکار کر گونگوں سے باتیں شروع کیں۔ لیکن جسقدر وہ زیادہ چلاتا تھا گونگے اور زیادہ سُننے سے عاجز رہتے تہے۔ آخر پروفیسر نے انسے گفتگو کرنے کا طریقہ بتایا اور اسوقت

جو کچھ اُنسے کہا جاتا تہا وہ صاف سمجہتے جاتے تہے۔ اسمیں زیادہ تر لحاظ ہونٹوں کی حرکت کا ہی۔ گونگے ہونٹوں کی حرکت پر خیال کرتے ہیں اور بات سمجہتے جاتے ہیں۔

تعجب یہ ہی کہ سالانہ جلسوں میں یہ گونگے لیکچر اور اسپیچیں دیتے ہیں اور ہر قسم کے مطالب صرف اشاروں سے ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۰ء میں جب پروفیسر ڈولوپی کی سالگرہ کا جلسہ ہوا تو صدر انجمن مسٹر کوشفر تہا جو اسی مدرسہ کا تعلیم یافتہ انجنیر تہا اور بالکل گونگا تہا۔ کہانے کے بعد مسٹر کوشفر نے ایک لمبی اسپیچ دی جسمیں ڈولوپی کے تمام کارنامے بیان کیے اسکے بعد اوروں نے اسپیچیں دیں یہ تمام اسپیچیں صرف اشاروں کے ذریعہ سے دی گئیں۔ اور تمام حاضرین بخوبی سمجہتے تہے۔

فیاضی اور خیرات کا جو عمدہ طریقہ یہاں، اور یورپ کے تمام ممالک میں جاری ہے وہ خاص لحاظ کے قابل ہے۔ ایشیائی ممالک۔ فیاضی کے لیے مشہور ہیں۔ لیکن فیاضی کا طریقہ ایسا ابتر ہے جسکی وجہ سے قوم کی قوم گدائی اور دریوزہ گری میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اچہے خاصے، توانا اور مضبوط آدمی بہیک مانگتے پہرتے ہیں۔ مولوی، صوفی، درویش، نذر نیاز کے بہانہ سے بے تکلف گدائی کرتے ہیں لیکن یورپ کا طریقہ بالکل جُدا ہے۔ کوئی شخص کسی شخص کے آگے دستِ طلب دراز نہیں کرتا۔ نہ کوئی شخص کسی خاص شخص کو کچھ دیسکتا۔ جو کچھ جسکو دینا ہوتا ہے خیراتی کارخانوں کے حوالہ کرتا ہے، وہاں سے نہایت احتیاط کے ساتھ وہ رقم اُن لوگوں کو پہنچا دیجاتی ہے جو درحقیقت مستحق ہوتے ہیں۔ فرانس میں اِس قسم کی کمیٹیاں اور خیراتی کارخانے جس کثرت سے ہیں انکا شمار نہیں ہو سکتا۔ مصنف نے بہت کمیٹیوں کے نام لیے ہیں جنکی غرضیں مختلف ہیں۔ مثلاً یتیموں کی پرورش غریب حاملہ عورتوں کی مدد۔ بیکار پیشہ وروں کے لیے کام کی تلاش، کنواری عورتوں کے لیے شادی کا انتظام، وغیرہ وغیرہ۔ جنکی مجموعی تعداد ۲۴۷۵ ہے۔ لیکن باوجود اسکے قوم میں گداگری کی صفت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا

اسپین کا ذکر مصنف نے نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ شروع کیا ہے۔ سرحد میں داخل ہوتے ہی مصنف کے دل میں اُس شان وشوکت کا خیال تازہ ہوگیا ہے جو اس ملک کو اسلام کے عہد میں حاصل تھا۔ اسلامی عہد کی ترقیاں عظمت وشوکت۔ نزاکت اور تکلف کے جلوے جابجا اب بھی نظر آتے ہیں اور مصنف انکو دیکھکر بیتاب ہو ہو جاتا ہے۔ غرناطہ کے قصر حمراء میں پہنچکر اسپر بالکل حیرت طاری ہوگئی اور باوجود اسکے کہ وہ لندن اور پیرس کی عجیب وغریب عمارتیں دیکھ چکا تھا تاہم حمراء نے دفعۃً ان سبکو دل سے بھلا دیا۔ اس موقع پر مصنف کے خاص الفاظ یہ ہیں۔ ویعلم الله انی مارایت فی طول سیاحاتی شیئا ادق واتقن واجمل واکمل مما رایته فی هذه المدینة یعنی خدا جانتا ہے کہ میں نے اس تمام سفر میں کہیں ایسی دقیق الصنعت استادانہ خوبصورت۔ عمدہ تر چیزیں نہیں دیکھیں جیسی اس شہر میں دیکھیں“

اسکے بعد مصنف نے فخر کے جوش میں آکر مسلمانوں کے عہد کی ترقی وتہذیب کی مختصر داستان لکھی ہے پھر اسلام کی بے تعصبی اور عیسائیوں کے تعصب کا موازنہ کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے جب اس ملک کو فتح کیا تو عیسائیوں کے تمام حقوق اور مذہبی ارکان برقرار رہنے دیئے برخلاف اسکے جب وہ عیسائیوں کے قبضہ میں آیا تو پوپ کے حکم سے مذہبی مجلسیں قائم ہوئیں جنکے فیصلوں کے مطابق ہزاروں لاکھوں تصنیفات آگ میں جلا دی گئیں۔ اسکے ساتھ ہزاروں مسلمان بھی زندہ جلا دیئے گئے اور اگرچہ غرناطہ کی فتح کے وقت صریح معاہدہ ہوچکا تھا کہ مسلمانوں کے مذہب سے تعرض نہ کیا جائیگا۔ تاہم جب جنرل شمینس شہر میں داخل ہوا تو اسنے شہر کے تمام مسلمانوں کو بزور عیسائی بنانا چاہا چنانچہ پچاس ہزار مسلمان زبردستی عیسائی بنائے گئے۔ اسپر بھی اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ جنرل ترکماوا۔ نے حکم دیا کہ چونکہ یہ دل سے عیسائی نہیں ہوئے ہیں اسلیے انکو بالکل برباد کر دینا چاہیئے۔

مصنف نے اس بات کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اس ملک کو جو رونق اور عروج حاصل تھا اب اُسکا عشر عشیر بھی نہیں۔ مسلمانوں کے عہد میں اسکی مردم شماری چار کرور تھی۔ اب صرف ایک کرور ستر لاکھ ہے۔ زمینیں اکثر ویران پڑی ہیں۔ اور معاش کے وسائل نہایت کم ہیں۔ مصنف لکھتا ہے کہ قلتِ آبادی اور کثرت ویرانی کے اسباب میں سے صرف یہ سبب لکھنا کافی ہوگا کہ فلپ ثانی نے چھ لاکھ مسلمانوں کو ایک دم سے جلاوطن کر دیا جو سب کے سب کاشتکار تھے اور جنکی بدولت زراعت کو نہایت ترقی تھی۔

آخر میں مصنف لکھتا ہے کہ اگرچہ عرب اس ملک میں نہیں رہے لیکن اُنکی یادگاریں ہر جگہ موجود ہیں۔ ملک میں جو قوانین اور انتظامات جاری ہیں اُنمیں اسلامی قوانین کے آثار موجود ہیں یہاں تک کہ لوگوں کے اخلاق و عادات میں عرب کے اخلاق و عادات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ تمام یورپ کے برخلاف یہاں کے لوگ بیگانہ نواز اور مہمان پرست ہیں۔ یہ لوگ اجنبی آدمیوں کے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آتے ہیں اور ہر کام میں اُنکی اعانت کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ یورپ کے اور ملکوں میں اور اس ملک میں صریحی فرق محسوس ہوتا ہے اور وہ فرق اُنہی اخلاق کے لحاظ سے ہے جو خاص عرب کے اخلاق ہیں۔ **شعر**

عالم ز ماتہی و ز افغان ما پُر ست　　　شد عندلیب ک و چمن از نوا پرست

کتب خانہ اسکندریہ

منجملہ اُن افسوسناک غلطیوں کے جو یورپ میں اسلامی تاریخ کے متعلق کسی زمانہ میں پیدا ہوگئی تھیں اور اب تک قائم ہیں ایک یہ واقعہ بھی ہے۔

اگرچہ ایک زمانہ دراز سے یورپ کو مسلمانوں کے حالات سے واقف ہونے کے ذریعے حاصل ہیں لیکن موجودہ علم تاریخ کی ابتدا جس دور سے شروع ہوئی ہے وہ کروسیڈ یعنی صلیبی لڑائیاں ہیں۔ اس زمانہ میں یورپ نے مسلمانوں کو جس حیثیت سے جانا اور پہچانا وہ صرف یہ حیثیت تھی کہ مسلمان جنگجو ہیں، غارتگر ہیں، وحشی ہیں۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ مقدس صلیب اور عیسائیوں کے قبلہ (بیت المقدس) کے دشمن ہیں۔

یہی زمانہ یورپ کی عہد ظلمت سے نکلنے کا بھی زمانہ ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اکثر مؤرخوں نے تصریح کی ہے۔ یورپ کی علمی اور تمدنی ترقی کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی۔

اس زمانہ میں یورپ میں مسلمانوں کے متعلق عجیب عجیب روایتیں پیدا ہوگئیں اور واقعات موجودہ کے لحاظ سے ایسا ہونا ضرور تھا۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے مذہب، قومیت، معاشرت، تمدن کے متعلق یورپ میں جو غلط اور بے سروپا روایتیں پیدا ہوئیں وہ رفتہ رفتہ اس قدر شہرت پکڑ گئیں کہ ضرب المثل کے طور پر عام و خاص کی زبانوں پر جاری ہوگئیں اور جب تصنیف و تالیف کا زمانہ شروع ہوا تو۔ تاریخوں، حکایتوں، ناولوں۔ بلکہ فلسفہ کی کتابوں میں بھی کثرت سے اُنکا استعمال ہونے لگا۔ بیکن جو یورپ میں فلسفۂ حال کا بانی خیال کیا جاتا ہے اُسنے مضامین میں

ایک مجموعہ لکھا ہے جسکا نام Bacon's Essays ہے وہ ایک مضمون میں جرأت اور دلیری کی مثال میں لکھتا ہے کہ محمدؐ ایک دن لوگوں کو اپنی نبوت کا یقین دلا رہے تھے۔ چنانچہ حاضرین سے کہا کہ اُس پہاڑ کے پاس جاؤ اور اُس سے کہو کہ تجکو محمد نے طلب کیا ہے۔ لوگ گئے اور یہ پیغام سُنایا۔ پہاڑ اپنی جگہ سے کیونکر حرکت کر سکتا تہا۔ محمدؐ نے یہ دیکھکر بجائے اسکے کہ شرمندہ ہوتے نہایت اطمینان اور جرأت سے کہا کہ کچھ پروا نہیں۔ اگر پہاڑ محمدؐ کے پاس نہیں آتا تو محمدؐ خود پہاڑ کے پاس جا سکتا ہے۔

بیکن کوئی مؤرخ نہ تہا اور نہ اپنے خیال میں یہ واقعہ اُسنے آنحضرتؐ کی تحقیر کی غرض سے لکھا ہے۔ بلکہ جرأت اور حوصلہ مندی کی تعریف کرتے کرتے یہ مثال پیش کی ہے۔ لیکن چونکہ اُس زمانہ میں اس قسم کی روائتیں یورپ کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی تہیں اسلیے عام و خاص سب بے تکلف اُصول موضوع کے طور پر انکو استعمال کرتے تھے۔ اور صحیح سمجھتے تھے۔

سو ڈیڑھ سو برس سے یورپ زیادہ تحقیقات پر مائل ہوا ہے اور اس قسم کی روایتوں کی غلطی روز بروز کُھلتی جاتی ہے یہاں تک کہ یورپ کے نامور مؤرخ ان روایتوں کی نسبت تسلیم کرتے جاتے ہیں کہ وہ یورپ کے لیے شرم کی باعث ہیں۔ مسٹر کارلائل اپنی کتاب لکچر ان دی ہیروز میں لکھتے ہیں کہ "جو جھوٹ باتیں دور اندیش اور مذہبی سرگرمی رکھنے والے آدمیوں نے اُس انسان (یعنی محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی نسبت قائم کی تہیں اب وہ الزام قطعاً ہماری روسیاہی کے باعث ہیں" کارلائل صاحب نے یہ لکچر چونکہ خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی نسبت لکہا ہے اسیلیے رسول اللہ کی تخصیص کی ورنہ یورپ میں اس قسم کی جھوٹ باتیں عام طور پر اسلام اور تاریخ اسلام کے متعلق شائع تہیں۔ موجودہ تحقیقات نے اگرچہ ان غلطیوں کو کم کر دیا ہے لیکن مٹا نہیں دیا ہے۔ کیونکہ جو واقعات اس وسعت سے تمام قوم میں پہیل گئے تھے

انکی تحقیق پر مائل ہونا صرف اُن لوگوں کا کام ہے جنکے دلوں کو عام اجماع اور جمہوریت کا بوجھ دبا نہیں سکتا ہے وقلیل مّاھم۔

اسکے علاوہ ایک خاص سبب یہ ہے کہ ہر قوم میں محققین کا دائرہ جمہور سے الگ ہوتا ہے اور اگرچہ اعتبار کے قابل صرف وہ واقعات ہوتے ہیں جنکو محققین نے غور و تحقیق کے بعد تسلیم کیا ہو۔ لیکن اُنکی تحقیقات ایک خاص دائرہ تک محدود رہتی ہے۔ عام لوگوں میں اور عام تصنیفات میں انکو رواج نہیں ہوتا۔ یورپ میں جو نامور محقق ہیں اکثر اُن بیہودہ روایتوں کو غلط تسلیم کرتے جاتے ہیں جو اسلامی واقعات کے متعلق وہاں پیدا ہو گئی تھیں چنانچہ گبن کارلائل گاڈفری ہگنز۔ باسورتھ۔ رینان۔ سیدیو وغیرہ نے عموماً ان واقعات سے صاف انکار کیا ہے۔ لیکن عام تصنیفات اور عام روایتوں میں ان غلطیوں کا زور اب بھی کم نہیں ہوا۔

اسی قسم کے واقعات میں اسکندریہ کے کتبخانہ کے جلائے جانے کا واقعہ بھی ہے اس واقعہ کو یورپ نے جس بلند آہنگی سے مشہور کیا ہے حقیقت میں وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ تاریخیں۔ ناولیں۔ حکایتیں۔ مثلیں۔ افسانے۔ قصہ طلب حوالے۔ روزمرہ کے محاورے۔ ایک چیز بھی اس صدا سے خالی نہیں۔ ادب اور لٹریچر کا تو کیا ذکر ہے منطق و فلسفہ بھی اُسکے اثر سے محروم نہ رہے۔ ایک سال کلکتہ یونیورسٹی کے سوالات امتحان (ایف اے پرچہ علم منطق) میں یہ سوال تھا کہ ذیل کے مغالطہ کو حل کرو یعنی کتابیں اگر قرآن کے موافق ہیں تو انکی کوئی ضرورت نہیں اور مخالف ہیں تو اُنکو برباد کر دینا چاہیئے۔"

یعنی ۱۸۶۹ء

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ یورپ کو کتب خانہ اسکندریہ کے ساتھ اسقدر ہمدردی کیوں ہے؟ یہ مسلم ہے کہ جس کتب خانہ کی نسبت بحث ہے عیسائیوں سے اُسکو کچھ واسطہ نہیں اُسکو بادشاہان مصر نے قائم کیا تھا جو بت پرست تھے اور حضرت عیسیٰ سے بہت پہلے تھے۔ شاید یہ کہا جائے کہ

یورپ کی عام قدر دانی اور ہمدردی کا اثر ہے۔ لیکن اس حالت میں اسکندریہ کی تخصیص کی کیا وجہ ہے۔ انہی ممالک میں اور بھی بہت بڑے بڑے کتبخانے برباد ہوئے۔ اُنپر یورپ میں یہ شور و غل کہاں ہوا۔ اسکندر نے ایران کے کتبخانے جو برباد کیے اُنکی تشہیر کسنے کی؟ اسپین میں خود عیسائیوں نے مسلمانوں کی تمام علمی یادگاروں کو مٹا دیا اور کئی لاکھ کتابیں برباد کردیں؟ کسنے اسکا ماتم کیا؟۔ پھر کتبخانہ اسکندریہ کے ساتھ یہ خاص ہمدردی کیوں ہے؟۔

حقیقت یہ ہے (جیسا کہ ہم آگے چلکر ثابت کرینگے) کہ اس کتبخانہ کو خود عیسائیوں نے برباد کیا تھا اور بڑے بڑے پیشوایان مذہب اُنکی بربادی میں شریک تھے۔ اُسوقت تو یہ امر فخر کا باعث تھا۔ لیکن جب کسی قدر تہذیب و شائستگی کا زمانہ آیا تو یورپ نے دیکھا کہ اُسکے دامن پر یہ بہت بڑا بدنما داغ ہے اُسکے مٹانے کی اسکے سوائے اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ یہ الزام کسی دوسری قوم کے سر منڈھا جاوے۔ مسلمانوں نے جب مصر و اسکندریہ فتح کیا تو کتبخانہ مذکور کا وہاں نام و نشان نہ تھا۔ متعصب عیسائیوں نے اس گمشدگی کو فاتحان اسلام کی طرف منسوب کر دیا اور چونکہ اُس زمانہ میں تمام یورپ تعصب سے لبریز تھا اور کسی قسم کی علمی ترقی کا اثر نہ تھا اسلیے کسی نے غور و تحقیق کی پروا نہ کی اور نہایت تیزی سے یہ روایت تمام یورپ میں پھیل گئی۔ یورپ نے اس ہمدردی سے اس واقعہ کا ماتم کیا کہ گویا وہ اُنہی کا خاص کتبخانہ تھا۔ چنانچہ عوام کا آج تک یہی خیال ہے۔ اس عام شہرت نے یہ بڑا فائدہ دیا کہ عیسائیوں کی طرف اس الزام کے منسوب کرنیکا کسی کو خیال بھی نہ آیا کیونکہ ظاہراً یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کوئی قوم اپنا سرمایہ آپ نہیں برباد کر سکتی۔

اب اس فرضی واقعہ کو جسکی صدا سے کسی زمانہ میں تمام یورپ گونج رہا تھا تحقیق کرو کہ اسکی اصل کیا ہے۔ افسوس کچھ بھی نہیں!!! لیکن یہاں ایک سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ ایک فرضی واقعہ کا اتنی مدت تک تمام ممالک یورپ میں اس طرح مشہور و مسلم رہنا کیونکر ممکن ہے؟ یہ سوال بظاہر

مشکل ہے لیکن اسکا جواب بہت آسان ہے یورپ کے عہد ظلمت تک تو اس شہرت پر کچھ تعجب نہیں اُسوقت یہی اور بہی سیکڑوں بیہودہ روائتیں شائع تہیں اور عموماً تسلیم کیجاتی تہیں جیساکہ ہم اس مضمون کے شروع میں لکھ آئے ہیں۔ تہذیب و ترقی کے زمانہ سے ہیر بحثیں شروع ہوئیں اور بڑے بڑے نامور مصنفین نے اسکی صحت سے انکار کیا البتہ یہ تعجب ہے کہ اب بہی چند لوگ اسکی صحت کے قائل ہیں حالانکہ اُسکے بُطلان کا قطعی فیصلہ ہوجانا چاہیئے تہا۔

لیکن اسکی دو وجہیں ہیں اوّل تو یہ کہ تہذیب و ترقی کے زمانہ میں بہی جاہلیت کے آثار بالکل فنا نہیں ہوجاتے اور نہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ تاریخی واقعات کے متعلق یورپ کا جو طرز بحث ہے وہ (اکثر) کسی پہلو کا قطعی فیصلہ نہیں ہونے دیتا۔ اصل روایت کو چھوڑکر درایت و قیاسات پر بحثیں شروع ہوجاتی ہیں اور بہت سی فروعی باتیں بحث طلب قرار پاجاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ ایک بڑا سلسلہ طیار ہوجاتا ہے۔ اور اصل بحث غیر منفصل رہجاتی ہے۔ اس مسئلہ میں بہی ایسا ہی ہوا چنانچہ اسکی تفصیل آگے آتی ہے۔

یورپ میں ایک مدت سے یہ مسئلہ زیر بحث ہے اور اکثر مصنفوں نے اُسکے متعلق مستقل مضامین لکھے مسلمانوں کے متعلق جو عام تاریخیں لکہی گئی ہیں اُنمیں بہی اکثر اسکا ذکر آجاتا ہے اور مصنفین اس روایت کی نقل کرنے کے بعد اپنی خاص رائے (موافق یا مخالف) بیان کرتے ہیں اس قسم کی جسقدر تحریریں ہماری نظر سے گذریں اجمالاً اُنکا ذکر کرنا مناسب ہوگا کیونکہ ہمارے مضمون میں اکثر جابجا اُنکے حوالے آئینگے۔ اسی لحاظ سے ہم ان کتابوں کے مقامات بقید صفحات و اڈیشن لکھتے ہیں۔

سب سے پہلے مسٹر گبن نے جو ۱۷۹۴ء میں فوت ہوا اس واقعہ سے انکار کیا اور اپنی تاریخ رومن امپائر حصہ ۵ مسلمانان فتح اسکندریہ کے بیان میں اسکے متعلق مختصر مگر محققانہ ریمارک کیا

پروفیسر وائٹ نے اسکے ثبوت میں ایک مفصل آرٹکل لکھا۔ (دیکھو

AegyptiacaorObservationoncertainantiquities
ofEgyptbyJ.WhiteD.D.ProfessorofArabicinthe
UniversityofOxford1801

SuccessorsofMohamadbyWashingtonIrvingPage
113PrintedbyBell & SonsLondon. واشنگٹن ارونگ

(The SaracensSecondEditionPage 254 Storyofna
tion Seriesedited1889.) آرتھر گلمین ایم۔اے۔

(HistoryofArabia,AncientandModernVolIPage393
byAndrewCrichton.) مسٹر کریٹن

HistoryoftheConflictbetweenreligionandscience
20th EditionLondon1887Page104 & 105ByDrap
erLL.D.ProfessorNewyorkCollegeAmerica. ڈریپر

اسپکٹیٹر جو لندن کا مشہور اخبار ہے اسمیں متعدد مباحثے اسکے متعلق شائع ہوئے جنمیں سے
بعض موافق تھے اور بعض مخالف۔

(دیکھو اسپکٹیٹر پرچاہائے ۲۔جون ۱۸۸۶ء اور ۲۳۔جون ۱۸۸۶ء)

برٹش انسائیکلوپیڈیا ذکر اسکندریہ۔

میسو سیدیو نے جو فرانس کا مشہور عالم ہے اور جسنے اسلام کی نہایت جامع اور مفید
تاریخ لکھی ہے بسیر مورخانہ نکتہ چینی کی (دیکھو)

HistoireGeneraleDesArabesParL.A SedillotTom
IParis1877P155

پروفیسر ڈساسی فرانس کے مشہور عربی داں نے اس واقعہ کے متعلق مفصل بحث لکھی دیکھو

پروفیسر ڈساسی (Desacy) کا ترجمہ و نوٹ کتاب عبداللطیف بغدادی مطبوعہ پیرس ۱۸۱۰ء

صفحہ ۲۴۰-

سب سے زیادہ جامع اور مفصل وہ آرٹکل ہے جو مسٹر کریل جرمنی نے اورینٹیل کانفرنس میں پیش کیا۔ یورپ میں دس پندرہ برس سے ایک کانگریس قائم ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ ایشیا کی تاریخ کے متعلق نادر اور مفید تحقیقات بہم پہنچاوے۔ اس کانگریس کا چوتھا اجلاس ستمبر ۱۸۷۸ء میں بمقام فلارنس منعقد ہوا تھا۔ اُسکے ایک اجلاس میں مسٹر کریل نے جو جرمن کے مشہور عربی داں عالم ہیں اس بحث پر جرمن زبان میں ایک رسالہ پیش کیا جو کانگریس کی رپورٹ کے ساتھ شایع ہوا تھا چنانچہ اُس رسالہ کا ترجمہ بعینہٖ اس مضمون کے اخیر میں ضمیمہ کے طور پر شامل ہے۔

اس مقام پر مجکو یہ بھی ظاہر کر دینا ضرور ہے کہ مسٹر کریل کے مضمون کا ترجمہ میری درخواست کے موافق میرے معزز دوست نہیں بلکہ میرے مخدوم شمس العلما مولانا سید علی بلگرامی جیالوجسٹ۔ بی اے۔ بی ایل۔ انسپکٹر جنرل معدنیات حیدرآباد دکن نے کیا ہے جو درحقیقت السنہ مختلفہ کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کے فارابی و کندی ہیں۔ فرنچ تصنیفات کے متعلق مجکو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ میں نے ٹوٹی پھوٹی فرنچ سیکھ لی ہے اور اسلیے اُن سے متمتع ہونا میرے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔

اس روایت کے متعلق سب سے مقدم اور ضروری بحث یہ ہے کہ اُسکا اصلی مخرج یورپین تاریخیں ہیں یا عربی تاریخیں؟ یہ سوال اگرچہ نہایت ضروری سوال ہے لیکن بحث طلب نہیں۔ کیونکہ مخالف و موافق دونوں نے اس سوال کا یکساں جواب دیا ہے۔ یورپ کے عام مورخین موافق ہوں یا مخالف اس سے انکار نہیں کرتے کہ اُنکے پاس اس روایت کا کوئی مخرج نہیں ہے اور وہ اس مرحلہ میں صرف عربی تاریخوں کے دست نگر ہیں۔ لیکن اس بات کے ثابت کرنے سے پہلے ہم بتانا چاہتے ہیں کہ یورپ میں یہ قصہ کیونکر مشہور ہوا اور کس ذریعہ سے۔

مقدم و ضروری بحث

یورپ میں اول اول اس واقعہ کو ابو الفرج نے مشہور کیا ہے۔

سب سے پہلے جسنے یورپ میں اس واقعہ کو مشہور کیا وہ ابو الفرج ہے۔ اسکی مختصر سی لائف یہ ہے کہ وہ ایک یہودی طبیب ہارون نامی کا بیٹا تہا۔ اور شہر ملیطن میں ۱۲۲۶ء میں پیدا ہوا۔ چونکہ اُسکا باپ ترک مذہب کر کے عیسائی ہو چکا تہا اسلیے ابو الفرج نے شروع ہی سے عیسائی مذہب کی تعلیم پائی۔ اُسنے اپنے مذہبی علوم کے علاوہ عربی و سُریانی زبان میں نہایت کمال پیدا کیا اور اپنی لیاقت کی وجہ سے اکیس ہی سال کی عمر میں گویا کا بشپ مقرر ہوا اور رفتہ رفتہ مافریان کے درجہ تک ترقی کی جسکے بعد صرف بطریق پٹریارک کا رتبہ باقی رہجاتا ہے۔ ابو الفرج نے سُریانی زبان میں ایک نہایت بسیط تاریخ لکہی جسکا ماخذ۔ سُریانی۔ عربی۔ فارسی اور یونانی کتابیں تہیں۔

ابو الفرج کی مختصر لائف

اس بڑی کتاب کا اُسنے عربی زبان میں ایک خلاصہ لکہا جسکا نام مختصر الدول ہے اور جسکو ڈاکٹر پوکاک پروفیسر اکسفورڈ کالج نے ۱۶۶۳ء میں لاٹن ترجمہ کے ساتھ چہاپا۔ اس خلاصہ کے مختلف نسخے ہیں اور سب ناکامل ہیں اور بعض واقعات اصل سُریانی کتاب سے زائد ہیں۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ یہ زائد واقعات خود ابو الفرج نے بڑہائے یا کسی اور نے الحاق کیے۔

یہی خلاصہ ہے جسمیں سب سے اول اسکندریہ کے کتبخانہ جلائے جانے کے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی کے لاٹن ترجمہ کے ذریعہ سے تمام یورپ میں یہ روایت پہنچی۔ مسٹر گبن اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "جب سے ابو الفرج کی تاریخ لاٹن میں ترجمہ ہو کر دنیا میں شائع ہوئی یہ قصہ بار بار منقول ہوا ہے" وشنگٹن ارونگ و ارتہر گلین ایم اے و مسٹر کریٹن اور بہت سے یورپین مصنفین نے صاف تصریح کی ہے کہ یورپ میں یہ روایت ابو الفرج کے ذریعہ سے پہنچی۔ یہ زمانہ یورپ کے نہایت تعصب اور جہالت کا زمانہ تہا اور اسلیے وہاں مسلمانوں کے متعلق تمام اس قسم کی رِوائتیں صحیح ہوں یا غلط فوراً قبول کر لیجاتی تہیں جسنے مسلمانوں کی نسبت نفرت انگیز خیالات پیدا ہوں۔ غرض یورپ کے ہر حصہ میں یہ قصہ مشہور ہو گیا اور نہایت تیزی سے وہ یورپین لٹریچر کا عنصر

بنگیا۔ اس واقعہ کو جس عبارت میں ابوالفرج[1] نے لکھا ہے اُسکا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

ابوالفرج کی اصل عبارت کا ترجمہ

"اُس زمانہ میں عربوں میں یحییٰ نحوی جو ہماری زبان میں غراماطیقوس کے لقب سے ملقب ہے مشہور ہوا وہ اسکندریہ کا رہنے والا تھا اور یعقوبی عیسائیوں کا عقیدہ رکھتا تھا اور ساوری کے عقیدہ کی تائید کرتا تھا پھر عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے منکر ہوا۔ اسپر مصر میں تمام پادری جمع ہوئے اور اُس سے درخواست کی کہ اس عقیدہ سے باز آئے اُسنے نہ مانا۔ اسپر پادریوں نے اُسکا رتبہ گھٹا دیا۔ وہ بہت دنوں تک زندہ رہا۔ یہاں تک کہ عمرو بن العاص نے اسکندریہ کو فتح کیا۔ وہ عمرو کے پاس حاضر ہوا۔ عمرو آسکی لیاقت سے واقف ہو چکا تھا اسلیے اُسنے اسکی بہت عزت کی اور اُس سے وہ فلسفیانہ بحثیں سُنیں جس سے اہل عرب کبھی آشنا نہ تھے۔ عمرو کے دل پر ان بحثوں نے بہت اثر کیا اور وہ اُسپر فریفتہ ہو گیا۔ عمرو عاقل، خوش فہم، صحیح الفکر شخص تھا اسلیے اُسنے یحییٰ کی صحبت کو لازم پکڑ لیا۔ اور اُسکو اپنے پاس سے جدا نکرتا تھا۔

ایک دن یحییٰ نے عمرو سے کہا کہ اسکندریہ کی تمام قسم کی چیزوں پر آپ قابض ہیں سو جو چیزیں کہ آپ کے کام کی ہیں اُنسے تعرض کرنا نہیں چاہتا لیکن جو چیزیں آپکے کام کی نہیں اُس کے تو ہمیں لوگ زیادہ مستحق ہیں عمرو نے کہا تمکو کیا درکار ہے یحییٰ نے کہا فلسفہ کی وہ کتابیں جو شاہی کتبخانوں میں ہیں۔ عمرو نے کہا اس امر کی نسبت بغیر امیرالمومنین عمر بن الخطاب کی اجازت کے بغیر کوئی حکم نہیں دیسکتا۔ عمرو نے یحییٰ کی درخواست کی اطلاع عمر بن الخطاب کو دی۔ وہاں سے جواب آیا کہ جن کتابوں کا تمنے ذکر کیا ہے اگر وہ خدا کی کتاب کے موافق ہیں تو خدا کی کتاب کے ہوتے اُنکی کوئی ضرورت نہیں اور اگر اُنکے مضامین خدا کی کتاب کے مخالف ہیں تو تم اُنکو برباد کرنا شروع کرو"۔ عمرو بن العاص نے اُن کتابوں کو اسکندریہ کے حماموں میں تقسیم کرنا اور اُنکو جلوانا شروع کیا۔ بس وہ چھ مہینے کی مدت میں جلکر تمام ہوئیں۔ سو جو کچھ ہوا اُسکو سُنو اور تعجب کرو"۔

سب سے پہلے گبن نے اس واقعہ سے انکار کیا

یہ واقعہ اسی طرح برابر تسلیم ہوتا آتا تھا اور کسی کو اسکی نسبت تحقیق و تفتیش کا خیال تک نآیا

[1] دیکھو تاریخ مختصر الدول مصنفہ ابوالفرج مطبوعہ لندن ۱۶۶۳ء صفحہ ۱۸۰ و ۱۸۱۔

سب سے پہلے مشہور مؤرخ گبن نے جو تاریخ کے طرز خاص کا بانی ہے۔ اس واقعہ کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھا اور لکھا کہ "میں اس واقعہ کی اصلیت اور اُسکے نتائج دونوں کے انکار کی طرف مائل ہوں" گبن نے اپنے انکار کی مختلف وجہیں قائم کیں جنمیں سے ایک یہ ہے کہ ابوالفرج واقعہ مبحوث فیہ کے پانسو برس بعد پیدا ہوا اور اُسکے سوا کسی اور مؤرخ نے حتےٰ کہ خود عیسائی مورخوں نے اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اسیلیے ابوالفرج کی شہادت کیونکر معتبر ہو سکتی ہے۔ گبن کے اس انکار کے بعد یورپ خواب غفلت سے چونکا اور متعدد علما اُس کی تحقیق میں مصروف ہوئے۔ اگرچہ گبن کے بعد اس واقعہ کے متعلق دو فریق موافق و مخالف قائم ہو گئے لیکن چونکہ اسقدر عموماً مسلّم تہا کہ پہلی صدی ہجری میں اسلام کے متعلق یورپ میں کوئی تصنیف نہیں لکھی گئی اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے حالات میں آج تک یورپ میں جسقدر تاریخیں لکھی گئیں یا لکھی جارہی ہیں عموماً اسلامی تصنیفات سے ماخوذ ہیں۔ اسیلئے خود اُس فریق کو بھی جو اس واقعہ کو صحیح ثابت کرنا چاہتا ہے عربی ہی تاریخوں کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ مسٹر کرچٹن جنہوں نے گبن کے انکار پر نہایت غصہ ظاہر کیا اپنی کتاب تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں "اگر یہ واقعہ صرف اُس اجنبی شخص (ابوالفرج) کے بیان پر جسنے چھ سو برس کے بعد اس واقعہ کو تحریر کیا مبنی ہوتا تو ہم کو آرمینا کے مؤرخ (ابوالفرج) کے بیان کے تسلیم کرنے میں تامل ہوتا۔ لیکن یہ واقعہ صرف اُنکی سند پر مبنی نہیں ہے بلکہ برخلاف اسکے مقریزی اور عبداللطیف نے جنہوں نے مصر کی تاریخ قدیم پر تصنیفات لکھی ہیں اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ مسٹر کریل نے نہایت انصاف کے ساتھ علانیہ اسکا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "جہاں تک مجھے یاد ہے یہ واقعہ پہلے پہل عبداللطیف کی تاریخ میں جو اس واقعہ کے پانسو برس بعد پیدا ہوا مذکور ہوا ہے۔"

اہل یورپ اس واقعہ کی روایت کو صرف عربی تاریخوں سے ماخوذ بتاتے ہیں۔

اس امر کے طے ہو جانے کے بعد کہ اس واقعہ کا ماخذ جو کچھ ہے صرف عربی تاریخیں ہیں

ہمکو اس بحث کا فیصل کرنا نہایت آسان ہے کیونکہ عرب کی تصنیفات سے واقف ہوجانیکا استحقاق یورپ کی بہ نسبت ہمکو زیادہ ہے وصاحب البیت ادریٰ بما فیھا۔" گھر کا حال گھر کا آدمی خوب جانتا ہے"۔

یورپین مصنفین جنہوں نے اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہا ہے سند میں عبداللطیف بغدادی۔ مقریزی۔ حاجی خلیفہ کا نام لیا ہے اور کہا ہے کہ "یہ مؤرخین نہایت معتبر ہیں اور انکی شہادت سے انکار نہیں کیا جاسکتا"۔ میں نے جہاں تک دیکھا اور پڑھا یورپ نے ہمیشہ انہی مؤرخین کا نام لیا ہے۔ ایک ناواقف انگریز نے ابن خلدون کا بھی حوالہ دیا ہے اور جھوٹ سے شرم نہ کر کے لکھا ہے کہ "ابن خلدون نے حضرت عمرؓ کے حالات میں یہ روایت بیان کی ہے"۔ لیکن ابن خلدون کی تاریخ ایک عام اور مشہور کتاب ہے۔ حضرت عمرؓ کی تمام تاریخ میں اس ذکر کے متعلق ایک حرف بھی مذکور نہیں۔ غرض ابن خلدون کے علیحدہ کرنے کے بعد صرف تین مذکورہ بالا مصنفین پر اس روایت کا مدار رہجاتا ہے۔ اب ہم مورخانہ اُصول سے اس روایت کی تحقیق پر متوجہ ہوتے ہیں جسکے ذیل میں ہم یہ بھی دکھلائینگے کہ یورپین مورخین نے ان مصنفوں سے استناد کرنے میں کسقدر تدلیس اور فریب سے کام لیا ہے۔

واقعات تاریخی کے ثابت کرنے کے دو طریقے ہیں۔ روایت۔ درایت۔ **روایت** سے یہ مطلب ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے اُسکی سند اس شخص تک پہنچائی جائے جو خود اُس واقعہ میں موجود رہا ہو۔ عرب کی تمام مستند تاریخیں اسی اُصول پر لکھی گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُنمیں اَخبرنا وحدثنا کے ذریعہ سے سند کا تمام سلسلہ مذکور کیا جاتا ہے اور اُن تمام راویوں کا نام لیا جاتا ہے جنکے ذریعہ سے واقعہ کی سند اُس شخص تک پہنچتی ہے جو خود اُس واقعہ میں شریک تھا۔ چوتھی صدی تک اسلامی تاریخوں کا یہی طرز رہا اور گو زمانہ مابعد میں اُسکا رواج

کم ہو چلا لیکن گذشتہ تین صدیوں کے واقعات میں ابتک اسکا لحاظ ہے یعنی اُس زمانہ کے اُنہی واقعات کا اعتبار کیا جاتا ہے جو سلسلہ سند کے ساتھ ثابت ہوں۔

درایت سے یہ غرض ہے کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے اُسپر اس لحاظ سے غور کیجائے کہ وہ طبیعت انسانی کے اقتضا۔ زمانہ کی خصوصیتوں۔ منسوب الیہ کے حالات۔ اور اس قسم کے اور قرائن کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟۔ اگر وہ واقعہ اس معیار پر پورا نہیں اُترتا تو اُسکی صحت مشتبہ ہوگی یعنی احتمال ہوگا کہ روایت کے تغیرات سے واقعہ کی صورت بدلدی گئی ہے اس واقعہ کی تحقیق میں بھی ہمکو انہی دو اصول سے کام لینا چاہیئے۔

اس واقعہ کی تحقیق اُصول روایت کے لحاظ سے

چونکہ اس بحث میں مقدمہ کے دو فریقوں میں سے ایک نافی اور دوسرا مثبت ہے اور چونکہ اس قسم کے مقدمات میں بار ثبوت ہمیشہ اُس فریق پر ہوتا ہے جو ثبوت کا مدعی ہو اسلیئے اول ہمکو اُن شہادتوں پر غور کرنا چاہیے جو واقعہ کے اثبات میں پیش کیجاتی ہیں۔ ہمکو جہانتک معلوم ہے (اور ہم دعوی کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ کوئی شخص اس بحث میں اس سے زیادہ تلاش نہیں کرسکتا) یورپ کے تمام مصنفین جو اس دعوی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اُنکی دلیل روایت کی حیثیت سے صرف اسقدر ہے کہ "اس واقعہ کو عبد اللطیف بغدادی۔ مقریزی۔ حاجی خلیفہ نے بیان کیا ہے" اب اُمور تنقیح طلب یہ ہیں کہ کیا ان مصنفوں نے اس واقعہ کے متعلق ایسا کوئی بیان کیا ہے جو شہادت میں پیش ہوسکتا ہے؟ اور کیا اس واقعہ کے متعلق اُنکی شہادت کافی ہے؟ یورپ کے مورخین نے جو اس واقعہ کے مدعی ہیں فریب آمیز طور پر باربار عبد اللطیف مقریزی۔ حاجی خلیفہ کا نام لیا ہے۔ اور جنکو انکار ہے وہ ان مصنفوں کی شہادت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور اس طریق بحث نے اُن یورپین مورخوں کی فریب آمیزی پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ کیونکہ بحث اسپر محدود ہوگئی کہ عبد اللطیف وغیرہ قابل سند ہیں یا نہیں۔ حالانکہ پہلے یہ تحقیق

ضروری تھی کہ عبداللطیف وغیرہ نے کوئی شہادت بھی دی ہے یا نہیں۔

پہلی ضروری بحث یہ ہے کہ کیا ان تینوں مصنفوں کا بیان (جنکا بار بار نام لیا جاتا ہے) تین جداگانہ شہادتیں ہیں؟ مقریزی کی تاریخ مطبوعہ مصر ہمارے پیش نظر ہے اُسنے جلد اول صفحہ ۱۵۱ میں عمود السواری کے بیان میں جو اسکندریہ کا ایک مشہور منارہ ہے عمود السواری کے لفظ سے عنوان قائم کیا ہے اور حرف بحرف وہ عبارت نقل کر دی ہے جو اس مینار کے ذکر میں عبداللطیف نے لکھی تھی۔ عبداللطیف کی تحریر میں محض ضمنی طور پر اسکندریہ کے کتبخانہ کا ذکر آگیا تھا چونکہ مقریزی نے حرف بحرف عبداللطیف کی عبارت نقل کی ہے اسلیے کتبخانہ کے متعلق جو عبارت ہے وہ بھی اُسی طرح منقول ہو گئی ہے۔ اسی بنا پر سیولاٹگل نے جو فرانس کا مشہور عالم ہے مجبورانہ تسلیم کیا ہے کہ مقریزی کا بیان کوئی مستقل شہادت نہیں بلکہ صرف عبداللطیف کے فقرے کی نقل ہے + سیولاٹگل کتبخانہ اسکندریہ کی بحث میں ہمارے مخالف ہیں لیکن اُنکو مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا ہے۔ جن یورپین مورخوں نے مقریزی کی اصل کتاب نہیں دیکھی وہ ایمان بالغیب کے طور پر بار بار مقریزی کا نام لیتے ہیں لیکن سیولاٹگل ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اُسنے مقریزی کی کتاب کو خود پڑھا تھا۔ مقریزی نے اسی کتاب میں اسکندریہ کے فتح کا حال نہایت تفصیل سے لکھا ہے لیکن کتبخانہ کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ واقعہ مذکورہ کو تاریخی واقعات کی فہرست میں شمار نہیں کرتا

مقریزی کے خارج ہونے کے بعد دو نام رہ جاتے ہیں عبداللطیف و حاجی خلیفہ۔ حاجی خلیفہ کا ذکر اگرچہ اکثر یورپین مورخوں نے کیا ہے لیکن اُنکی خاص عبارت کا حوالہ نہیں دیا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو اُنکا دعوی غالباً کمزور ہو جاتا۔ ہم پروفیسر ڈساسی کے جو ایک مشہور

+ دیکھو پروفیسر ڈساسی کا نوٹ ترجمہ تاریخ عبداللطیف بغدادی صفحہ ۲۴۰ مطبوعہ پیرس سنہ ۱۸۱۰ء

فریخ مصنف ہیں اور جو بڑے زور و شور سے اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں) ممنون ہیں جنہوں نے اس راز کو ظاہر کر دیا ہے اور خلیفہ حاجی کی عبارت نقل کر دی ہے جسکے اصلی الفاظ یہ ہیں۔

اہل عرب شروع اسلام میں تمام علوم میں سے بجز لغت و احکام شریعت و طب کے کسی علم کیطرف توجہ نہیں کرتے تھے صرف یہ علوم بوجہ عام حاجت کے بعض لوگوں کے پاس موجود تھے اور اسکا یہ سبب تھا کہ چونکہ اسلام کے قواعد اور لوگوں کے عقائد کے مضبوط و راسخ نہیں ہو چکے تھے اسلئے ڈر تھا کہ قدما کے علوم سے اُنہیں خلل نہ پیدا ہو۔ یہاں تک کہ بیان کیا جاتا ہی کہ اُن لوگوں نے شہروں کے فتوحات میں جو کتابیں پائیں وہ جلادیں۔	فکانت العرب فی صدر الاسلام لا تعتنی بشیء من العلوم الا بلغتها و معرفة احکام شریعتها و صناعة الطب فانها کانت موجودة عند افراد منهم لحاجة الناس طرا الیها۔ وذلک منهم صونا لقواعد الاسلام و عقائد اهله عن تطرق الخلل من علوم الاوائل قبل الرسوخ والاحکام حتی یروی انهم احرقوا ما وجدوا من الکتب فی فتوحات البلاد۔

اس عبارت میں اسکندریہ کا تو ذکر تک نہیں عام طور پر کتابوں کے جلانیکا ذکر کیا ہے اور وہ بھی یروی کے لفظ سے جو ظاہر کرتا ہے کہ وہ ایک عامیانہ روایت ہے۔ اس عبارت کے طرز اور نظام سے ہرگز نہیں پایا جاتا کہ مصنف اس واقعہ کو واقعہ مسلمہ قرار دیتا ہے۔ حاجی خلیفہ شروع زمانہ اسلام کی عدم اعتنا کا ذکر بیان کرتا ہے اور اُسکے ذیل میں ایک عامیانہ روایت کو اُسی عامیانہ حیثیت سے ذکر کر جاتا ہے۔ اسکی بالکل یہی مثال ہے کہ جس طرح کوئی کہے کہ نپولین نے مصر میں اسلامی افسری کا دعوی کرنا چاہا اور اُسکے لیے بڑے جال پھیلائے یہاں تک کہتے ہیں کہ اُسنے جامع ازہر میں کلمۂ توحید پڑھا اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھی" یہ طرز بیان کا ایک

عام طریقہ ہے کہ ایسے موقعوں پر ایک مقرر یا مضمون نگار ضعیف سے ضعیف روایت کا بھی ذکر کر جاتا ہے۔ غرض خاص کتبخانۂ اسکندریہ کے جلائے جانیکا دعوی۔ حاجی خلیفہ کی طرف منسوب کرنا۔ یہی تعجب انگیز جرأت ہے جو یورپین مورخوں کے سوا اور کسی سے نہیں ہوسکتی۔

اب صرف عبد اللطیف بغدادی کی شہادت باقی رہ گئی۔ اور درحقیقت یورپین مورخوں کا اخیر سہارا بھی عبد اللطیف ہے۔ اسکی حقیقت یہ ہے کہ عبد اللطیف نے مصر کی ایک تاریخ لکھی ہے جسکا نام کتاب الافادۃ والاعتبار فی الامور المشاهدة والحوادث المعاینة بارض مصر ہے۔ یہ کتاب اُسنے شعبان ۶۰۰ھ میں تمام کی اور اسکا موضوع صرف وہ حالات و واقعات ہیں جو عبد اللطیف نے خود مصر میں مشاہدہ کیئے۔ اسمیں ایک موقع پر عمود السواری کی لفظ سے ایک عنوان قائم کیا ہے اُسکے تمام حالات بیان کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اس ستون کے گرد چارسو اور چھوٹے چھوٹے ستون تھے۔ یہ حالات لکھتے لکھتے اخیر میں ضمناً یہ عبارت لکھی ہے

عبد اللطیف کی اصل عبارت

ويذكر ان هذا العمود من جملة اعمدة كانت تحمل رواق ارسطاطاليس الذي كان يدرس به الحكمة وانه كان دار علم وفيه خزانة كتب احرقها عمرو بن العاص باشارة عمر بن الخطاب

اور کہا جاتا ہے کہ یہ ستون منجملہ اُن ستونوں کے ہے جسپر وہ چھت قائم تھی جو ارسطو کا رواق تھا اور جہاں ارسطو حکمت کا درس دیا کرتا تھا اور یہ کہ وہ دار العلم تھا اور اسمیں وہ کتبخانہ تھا جسکو عمرو بن العاص نے عمرؓ بن الخطاب کے اشارہ سے جلا دیا۔

اس عبارت سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ عبد اللطیف نے اس واقعہ کو کس حیثیت سے ذکر کیا ہے عبد اللطیف کا یہ تمام قول یُذکر کے تحت میں ہے جس سے کسی طرح یہ ظاہر نہیں

سلہ ایک نسخہ میں جو مصر کا چھپا ہوا ہے اور نہایت غلط چھپا ہے بجائے یُذکر کے اسی کا لفظ ہے۔ اگر یہی نسخہ صحیح مان لیا جائے تو بھی یہ عبد اللطیف کی ذاتی رائے ہوگی۔

ہوسکتا کہ وہ اس موقع کو مورخانہ حیثیت سے لکھتا ہے یا اُسکو تسلیم کرتا ہے۔ مسٹر کریل جرمنی اپنے مضمون میں عبد اللطیف کا قول نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں " یہ بیان محض علی سبیل التذکرہ معلوم ہوتا ہے اور اس سے خاص کوئی غرض نہیں معلوم ہوتی۔ یہ کسی خاص اصل قصہ کا یاد دلا نہیں ہے بلکہ محض ایک مشہور بات کا اعادہ کر دینا ہے جسکو اُس زمانہ کے سیاحوں نے بارہا کہا ہے اور یہ من قبیل اُسی قسم کی غیر معتبر اور خلاف عقل بیانات کی ہے جو زمانہ وسطے کے سیاحوں میں بیت المقدس کے مقام کے بارہ میں مشہور تھے "

ایک مزے کی بات یہ ہے کہ عبد اللطیف نے چونکہ بازاری گپوں کا ذکر کیا اس لیئے اس جملہ میں جتنے واقعات بیان کیے اتفاق سے سب غلط تھے۔ نہ یہ مقام ارسطو کا رواق تہا نہ ارسطو نے کبھی وہاں درس دیا ایک مضمون نگار نے جسنے اسپیکٹیٹر مورخہ ۱۲۔ جون میں اس مضمون پر ایک بحث لکھی ہے عبد اللطیف کے بیان کی غلطی پر عجیب لطف سے استدلال کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کتبخانہ کا جلایا جانا تو ایک طرف عبد اللطیف نے اسکے ساتھ اور جو واقعات بیان کیے وہ کونسے سچ ہیں !!!

یہ ہے حقیقت اُن سندوں اور روایتوں کی جنپر یورپین مورخوں نے ہوائی قلعے چہا رکھی ہے۔ ان مصنفوں نے اس بحث میں جس قسم کی تدلیس سے کام لیا ہے حقیقت میں وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ عبد اللطیف وغیرہ کی جو اصل عبارتیں ہمنے نقل کی ہیں اُنسے ناظرین کو معلوم ہوسکتا ہے کہ مقریزی نے خود اس واقعہ کو نہیں بیان کیا بلکہ عمود السواری کے ذکر میں عبد اللطیف کی عبارت نقل کر دی ہے جسمیں ضمناً کتبخانہ کا بھی ذکر تہا۔ حاجی خلیفہ نے اسکندریہ کا نام تک نہیں لیا البتہ عام طور پر کتب خانوں کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی عیاذ کمہ کے تحت میں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کوئی مصدقہ روایت نہیں لیکن یورپین مورخوں

یورپین مورخوں کی تدلیس اور فریب دہی

نے عبداللطیف وغیرہ کا نام ہمیشہ اس حیثیت سے لیا ہے کہ گویا انہوں نے اس واقعہ کی صحت کا دعوی کیا ہے اور اُسپر کوئی مستقل مضمون لکھا ہے۔

پروفیسر ڈساسی نے اپنے نوٹ میں لکھا ہے کہ جو اعتراضات ابوالفرج کے بیان پر کیے جاتے ہیں نہیں یہ نہایت قوی اعتراض خیال کیا جاتا ہے کہ عرب کے سورخ ایک ایسے عظیم واقعہ کے متعلق خاموش ہیں"۔ اسکے بعد پروفیسر ڈساسی اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ "لیکن اس اعتراض کا زور یقیناً عبداللطیف اور مقریزی کی شہادت کے بعد گھٹ جاتا ہے" لطف یہ ہے کہ اسی عبارت کے بعد پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ اگرچہ لوگوں کو اس کہنے کا موقع حاصل ہے کہ مقریزی کا قول صرف عبداللطیف کے فقرہ کی نقل ہے"۔

مسٹر کرچٹن لکھتے ہیں کہ "یہ واقعہ صرف سند مذکورہ بالا (یعنی ابوالفرج کا بیان) پر مبنی نہیں ہے بلکہ برخلاف اسکے مقریزی اور عبداللطیف نے جنہوں نے قدیم تاریخ مصر پر تصنیفات لکھیں اس واقعہ کا بیان کیا ہے"۔

پروفیسر وایٹ نہایت بلند آہنگی سے فرماتے ہیں کہ ہم گبن کی سفیانہ دلیل کے مقابلہ میں دو عربی سورخوں کی اثبانی شہادت پیش کرنے کی جرأت کرینگے جو ایسے مستند مصنف ہیں کہ اُنکے مستند ہونے کی نسبت کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ اور دونوں مذہب اسلام کے نہایت متعصب پیرو ہیں اس سے عبداللطیف و مقریزی کو مراد لیتا ہوں جو اس واقعہ یعنی کتبخانہ کے جلانے کے ذکر ہی میں ہمزبان نہیں ہیں بلکہ ٹھیک اُس مقام کا نشان دیتے ہیں جہاں کتبخانہ مذکور قائم تھا"۔

پروفیسر وایٹ نے اس موقعہ پر کس چالاکی سے کام لیا ہے۔ عبداللطیف نے ایک

ستون کے ذکر میں ضمناً افواہی طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے پروفیسر وایٹ اُسکو اس قالب میں ڈہالتے ہیں جس سے ایک ناواقف شخص کو یہ گمان ہوگا کہ عبداللطیف نے مستقل طور پر اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہا ہے اور صرف اصل واقعہ کو ثابت نہیں کیا بلکہ واقعہ کا موقع و محل بہی متعین کردیا!!!

اگرچہ یورپ کے اکثر مورخوں نے جو اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ صرف انہی تینوں یعنی عبداللطیف۔ مقریزی۔ حاجی خلیفہ پر استناد کا مدار رکہا ہے۔ اور ہم نے اس موقع پر انہی مصنفوں سے بحث کی لیکن بعض یورپین مصنفوں نے تدلیس (مخفی فریب) کے میدان میں اوروں سے بڑہ کر قدم رکہا ہے اور فریب آمیز طور پر ظاہر کیا ہے کہ اس واقعہ کی تائید کے لیے اور بہی متعدد شہادتیں موجود ہیں۔ مسٹر کرچٹن صاحب اپنی کتاب کے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ "بیرن ڈساسی نے اپنے ایک لمبے نوٹ میں جو اُسنے عبداللطیف کے ترجمہ پر لکہا ہے (مصر کا بیان صفحہ ۲۴۰) عربی مصنفوں کی کتابوں سے مختلف شہادتیں جمع کی ہیں جو پیرس کے شاہی کتبخانہ میں موجود ہیں۔ اور ان شہادتوں سے ابوالفرج کا بیان قابلِ اعتبار ثابت ہوتا ہے لیکن مغرور گبن نے ان تصنیفات کو نہیں دیکہا تہا"

اس عبارت سے ایک ناواقف اور خصوصاً وہ جسکو یورپین مصنفوں کے ساتہ عام خوش اعتقادی ہو بالکل دہوکے میں آجائیگا اور یقین کریگا کہ پیرس کے عظیم الشان کتبخانہ میں ضرور اس واقعہ کے متعلق بہت کچہ مادہ موجود ہوگا ورنہ تمام یورپ میں ایسا غلط واقعہ کیونکر مشہور ہو سکتا تہا

لیکن ہمارے ناظرین کو پیرس کے پرشوکت نام سے مرعوب نہونا چاہیے۔ ڈساسی کا نوٹ اور وہ کتابیں جنکا اُنہوں نے حوالہ دیا ہے ہمارے سامنے ہیں بے شبہ ڈساسی نے

اس واقعہ کو بڑے زور شور سے ثابت کرنا چاہا ہے لیکن افسوس ہے کہ جو زور اُنکی طبیعت میں ہے وہ دلائل میں نہیں۔ ہم اس موقع پر اُنکی پوری تحریر کا لفظی ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

ابوالفرج نے اپنی تاریخ خاندان عرب میں عمرؓ کے حکم سے کتبخانہ اسکندریہ کی بربادی کی نسبت جو واقعہ بیان کیا ہے اُسمیں متعدد مشہور مصنفوں نے شک کیا ہے۔ جو کچھ اس واقعہ پر لکھا گیا ہے اُسکے بیان کرنے اور اُسکی حیثیت کے اندازہ کرنے میں ایک بڑی بحث ضرور ہونی چاہیئے۔

وہ دلیلیں جنکی بنا پر شکوک کیے گئے ہیں اُس جرمن مباحثہ میں مل سکتی ہیں جسکو Meh Rainhard- نے سنہ ۱۷۹۲ع میں بمقام Gottingue- چھاپا تھا اور اُن ریمارکوں میں جو اسکندریہ کے قدیم کتبخانوں کے متعلق ہیں جنکو M. de Saint Croix- نے میگزین انسائیکلوپیڈیا سال ۵ نمبر ۴ صفحہ ۴۳۲ میں درج کیا ہے۔ مسیو لانگل M. Langlee اور وائٹ White- عام خیال کی حمایت کرتے ہیں لیکن ابوالفرج کے مبالغہ آمیز بیان کو قبول نہیں کرتے۔

ابوالفرج کے بیان پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں اُنمیں یہ اعتراض قوی خیال کیا گیا ہے کہ عرب کے مورخ ایک ایسے عظیم واقعہ کے متعلق خاموش ہیں۔ لیکن اس اعتراض کا زور یقیناً عبداللطیف اور مقریزی کی شہادت کے بعد گھٹ جاتا ہے اگرچہ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بظاہر مقریزی کا وہ فقرہ جیسا کہ مسیو لانگل نے نشان دیا ہے صرف عبداللطیف کے فقرہ کی نقل ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ اُن ریمارکوں سے جنکو کہ میں بیان کرونگا ایک ایسے عالم مصنف (مسیو لانگل مراد ہے) کے ساتھ میدان مباحثت میں آؤں جسکی میں تہ دل سے نہایت عزت اور محبت رکھتا ہوں لیکن میں نے چند اور نئی خاص سندیں پیدا کی ہیں اور میں یقین کرتا ہوں کہ یہ واقعہ جس طرح کہ ابوالفرج نے بیان کیا ہے گو نہیں ایسی تفصیلیں ہیں جو نکتہ چینی کی برداشت نہیں کر سکیں تاہم یہ سچ ہے کہ وہ ایک تاریخی سچائی پر مبنی ہے۔ اور یہ کہ عربوں نے جب یہ شہر فتح کر لیا تھا تو عمرو بن العاص نے عمرؓ کے فرمان کے

مطابق یہ حکم دیا تھا کہ ایک مجموعہ جسمیں بہت سی کتابیں تھیں اور جو اسکندریہ میں تھا آگ پر رکھدیا جائے۔"

اسکے بعد پروفیسر ڈساسی نے حاجی خلیفہ اور مقدمۂ ابن خلدون کی عبارت نقل کی ہے اور اُس سے کتبخانہ اسکندریہ کے واقعہ پر استدلال کیا ہے۔

پروفیسر ڈساسی نے جو نئی خاص سندیں پیدا کیں اُنکے دیکھنے کا ہمکو نہایت شوق تھا مگر افسوس کہ وہ کچھ نہ نکلیں۔ پروفیسر موصوف نے پیرس کے اتنے بڑے عظیم الشان کتبخانہ کو چھانکر صرف دو سندیں مہیا کیں۔ ایک تو وہی حاجی خلیفہ کی عبارت جسکو ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ دوسری مقدمہ ابن خلدون کا ایک فقرہ جسمیں ایک موقع پر ضمناً اور اجمالاً ایران کے کتبخانہ کا ذکر آگیا ہے۔ یہ بھی عجیب منطق ہے کہ اسکندریہ کے کتبخانہ کے جلائے جانے کا دعوی کیا جائے اور دلیل میں ایران کا نام لیا جائے۔ اگرچہ ابن خلدون کا یہ قول بالکل غلط اور تمام صحیح اور مستند تاریخوں کے خلاف ہے لیکن ہم اس مقام پر اس سے بحث نہیں کرتے کیونکہ ہمارا مضمون اسکندریہ کے کتبخانہ پر ہے نہ ایران پر۔

شاید یہ کہا جائے کہ پروفیسر ڈساسی نے ابن خلدون کے قول کو تائیدی شہادت میں پیش کیا ہے۔ لیکن اُس سے یہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ اُس سے اگر کوئی نتیجہ نکلتا ہے تو یہ نکلتا ہے کہ اسکندریہ کا واقعہ بالکل بے اصل ہے ورنہ جس طرح ایران کا واقعہ ابن خلدون نے بیان کیا تھا کوئی نہ کوئی عربی مؤرخ اسکندریہ کے واقعہ کا بھی اسی حیثیت سے ذکر کرتا حالانکہ عربی کی سیکڑوں ہزاروں تاریخوں میں سے ایک میں بھی اُسکا پتہ نہیں چلتا۔

عبداللطیف و مقریزی کی اصل عبارت جو ہم نے نقل کی وہ تو کسی طرح شہادت میں پیش نہیں کی جاسکتی لطف یہ ہے کہ خود ابوالفرج جو اس بحث میں ہمارا مدعا علیہ ہے اُسنے بھی اس واقعہ کو اس حیثیت سے نہیں لکھا جس سے ثابت ہو کہ وہ یقیناً اُسکو تسلیم کرتا تھا اور صحیح سمجھتا تھا

ابوالفرج کی اصلی تاریخ جو سریانی زبان میں ہے اور جس میں فتح اسکندریہ کا حال تفصیلاً مذکور ہے اُسمیں اس واقعہ کا ذکر تک نہیں۔ البتہ اُس تاریخ کا خلاصہ جو عربی زبان میں ہے اُسمیں یہ قصہ جیسا کہ ہم اُوپر نقل کر آئے مذکور ہے لیکن اُس خلاصہ کی نسبت کافی اطمینان نہیں ہے کہ جو باتیں اُسمیں اصل سریانی تاریخ پر اضافہ کیے گئے ہیں وہ درحقیقت ابوالفرج ہی کے ہیں یا کسی اور نے الحاق کر دیا ہے۔ مسٹر کریل جرمنی اس خلاصہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ اسمیں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو اصل سریانی میں نہیں۔ اور یہ امر کہ آیا یہ مقامات زمانہ مابعد کے الحاق ہیں یا خود ابوالفرج نے انکو بڑھایا ہے بخوبی معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اُس خلاصہ کے کل نسخے ناکامل ہیں۔ یہ واقعہ کتبخانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا جو عربی میں موجود ہے اصل سریانی میں نہیں پایا جاتا اس عبارت کے الحاقی ہونیکا گمان اس سے زیادہ قوی ہو جاتا ہے کہ اس عربی خلاصہ کو پروفیسر پوکاک نے اپنے اہتمام و تصحیح سے چھپوایا ہے اور انکو مسلمانوں کے خلاف واقعات گڑھ لینے میں نہایت کمال حاصل تھا۔

یہ تمام بحث تو اس لحاظ سے تھی کہ عبداللطیف و حاجی خلیفہ نے اس واقعہ کے متعلق کوئی شہادت دی بھی ہے یا نہیں لیکن بطریق تنزل اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ درحقیقت ان مصنفوں نے اسکو صحیح تسلیم کیا ہے تو دوسری بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ اس امر کے متعلق ان مصنفوں کی شہادت قابل اعتبار ہے یا نہیں۔ عبداللطیف بغدادی ۵۵۷ھ میں پیدا ہوا۔ اور حاجی خلیفہ کو تو دو سو برس سے زیادہ نہیں گذرے کون شخص کہہ سکتا ہے کہ ایک ایسے واقعہ کے متعلق جو پہلی صدی ہجری کے شروع میں واقعہ ہوا ہو وہ شہادت معتبر ہو سکتی ہے جسکو ان لوگوں نے بیان کیا ہو جو اصل واقعہ کے پانسو برس بعد پیدا ہوئے اور جنکی ان لوگوں نے نہ کوئی سند بیان کی ہو نہ کوئی حوالہ دیا ہو۔

عبداللطیف وحاجی خلیفہ کا تاریخ میں کیا رتبہ ہے۔

ہمکو ان مصنفوں کی نسبت یہ بھی دیکھنا ہے کہ فن تاریخ میں انکو کیا رتبہ حاصل ہے۔ کیونکہ یورپین مورخوں نے اس موقع پر بھی تدلیس سے کام لیا ہے۔ وہ بڑے بڑے شاندار لفظوں میں حاجی خلیفہ اور عبداللطیف کی تعریف کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اُنکی عظمت وشان کے لحاظ سے اُنکا قول ضرور تسلیم کے قابل ہے۔ یورپین مصنفوں کے اس فریب کی پردہ دری کیلئے صرف ایک مختصر سا سوال کافی ہے۔ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عبداللطیف وحاجی خلیفہ بڑے پایہ کے مصنف ہیں مگر سوال یہ ہے کہ کس فن میں؟ عبداللطیف بے شبہ بہت بڑا طبیب تھا طب میں اُنکی متعدد تصنیفات موجود ہیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں اُسکا مفصل تذکرہ لکھا ہے جس سے اُنکی طبی معلومات اور عظمت شان کا اندازہ معلوم ہو سکتا ہے لیکن کیا اُسکو کسی نے مورّخ کہا ہے؟ کیا اُسنے اپنی لائف میں کہیں فن تاریخ کا تذکرہ کیا ہے اگر یہ نہیں ہے تو تاریخی واقعات میں اُنکی عظمت وشان کس کام آئیگی۔ فارابی و بوعلی سینا کے حوالہ سے اگر کوئی تاریخی واقعہ لکھا جاے تو کس حد تک اعتبار کے قابل ہوگا۔

حاجی خلیفہ نے بے شبہ کشف الظنون نہایت مفید کتاب لکھی ہے لیکن وہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ اسلامی تصنیفات کی فہرست ہے۔ اسکے سوا حاجی خلیفہ کا کوئی کارنامہ ہمکو معلوم نہیں۔ تاریخ میں نہ اُنکی کوئی کتاب ہے نہ کسی نے اُسکو مورخوں میں شمار کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مخالفوں کے لیے یہ نہایت شرم کی جگہ ہے کہ اُنکو ایک ایسے عظیم الشان واقعہ کے لیے جو بخیال اُنکے چھ مہینے تک قائم رہا۔ اسلام کی سیکڑوں ہزاروں تصنیفات میں سے کہیں کوئی سہارا ہاتھ نہ آے اور بمجبوری اُنکو ایک طبیب اور فہرست نگار کے سایہ میں پناہ لینی پڑے۔

یہاں تک ہم نے جو بحث کی وہ اس حیثیت سے تھی کہ ہم نے مخالفین کو مدعی قرار دیا تھا کیونکہ اُصول مناظرہ کی رو سے درحقیقت وہی مدعی ہیں۔ لیکن اس سے بڑھ کر ہم خود مدعی بنتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے حکم سے یہ کتبخانہ برباد نہیں ہوا اور نہ کبھی مسلمانوں نے اسکو برباد کیا۔ لیکن پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو دعوی نفی کی صورت میں کیا جاتا ہے اُسکی لیے روایتہً و درایتہً استدلال کا کیا طریقہ ہے۔ مثلاً اگر یہ دعوی کیا جائے کہ فلاں واقعہ فلاں عہد میں نہیں ہوا۔ تو اسکی دلیل روایت کے لحاظ سے صرف یہ ہوگی کہ اُس عہد کے متعلق علم و واقفیت کے جسقدر ذریعے ہیں اُنسے اُس واقعہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اور درایت کے لحاظ سے یہ کہ تمام قرائن اور شہادتیں اُس واقعہ کے ثبوت کے خلاف ہیں۔ انہی وجوہ استدلال کی لحاظ سے ہم دعوی کرتے ہیں کہ کتبخانہ اسکندریہ مسلمانوں کے ہاتھ سے ہرگز برباد نہیں ہوا۔

واقعہ مفروضہ کے غلط ہونیکا دعوی اور نفی کے دعوی کا طرز ثبوت۔

اسلام میں تصنیف و تالیف کی ابتدا سنہ ۱۴۳ھ سے ہوئی اور اسی زمانہ میں تاریخ کی سب سے پہلی کتاب محمد بن اسحق نے لکھی جو آنحضرتؐ کے حالات میں ہے۔ اسکے بعد اور مصنفین نے عام تاریخیں لکھیں جنہیں خلفائے راشدین کی فتوحات و واقعات تفصیل سے مذکور ہیں۔ اسی دور کی تصنیفات میں سے آج جو موجود ہیں یا جنکا نام و نشان معلوم ہے یہ ہیں۔

اسلام کی ابتدائی تاریخیں

فتوح البلدان بلاذری۔ بلاذری خلیفہ متوکل باللہ کے عہد میں تھا۔ اس تاریخ میں اُسنے تمام واقعات سند متصل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

تاریخ یعقوبی۔ یعنی تاریخ احمد بن ابی یعقوب بن جعفر بن وہب بن وضح کاتب العباسی۔ یہ مصنف نہایت قدیم مصنف ہے اور مامون الرشید کے درباریوں کا ہمعصر ہے اُسنے یہ تاریخ سنہ ۲۵۹ھ تک لکھی ہے اور غالباً اُس سنہ میں وہ موجود تھا۔ یہ کتاب ۲ جلدوں میں ہے اور سنہ ۱۸۸۳ء میں بمقام لیڈن چھاپی گئی۔

تاریخ ابوحنیفہ دینوری۔ لیڈن میں چھاپی گئی ہے۔

تاریخ کبیر ابوجعفر جریر طبری۔ یہ تاریخ اگرچہ مذکورہ بالا تاریخوں سے کسی قدر زمانہ مابعد کی ہے کیونکہ اسکے مصنف نے سنہ ۳۱۰ ہجری مطابق سنہ ۹۲۲ء میں وفات پائی ہے لیکن اسنے تمام واقعات سند متصل کے ساتھ لکھے ہیں اور ہر روایت میں تمام راویوں کے نام بیان کر دیئے ہیں۔ یہ کتاب تمام اُن روایتوں کا مخزن ہے جو تاریخ اسلام کے متعلق آج موجود ہیں یا کبھی موجود تھیں۔ اور اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ تین سو صدیوں کے متعلق جو معتدبہ واقعہ اس کتاب میں نہیں ہے وہ داخل تاریخ نہیں۔ یہ ایک نہایت ضخیم کتاب ہے اور اُسکی ۲۳ جلدیں ہالینڈ میں چھپ چکی ہیں اور متعدد جلدیں اور باقی ہیں۔

ابن الاثیر و ابن خلدون جنکی تاریخیں نہایت معتبر خیال کی جاتی ہیں وہ تاریخ طبری ہی کا خلاصہ ہیں۔ اور خود ان مورخوں نے اسکا اعتراف کیا ہے۔ ان تاریخوں کے سوا تاریخ اسلام کے متعلق اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں لیکن قدیم واقعات کی نسبت اُن سب کا ماخذ یہی چند کتابیں ہیں جنکا ذکر اوپر ہو چکا اور یہ صریح طور پر خود اُن کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

ان کتابوں کے سوا مصر و اسکندریہ کے خاص حالات میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں انمیں سے جسقدر ہم دریافت کر سکے یہ ہیں۔ خطط مصر لابی عمر الکندی المتوفی سنہ ۲۴۶ھ۔ کشف الممالک لابن شاہین المتوفی سنہ ۳۸۵ ہجری۔ تاریخ مصر لعبد الرحمن الصوفی المتوفی سنہ ۳۴۷ ہجری۔ تاریخ مصر لمحمد بن برکات النحوی المتوفی سنہ ۵۲۰ھ اتعاظ المتامل الی سنہ ۵۲۰ھ تاریخ مصر لمحمد بن عبداللہ المتوفی سنہ ۶۲۰ھ۔ تاریخ مصر للقفطی المتوفی سنہ ۶۴۶ھ۔ تاریخ مصر لقطب الدین الحلبی المتوفی سنہ ۷۳۵ ہجری تاریخ مصر لیحیی الحلبی المتوفی سنہ ۶۴۰ ہجری۔ الانتصار لابن دقماق المتوفی سنہ ۸۰۹ھ۔ عقود الجواہر

نزہۃ الناظرین۔ الدرۃ المضیئۃ۔ اشرف الطرف۔ نزہۃ السنیۃ۔ تفریح الکربۃ۔ فرائد السلوک۔ بدایع الزہور۔ تحفۃ الکرام باخبار الاحرام۔ اعلام بمن ولی مصر فی الاسلام۔ تاریخ مصر لابراہیم بن وصیف۔ جواہر البحور۔ مختار للقضاعی۔ النقط المعجم۔ الروضۃ البہیۃ۔ المواعظ والاعتبار للمقریزی۔ جواہر الانفاظ۔ اتعاظ الحنفا۔ نجوم الزاہرۃ۔ تاریخ مصر لابن عبد الحکم۔ اگرچہ یہ تمام کتابیں آج نہیں ملتیں لیکن زمانہ مابعد کی متعدد تصنیفات ایسی موجود ہیں جنہیں تمام قدیم کتابوں کی روایتیں جمع کردی گئی ہیں شلاً حسن المحاضرۃ سیوطی۔ جسکے دیباچہ میں خود سیوطی نے لکھا ہے کہ میں نے اٹھائیس تاریخیں دیکھیں اور انسے یہ کتاب طیار کی۔ سب سے مفصل اور بسیط مواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار ہے جو مقریزی کی تصنیف ہے اور جسمیں مصر واسکندریہ کے متعلق ایک ایک جزئی واقعہ کا استقصا کیا گیا ہے۔

یہ تمام معتبر کتابیں جنکا ذکر اوپر ہوا اور جنکے سوا اُس زمانہ کے حالات دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ انمیں سے کسی کتاب میں واقعہ مبحوث فیہ کا مطلق پتہ نہیں چلتا۔ ان کتابوں میں اور خصوصاً طبری و فتوح البلدان بلاذری و حسن المحاضرۃ و خطط والآثار للمقریزی میں اسکندریہ کی فتح کے نہایت تفصیلی حالات مذکور ہیں لیکن کتبخانہ کا ذکر تک نہیں۔

یہ کتابیں تو وہ ہیں جنہیں اس واقعہ کو (اگر وہ واقع ہوتا) مستقل طور پر مذکور ہونا چاہئے تھا۔ لیکن جن تصنیفات میں ضمنی اور اتفاقی طور پر اسکا تذکرہ آسکتا تھا انمیں بھی واقعہ مفروضہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ مثلاً حکما اور طبیبوں کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں اور جنمیں یحیی نحوی کا ذکر عموماً کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابوالفرج نے یہ فرضی قصہ جو گڑھا تو اسی یحیی نحوی کے تذکرہ میں گڑھا اور یوں بیان کیا کہ یحیے نے عمرو بن العاص سے کتبخانہ کے لیے درخوست کی تھی جسکے جواب میں عمرو نے حضرت عمرؓ کے حکم سے کتبخانہ کے جلا دینے کا حکم دیا۔ یحیی طبیب اور فلاسفر تھا اور عربی

زبان میں اُنکی تمام کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ اسلئے عربی تاریخیں جو حکما اور اطبا کے حالات میں ہیں اُنمیں یحییٰ کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔ ابن ابی اُصیبعہ نے طبقات الاطبا۔ اور ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں یحییٰ کے تمام حالات و واقعات اور اُسکی تصنیفات کے نام لکھے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عمرو بن العاص کے پاس حاضر ہوا اور عمرو نے اُسکی بہت کچھ عزت کی۔ ابن الندیم کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

ولما فتحت مصر علی یدی عمرو بن العاص دخل الیہ اکرمہ ورای لہ موضعا۔ یعنی جب مصر عمرو بن العاص کے ہاتھ سے فتح ہوا تو یحییٰ عمرو کی خدمت میں حاضر ہوا عمرو نے اُسکی عزت و تکریم کی۔ ان تمام تصریحات کے ساتھ کتبخانہ کا کہیں ذکر نہیں جس سے علانیہ اس واقعہ کا بالکل بے اصل ہونا پایا جاتا ہے۔

ان تصنیفات کے علاوہ اور قسم کی تصنیفات مثلاً جغرافیوں، سفرناموں، بیوگرفیوں میں اس واقعہ کا ذکر ضمناً آسکتا تھا لیکن ان موقعوں میں اُسکا نام و نشان تک نہیں۔ سچ یہ ہے کہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو بالکل سچ ہے کہ عبد اللطیف کی عبارت کے سوا جسکی حقیقت ہم اوپر بیان کر چکے **کل اسلام کا لٹریچر اس واقعہ کے ذکر سے خالی ہے!!** اس سے زیادہ اس واقعہ کے بے اصل ہونے کی کیا دلیل ہوگی؟۔

اس سے بڑھکر یہ کہ خود عیسائی قدیم تاریخوں میں اُسکا پتہ نہیں۔ یوسکس المتوفی ۹۴۰ء جو دسویں صدی عیسوی میں اسکندریہ کا بطریق تھا اُسنے اسکندریہ کی فتح کا حال تفصیل سے لکھا ہے۔ اسی طرح المکین جو واقعہ مفروضہ کے تین سو برس بعد تھا یعنی ابوالفرج سے دو سو برس پہلے اُسنے تاریخ مصر خود مصر میں رھکر لکھی اور اسکندریہ کے فتح کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے لیکن اُن دونوں کتابوں میں واقعہ مفروضہ کے متعلق ایک حرف بھی مذکور نہیں۔ یہ دونوں

مصنف متعصب عیسائی تھے جنکی بنسبت مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی بیجا طرفداری کا گمان نہیں ہوسکتا۔ اسکے ساتھ محقق اور علم دوست تھے اور اُنکی نگاہ میں اتنے بڑے علمی سرمایہ کا ضائع ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہوسکتی تھی۔ مصر کے قیام اور ذاتی شوق کی وجہ سے مصر کے حالات کے متعلق اُنکے وسائلِ معلومات نہایت وسیع تھے ان باتوں کے ساتھ ان دونوں مورخوں کا واقعہ مبحوث فیہ کے متعلق ایک حرف نہ لکھنا صریح اسباب کی دلیل ہے کہ اسکی کچھ اصل نہیں۔ چنانچہ انصاف پسند یورپین مصنفوں شلاً گبن۔ کریل۔ نے اس واقعہ کے بے اصل ہونے کے لیے عموماً اس سے استدلال کیا ہے۔

اس واقعہ کے بے اصل ہونے کی ایک نہایت قوی دلیل یہ ہے کہ جس کتبخانہ کا جلایا جانا بیان کیا جاتا ہے وہ اسلام کے دَور سے پہلے ہی برباد ہوچکا تھا۔ اسکی حقیقت یہ ہے کہ یہ کتبخانہ شاہانِ مصر نے جو بُت پرست اور بہت سے خداؤں کے ماننے والے تھے قائم کیا تھا۔ جب مصر میں عیسائیت کا دَورہ ہوا تو عیسائی بادشاہوں نے تعصب مذہبی کی وجہ سے ان کتابوں کی بربادی شروع کی اور اُن کے اس ارادہ کو پادریوں نے اور بھی اشتعال دیا۔

چنانچہ یورپ کے بڑے بڑے نامور مصنفوں اور مورخوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ کتبخانہ اسلام سے پہلے برباد ہوچکا تھا۔ سوریان جو فرانس کا ایک مشہور عالم ہے اُسنے ایک دفعہ یونیورسٹی میں اس عنوان پر لکچر دیا تھا "اسلام اور علم"۔ یہ لکچر ایک رسالہ کی صورت میں بمقام پیرس ۱۸۹۳ء میں چھپا ہے۔ اگرچہ یہ لکچر مسلمانوں کے برخلاف نہایت تعصب آمیز تھا یعنی اُنہیں نہایت شدومد سے یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام اور علم کبھی جمع نہیں ہوسکتے تاہم اس متعصب شخص نے کتب خانہ سکندریہ کے متعلق یہ الفاظ کہے "اگرچہ یہ بار بار کہا گیا ہے کہ عمرو نے کتبخانہ اسکندریہ کو برباد کرا دیا لیکن یہ صحیح نہیں۔ کتبخانہ مذکور اس زمانہ سے پہلے ہی برباد ہوچکا تھا"۔

اس شاہی کتبخانہ کی تفصیلی کیفیت مسٹر کرِل نے اپنے مضمون میں لکھی ہے اور اُسکے عہد بعہد کی بربادی کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے۔ لیکن چونکہ مسٹر کرِل کا مضمون ہمارے رسالہ کے اخیر میں بطور ضمیمہ شامل ہے اس لیے ہم اُسکو یہاں نقل نہیں کرتے۔ اس کتبخانہ کا برباد ہونا ایسا یقینی امر ہے جس سے وہ یورپین مورخین بھی انکار نہیں کرسکے جو اس واقعہ کے اثبات کے درپئے ہیں۔ مسٹر ڈریپر اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جولیس سیزر نے نصف سے زیادہ کتابیں جلادی تھیں۔ اور اسکندریہ کے بطریقوں نے نہ صرف قریباً کل باقی کتابوں کے منتشر ہونے کی اجازت دی بلکہ اپنی نگرانی میں اُنکو منتشر کرایا۔ اور دسیس صاف بیان کرتا ہے کہ بیس سال بعد اس واقعہ کے تھیوفلس نے شہنشاہ تھیوڈوسس سے تحریری اجازت کتبخانہ مذکور کی بربادی کی حاصل کی تھی۔ میں نے اُسکی الماریاں اور خانے خالی دیکھے"۔

چونکہ اس کتبخانہ کی بربادی یقینی امر تھا اس لیے مخالفوں نے ایک اور فریب سے کام لیا یعنی یہ دعویٰ کیا کہ عمرو نے جو کتب خانہ تباہ کیا وہ شاہی کتبخانہ نہ تھا۔ بلکہ سراپیم کا کتبخانہ تھا چنانچہ اسپکٹیٹر کے مضمون نگار نے ابوالفرج کی حمایت میں سراپیم ہی کے کتبخانہ کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ توجیہ القول بما لا یرضیٰ قائلہ ہے کیونکہ ابوالفرج نے اپنی تاریخ میں جہاں یہ لکھا ہے کہ یحییٰ نحوی نے عمرو بن العاص سے کتابوں کے لیے درخوست کی وہاں صاف یہ الفاظ لکھے ہیں کتب الحکمۃ التی فی خزائن الملوکیۃ یعنی فلسفہ کی وہ کتابیں جو شاہی خزانوں (کتبخانوں) میں ہیں"۔ لیکن اگر تسلیم ہی کرلیں کہ یہ حکایت سراپیم کے کتبخانہ کی نسبت ہے تاہم ہمارے مخالفوں کو یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ سراپیم کا کتبخانہ فتح اسکندریہ کے وقت موجود تھا بلکہ برخلاف اسکے یہ ثابت ہوگا کہ کتبخانہ مذکور کل یا قریب کل کے پہلے ہی برباد ہوچکا تھا۔

مسٹر کرِل لکھتے ہیں کہ سراپیم اور اُسکے کتبخانہ کا حال اسوقت تک تاریکی میں پڑا ہوا ہے

یہ تو معلوم ہے کہ سراپیم کا معبد جس سے وہ کتبخانہ متعلق تھا تھیوڈوسیس کے عہد میں ۳۸۹ء میں گرجا بنا دیا گیا تھا لیکن یہ امر کہ آیا اس تبدیل کے وقت وہ کتبخانہ وہاں موجود تھا یا ضائع ہو گیا تھا یا کتابیں قسطنطنیہ کو منتقل ہو گئی تھیں مطلق ثابت نہیں ہوتا۔ یہ اخیر خیال یعنی کتابوں کا قسطنطنیہ جانا زیادہ تر قرین قیاس ہے۔ کیونکہ تھیوڈوسیس ثانی نے جو کتبخانہ پانچویں صدی میں بمقام قسطنطنیہ قائم کیا وہ زیادہ تر مصر و ایشیا کوچک کی کتابوں سے طیار ہوا تھا۔

سیوسڈیو فرانسیسی نے یہ تسلیم کر کے کہ کتبخانہ مبحوث فیہ سراپیم میں تھا لکھا ہے کہ کسی ہمعصر مؤرخ نے اس واقعہ (یعنی عمرو بن العاص کا کتبخانہ کو برباد کرنا) کو بیان نہیں کیا لیکن اگر وہ صحیح بھی ہو تاہم وہ صرف معدودے چند کتابوں سے متعلق ہوگا۔ کیونکہ اس کتبخانہ کے حصے ۳۹۰ء میں سیزر کے عہد میں اور تھیوڈوسیس کے عہد میں برباد ہو چکے تھے۔

اب ہم اصول درایت کے معیار سے اس واقعہ کی صحت و عدم صحت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں۔ واقعہ مذکورہ کو ابو الفرج (جو اس فرضی قصہ کا موجد اول ہے) نے جن خصوصیتوں کے ساتھ بیان کیا ہے وہ تو اسقدر لغو ہیں کہ عموماً تمام یورپین مورخین موافق ہوں یا مخالف۔ اسکو افسانہ باطل سمجھتے ہیں۔ پروفیسر ڈساسی جنہوں نے بڑے زور و شور سے اس واقعہ کو ثابت کرنا چاہا ہے تسلیم کیا ہے کہ ابو الفرج کے بیان میں جو تفصیلیں ہیں۔ صحیح نہیں۔ برٹش انسائیکلوپیڈیا کے لکھنے والوں نے بھی اسکی ہنسی اڑائی ہے۔ اور درحقیقت ایک کتبخانہ کا حماموں میں (جنکی تعداد چار ہزار تھی) تقسیم کیا جانا اور چھ مہینے تک کتابوں کا جلتا رہنا اور ایندھن کے کام آنا۔ افسانہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ ابو الفرج نے اگرچہ مصر کے تمام حماموں کی تعداد نہیں بتائی لیکن یہ صحیح طور پر معلوم ہے کہ وہ چار ہزار تھے۔ اسیلئے حماماے مصر اور چار ہزار کی تعداد کو لازم و ملزوم سمجھنا چاہیے جیسا کہ اکثر یورپین مورخوں نے سمجھا ہے۔ اب اگر دیکھا جائے

کہ اربعہ متناسبہ کی رو سے فی حمام ہر روز کیا تعداد پڑتی ہے تو معلوم ہوگا کہ ہر روز فی حمام ایک کتاب کا بھی پرتہ نہیں پڑتا بلکہ نصف کتاب سے متجاوز نہیں ہوتا۔ یا تو حمام ایسے مختصر تھے کہ ایک دن کے لیے ایک کتاب بلکہ نصف کتاب کافی ہوتی تھی یا کتابیں اسقدر ضخیم تھیں کہ ایک کتاب کا آدھا حصہ حمام کے لیے سارے دن ایندھن کا کام دیسکتا تھا۔

یہ بھی مسلم ہے کہ اُس زمانہ میں کتابیں چمڑے کے کاغذ پر لکھی جاتی تھیں جو ایندھن کا کام نہیں دیسکتا تھا۔ اسیلئے کتابوں کا اس کام کے لیے استعمال کرنا اور بھی بیہودہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈیپر صاحب لکھتے ہیں کہ "ہمکو یقین ہے کہ اسکندریہ کے حمام والے جب تک کوئی اور شے جلانے کے لیے پا سکتے تھے انہوں نے چمڑے کا کاغذ (جسپر کتابیں لکھی تھیں) نہیں جلایا ہوگا۔ اور ان کتابوں کا بہت بڑا حصہ چمڑے ہی کے کاغذ کا بنا ہوا تھا"

اس قصہ کے گڑھنے والوں نے یہ قصہ مسلمانوں کے بدنام کرنے کے لیے گڑھا لیکن انکو یہ خیال نہ آیا کہ اُسکی وجہ سے مسلمانوں سے زیادہ عیسائی موجب الزام ٹھہرتے ہیں عمرو بن العاص نے بفرض محال اسقدر کیا کہ کتابیں حماموں میں بھجوا دیں لیکن حمام والے جسقدر تھے عیسائی تھے وہ کتابوں کو بچا سکتے تھے اور بجائے اُسکے اور ایندھن سے کام لے سکتے تھے۔ عمرو بن العاص نے اسکے بعد اسکندریہ میں چھ مہینے تک قیام بھی نہیں کیا تھا۔ کہ اُنکی بازپرس کا ڈر ہوتا۔

اگرچہ یہ سرسری اور عام فہم قیاسات واقعہ مفروضہ کے ابطال کے لیے کافی ہیں لیکن زیادہ تدقیقات سے اور بھی اُسکی رہی سہی قلعی کھلجاتی ہے۔ اس واقعہ کو اگر ہم درایت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیں تو ہمکو ان امور پر لحاظ کرنا ہوگا۔ اسکندریہ کس طرح اور کن شرائط کے ساتھ قبضہ کیا گیا؟۔ اس حیثیت سے اور ممالک جو فتح ہوئے وہاں کیا

برتاؤ ہوا؟ اس قصہ کے موقعوں میں حضرت عمر کا عموماً طرز عمل کیا تھا؟۔ عمرو بن العاص
کا ذاتی میلان اور مذاق طبیعت کیا تھا؟۔
اسکندریہ کے علمی خزانوں کے آثار اسلام میں ملتے ہیں یا نہیں؟۔ انہیں سے
ہر سوال کا جواب اس بحث کا کم وبیش فیصلہ کرسکتا ہے۔

یہ امر تمام صحیح تاریخوں سے ثابت ہے کہ اسکندریہ فتح ہونے کے بعد ذمیانہ عہد
میں داخل ہوگیا یعنی وہاں کی تمام رعایا ذمی قرار دی گئی۔ فتوح البلدان بلاذری میں جو
نہایت قدیم تصنیف ہے اور جسکا مصنف تمام واقعات اپنی سند وروایت سے بیان
کرتا ہے لکھا ہے۔

ثم ان عمروا افتتحها بالسیف وغنم ما فیها وابقی اهلها ولم یقتل ولم یسب وجعلهم ذمة۔	یعنی عمرو نے اسکندریہ کو تلوار سے فتح کیا اور غنیمت لوٹی اور وہاں کے لوگوں کو باقی رکھا اور قتل وقید نہیں کیا اور لوگوں کو ذمی قرار دیا۔

یہی الفاظ ابن الاثیر وابن خلدون وغیرہ میں بھی ہیں۔

ذمیوں کے جو حقوق قرار دیئے گئے تھے انہیں سب سے مقدم یہ تھا کہ انکی جان۔
مال۔ نقد۔ اسباب۔ مویشی۔ مکانات وغیرہ سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائیگا۔ فارس
وشام کی فتوحات میں جو تحریری معاہدے ذمیوں سے ہوئے وہ تمام تاریخوں میں منقول
ہیں اور سب میں اس حق کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے خود مصر کے معاہدے کے یہ الفاظ ہیں۔

هذا ما اعطی عمرو بن العاص اهل مصر من الامان علی انفسهم ودمهم واموالهم وکنائسهم وصاعهم ومدهم وعددهم	یعنی عمرو بن العاص نے اہل مصر کو اُن کی جان۔ خون۔ مال۔ صاع۔ مد کو امان عطا کی۔

معجم البلدان میں ایک اور صحیح روایت سے نقل کیا ہے کہ معاہدے میں یہ الفاظ یا مضمون داخل تھا۔

وان لهم ارضهم واموالهم لا يتعرض لن في شئي منها۔	یعنی اُن کی زمین اور مال اُنہی کا رہیگا اور اُن میں سے کسی چیز میں تعرض نہ کیا جائیگا۔"

اہل ذمہ کے ساتھ حضرت عمر کا جو طرز عمل تھا اُسکی پوری تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے لیکن اجمالاً اسقدر کہنا ضروری ہے کہ اُنہوں نے ذمیوں کی جان و مال کو ہمیشہ مسلمانوں کی جان و مال کے برابر سمجھا۔ شہر حیرۃ میں ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر ڈالا تھا۔ اُس کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا اور اس حکم کی علانیہ تعمیل کرائی۔ مفلس ذمیوں کے لیئے بیت المال سے روزینے مقرر کیئے۔ فارس و شام کی تمام فتوحات میں گرجے اور معبد محفوظ رکھے۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ مرنے کے وقت جو تین وصیتیں کیں انہیں ایک یہ تھی۔

اوصى الخليفة من بعدى بذمة رسول الله صلى الله عليه وسلم ان يوفى لهم بعهدهم وان يقاتل من ورائهم ولا يكلفوا فوق طاقتهم۔	میرے بعد جو خلیفہ مقرر ہوگا اُسکے لئے میں رسول اللہ کے ذمہ پر وصیت کرتا ہوں کہ ذمیوں کے معاہدوں کو بجالائے اور اُنکی حفاظت کریے اُنکے دشمنوں سے لڑے اور اُنکو طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دیجائے۔

یورپ کے متعصب مصنفین اگرچہ حضرت عمرؓ کی شدت اور جبروت کے شاکی ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ جسوقت جو کچھ اُنکی زبان و قلم سے نکلا وہ اُسی طرح برتا بھی گیا۔ متعصب سے متعصب مورخین عیسائی۔ اُنکی تمام زندگی کا ایک واقعہ بھی نہ بتا سکے جس میں اُنکا عمل۔ قول کے مخالف تھا۔

جب یہ مسلم ہے کہ اسکندریہ والے ذمی قرار دیئے گئے۔ اور ذمیوں کے ساتھ جو کچھ

حضرت عمر کا طرز عمل تھا وہ تفصیلاً معلوم ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اسکندریہ والوں کی ایک بڑی یادگار (کتبخانہ) کو اس بیرحمی سے برباد کیا جاتا؟ کیا یہ کتبخانہ مسلمانوں کو گرجاؤں اور آتشکدوں سے زیادہ ناگوار ہو سکتا تھا؟ تمام ممالک مفتوحہ میں جب سیکڑوں ہزاروں گرجے اور آتشکدے قائم رکھے گئے اور انکی حفاظت کے لیے تمام فرامین میں یہ خاص الفاظ لکھے گئے۔

لا یهدم لهم بیعة ولا کنیسة داخل المدینة ولا خارجها۔	یعنی کوئی گرجا اور عبادتگاہ ڈھایا نجائیگا نہ شہر کے اندر اور نہ باہر۔

تو کتبخانہ کی نسبت ایسا ظالمانہ برتاؤ کیونکر قیاس میں آسکتا ہے۔

سچ یہ ہے کہ ابوالفرج کو (جو اس فرضی قصہ کا موجد ہے) جھوٹ بولنا بھی نہیں آتا تھا۔ وہ اگر اس واقعہ کو عین محاصرہ اور فتح کی حالت میں بیان کرتا تو قیاس میں آسکتا تھا کیونکہ حملہ اور مقابلہ کا جوش کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ لیکن یہ تسلیم کرکے کہ شہر کو امن دیدیا گیا اہل شہر ذمی قرار دیدیے گئے۔ حملہ اور معرکہ آرائی کا جوش تھم چکا۔ اسوقت ایسا ظالمانہ عمل۔ صرف ابوالفرج ہی کے قیاس میں جائز ہو سکتا ہے۔ پروفیسر سیدیو نے اسی بنا پر ابوالفرج کے بیان کو ناقابل اعتبار سمجھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جب یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ فتح کے پہلے ہلہ میں شہر غارت نہیں کیا گیا تو یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ایسے وحشیانہ کام کا اسوقت حکم دیا گیا ہو جبکہ فاتحین کا خون سرد ہو چکا تھا"

عمرو بن العاص۔ کی قابلیت اور مذاق کا خود ابوالفرج نے اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ وہ یحیی نحوی کے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

دخل علی عمرو وقد عرف موضعه من	یعنی وہ (یحیی نحوی) عمرو کے پاس حاضر ہوا۔ عمرو نے

العلوم فاکرمه عمرو وسمع من الفاظه الفلسفیة اللتی لم تکن للعرب بها السنة ماهاله وکان عمرو عاقلاً حسن الاستماع ۔ صحیح الفکر فلازمه وکان لا یفارقه ۔

اُسکے علمی مرتبہ سے واقف ہو کر اُسکی عزت کی۔ عمرو نے اُس سے وہ فلسفیانہ الفاظ سنے جس سے عرب کبھی مانوس نہ تھے اسلیے وہ اُسپر مفتون ہو گیا اور عمرو عاقل، خوش فہم صحیح الفکر شخص تھا اسلیے اُسنے یحیی نحوی کی صحبت کو لازم پکڑ لیا اور اُسکو کبھی جدا نہیں کرتا تھا

اب خیال کرو کہ ایسا قابل اور علم دوست شخص جسنے باوجود مذہبی جوش کے ایک عیسائی عالم کو اپنا رفیق وہمدم بنا لیا ہو۔ اسکے ساتھ اُسکو علمی مباحث بلکہ فلسفہ کا چسکا پڑ چکا ہو وہ اس بیرحمی سے مدت تک کتبخانہ کو برباد کراتا جو ایک جاہل سے جاہل شخص بھی نہیں کرسکتا۔ مانا کہ وہ خود مختار نہ تھے لیکن حضرت عمرؓ کو جو خط لکھا تھا اسمیں کتبخانہ کے لیے سفارش تو کرسکتے تھے عمرو نے بہت سے کاموں میں اکثر زور ڈالکر حضرت عمرؓ سے اجازت حاصل کی تھی۔ مصر واسکندریہ پر لشکرکشی کے لیے حضرت عمرؓ کسی طرح راضی نہوتے تھے۔ عمرو نے اُنکو مجبور کیا اور ذمہ داری کی کہ اُسکا فتح کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اُسوقت حضرت عمر نے اجازت دی۔ بلکہ علامہ بلاذری (جو نہایت مشہور اور مستند مؤرخ ہے) کی روایت کے موافق عمرو بن العاص نے حضرت عمر کی اجازت کا بھی انتظار نہ کیا اور مصر کو روانہ ہو گئے۔ اور یہ تو عموماً مسلم ہے کہ مصر واسکندریہ کی فتح جن شرط پر ہوئی اور معاہدہ میں جو شرطیں قلمبند ہوئیں وہ بالکل عمرو نے اپنی راے سے لکھیں حضرت عمر کو اُنکی اطلاع البتہ دی اور اُنہوں نے اُسکو منظور کر لیا۔ کیا کتبخانہ کی نسبت عمرو بن العاص ایسا نہیں کر سکتے تھے؟۔

اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ عمرو بن العاص نے اسکندریہ کی فتح کے بعد دربار خلافت میں جو خط بھیجا اُسمیں ایک ایک چیز کی تفصیل کی ہے چنانچہ فتح کے ذکر کے بعد لکھا ہے کہ اس

شہر میں چار ہزار حمام، چار ہزار قصر، چالیس ہزار خراج گزار یہودی، چار سو شاہی سیرگاہیں، بارہ ہزار باغ جنگی ترکاری بکتی ہے، موجود ہیں"۔ لیکن ان تفصیلوں میں ہمکو اپنے دوست ابوالفرج کے فرضی کتبخانہ کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

تمام واقعات تاریخی پر غور کرنے سے حقیقت واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسکندریہ میں جسقدر قدیم کتبخانے تھے اسلام کے زمانہ سے پہلے ہی برباد ہو گئے تھے۔ جس کے اسباب و اتفاقات مورخوں نے بہ تفصیل لکھے ہیں۔ لیکن ان آفتوں پر بھی علمی آثار بالکل معدوم نہیں ہو گئے تھے۔ اور ایک ایسے شہر میں جو سیکڑوں برس تک دار العلوم رہ چکا تھا علمی یادگاروں کا یک لخت معدوم ہو جانا ممکن بھی نہ تھا۔ چنانچہ زمانہ اسلام سے کسی قدر پہلے اسکندریہ میں سات نہایت مشہور طبیب اور فلاسفر موجود تھے جن کے یہ نام ہیں۔ اسطفن جاسیوس۔ ثادودسیوس۔ اکیلاؤس۔ انفیلاؤس۔ فلادیوس۔ یحیی نحوی۔ ان سب میں یحیی نحوی نے زیادہ عمر پائی اور عمرو بن العاص کے زمانہ تک زندہ رہا۔ اسکندریہ کے کتبخانے تو بہت پہلے برباد ہو چکے تھے۔ لیکن اخیر زمانہ میں جو علمی سرمایہ مہیا ہوا تھا وہ اسلام کی فتح کے وقت موجود تھا اور زمانہ مابعد تک بھی باقی رہا چنانچہ دولت عباسیہ کے زمانہ میں جب علمی یادگاروں کی تلاش ہوئی تو اسکندریہ سے معتدبہ ذخیرہ ہاتھ آیا۔ ہرون الرشید و ماموں الرشید و متوکل باللہ کے عمال جو شام و فلسطین۔ ایشیا کوچک۔ سائپرس میں فلسفی اور طبی تصنیفات ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔ اسی غرض سے اسکندریہ بھی گئے تھے اور بہت سی کتابیں حاصل کیں حنین بن اسحق نے لکھا ہے کہ "جالینوس کی کتاب البرہان کی تلاش میں میں جزیرہ و شام فلسطین۔ مصر کے تمام شہروں میں پھرا یہاں تک کہ اسکندریہ پہنچا لیکن کتاب مذکور کا کہیں پتہ نہ چلا۔ صرف دمشق میں اُسکے چند حصے وہ بھی بے ترتیب ملے"۔

حنین۔ کو اگرچہ اس کتاب کے ملنے میں اس وجہ سے ناکامی ہوئی تہ قدیم کتبخانے اسلام سے
پہلے ہی برباد ہو چکے تھے لیکن زمانۂ مابعد کی تصنیفات جو شروع اسلام تک محفوظ تھیں قریباً
کل ہات آئیں۔ جن سات حکیموں کا اوپر ذکر ہوا اُنکی تمام تصنیفات محفوظ ملیں اور عربی زبان
میں اُنکے ترجمے کیے گئے۔ یحیی نحوی کی کتابوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا گیا چنانچہ انکی جسقدر
کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں انہیں سے چند یہ ہیں۔

تفسیر کتاب قاطیغوریاس لارسطو۔ تفسیر کتاب انالوطیقاے الاولی لارسطو۔ تفسیر کتاب
انالوطیقاے الثانی لارسطو۔ تفسیر کتاب طوبیقا لارسطو۔ تفسیر کتاب السماع الطبیعی لارسطو تفسیر
کتاب الکون والفساد لارسطو۔ تفسیر کتاب مابال لارسطو۔ تفسیر کتاب الفرق لجالینوس تفسیر
کتاب الصناعۃ لجالینوس۔ تفسیر کتاب النبض الصغیر لجالینوس۔ تفسیر کتاب اغلوقن لجالینوس
تفسیر کتاب الاسطقسات لجالینوس۔ تفسیر کتاب القوی الطبیعۃ لجالینوس۔ تفسیر کتاب التشریح
الصغیر لجالینوس۔ تفسیر کتاب العلل والاعراض لجالینوس۔ تفسیر کتاب تعرف علل الاعضاء الباطنۃ
لجالینوس تفسیر کتاب النبض الکبیر لجالینوس۔ تفسیر کتاب الحمیات لجالینوس۔ تفسیر کتاب البحران
لجالینوس۔ تفسیر کتاب ایام البحران لجالینوس۔ تفسیر کتاب منافع الاعضاء لجالینوس تفسیر
کتاب تدبیر الاصحاء لجالینوس۔ تفسیر کتاب المزاج لجالینوس۔ جوامع کتاب التریاق لجالینوس
جوامع کتاب الفصد لجالینوس۔ کتاب الرد علی برقلس۔ کتاب فی ان کل جسم متناہ فقوتہ
متناہیۃ۔ کتاب الرد علی ارسطو۔ کتاب الرد علی نطورس شرح کتاب ایساغوجی لفرفوریوس۔
انکے سوا اور بھی کتابیں ہیں جنکی تفصیل طبقات الاطبا، وکتاب الفہرست لابن الندیم میں ملتی ہے
اگر اسکندریہ کا کتبخانہ عمرو بن العاص کے زمانہ میں برباد ہوا ہوتا تو سب سے پہلے یحیی نحوی کی
تصنیفات برباد ہونی چاہیے تھیں جو عمرو بن العاص کا ہمعصر اور بقول ابوالفرج کے کتبخانہ مذکور کا

مہتمم تھا۔

غرض مصر و اسکندریہ وغیرہ میں اسلام کے زمانہ تک جو سرمایہ محفوظ رہ گیا تھا وہ ہرگز ضائع نہیں ہونے پایا البتہ جو کچھ اسلام سے پہلے تلف ہو چکا تھا اُسکو وہ دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ ہمکو تاریخوں سے اس بات کا بھی پتہ لگتا ہے کہ نہایت قدیم زمانہ کی بھی کوئی چیز اگر زمانہ اسلام تک کسی وجہ سے محفوظ رہ گئی تو وہ ہرگز برباد نہیں ہونے پائی۔ بلکہ زمانۂ مابعد میں نہایت قدردانی کے ساتھ یادگار کے طور پر اُسکو محفوظ رکھا گیا۔ ابن السندی نے جو مصر کا رہنے والا اور علم اصطرلاب کا بڑا ماہر تھا لکھا ہے کہ وزیر ابو القاسم علی بن احمد الجرجانی نے ۴۳۵ ہجری میں قاہرہ کے کتبخانہ کا جائزہ لیا اور قاضی ابو عبداللہ القضاعی و ابن خلف وراق کو حکم دیا کہ کتابوں کی فہرست تیار کریں اور جلدیں جو خراب ہو گئی ہیں اُنکی مرمت کرائیں۔ میں بھی اُن دونوں بزرگوں کے ساتھ اس غرض سے وہاں گیا کہ اپنے مذاق کی کتابوں کی سیر کروں چنانچہ صرف نجوم و ہندسہ و فلسفہ کے متعلق جو اجزا تھے اُنکی تعداد چھ ہزار پانسو تھی یہیں میں نے ایک تانبے کا کُرہ دیکھا جو بطلیموس کے ہاتھ کا بنا ہوا تھا میں نے اُسکی قدامت کا اندازہ کرنا چاہا تو حساب سے ثابت ہوا کہ دو ہزار دو سو پچاس برس کی مدت کا ہے۔ یہیں ہمکو ایک اور کُرہ ملا جو چاندی کا تھا اور جسکو ابو الحسن صوفی نے عضد الدولہ کے لیے بنایا تھا اُس کا وزن تین ہزار درم تھا اور تین ہزار دینار (پندرہ ہزار رُپئے) کو خریدا گیا تھا۔"

اگرچہ ہم نے اس بحث کو مجتہدانہ اُصول کے ساتھ طے کر دیا ہے اور اس وجہ سے ہمکو اسکی کچھ پروا نہیں کہ یورپ کے مورخین ہمارے ہمزبان ہیں یا نہیں۔ تاہم تقلید پسندوں اور بالخصوص اُن لوگوں کی تسلی کے لیے جنکو یورپ کے ساتھ نہایت حسن عقیدت ہے یہ کہدینا ضرور ہے کہ واقعہ مفروضہ گو ایک زمانہ میں تمام یورپ میں تسلیم کیا جاتا تھا لیکن جسقدر تاریخی

تحقیقات کو ترقی ہوتی گئی اُسی نسبت اُنکی تصدیق کا زور گھٹتا گیا۔ یہاں تک کہ حال کے مصنفین میں زیادہ تر اُنہی لوگوں کی تعداد ہے جو اُسکو غلط اور مشکوک واقعہ قرار دیتے ہیں۔ آج تک اسقدر ہوا ہے اور اُمید ہے کہ وہ دن بھی آئے جب زیادہ غور اور تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق ہوکر علانیہ کہدے کہ۔ مصرع

ہم الزام اُنکو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مسلمانوں کو آج کل غیر قوموں سے جو اجتناب ہے اور جسکی وجہ سے وہ دنیا کی تمام مفید علوم و فنون سے محروم ہیں۔ اسکے لحاظ سے حقیقت میں مشکل سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کسی زمانہ میں غیر زبانوں سے کچھ فائدہ اُٹھایا ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا کہ عہد وسطی میں مسلمانوں نے دُنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کرلیا تھا اور اگر دنیا میں مسلمانوں کا قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند، فارس کے تمام علمی ذخیرے آج برباد ہوچکے ہوتے۔ چونکہ اس واقعہ سے یورپ کو بھی انکار نہیں ہوسکتا تھا اس لیے عیسائی مورخوں نے اس امر کی نسبت بہت بحثیں کی ہیں کہ مسلمانوں نے کسی زمانہ میں غیر زبانوں پر اسقدر کیوں توجہ کی تھی؟ اورینٹل کانفرنس میں ایک فرنچ مضمون نگار نے اس بحث پر ایک آرٹکل پیش کیا تھا۔ نوفل آفندی۔ نے جو بیروت کا ایک عیسائی مورخ ہے اور جس نے مسلمانوں کی تہذیب و تمدن پر صناجة الطرب نام ایک مستقل کتاب لکھی ہے مسلمانوں کے علمی ترقی کے ذکر میں لکھتا ہے کہ "یہ امر نہایت تعجب انگیز ہے کہ اہل عرب جو ہر قدم پر تہذیب و تمدن کو برباد کرتے جاتے تھے۔ جنہوں نے حضرت عمرؓ کے اشارہ سے اسکندریہ کے کتبخانہ کو برباد کیا جنہوں نے عثمان کے حکم سے فارس کے علوم و فنون تباہ کردیئے۔ جنکے علم فتح کے نصب ہوتے ہی انطاکیہ و بیروت کے مدرسے فنا ہوگئے۔ جنہوں نے سنہ ۱۸ھ میں دمشق کا کالج برباد کردیا۔ جنہوں نے مصر کی مشہور یادگاروں اہرام اور ابو الہول کو مٹا دینا چاہا" انکو غیر قوموں کے علوم و فنون پر کیونکر توجہ ہوئی؟ مصنف مذکور اس عقدہ کو اس طرح حل کرتا ہے کہ اہل عرب زمانہ

جاہلیت سے نجوم اور پیشین گوئیوں کے معتقد تھے خلفا کے دربار میں جو عیسائی اور یہودی طبیب ملازم تھے اُنہوں نے خلفا کو یہ یقین دلایا کہ اگر یونان وغیرہ کی کتابیں ترجمہ ہوجائیں تو علم نجوم کے ذریعہ سے بہت سی باتیں جو پردہ غیب میں ہیں معلوم ہوجائینگی۔ یہ شوق تھا جس نے اہل عرب کو غیر زبانوں کے ترجمہ پر مائل کیا"

اس موقع پر ہم مورخ مذکور کی اُن بہیم افتراؤں سے بحث نہیں کرتے جسکا اُس نے اس موقع پر مینہ برسا دیا ہے۔ البتہ اصل مسئلہ غور کے قابل ہے اور اُسکے متعلق ہم کسی قدر تفصیل سے لکھنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ تعصب اور تنگ حوصلگی سے اس قسم کے قیاسات پیدا کرنے بعید نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان جب مسلمان تھے تو اُنہوں نے کبھی غیر قوموں اور غیر زبانوں سے کسی قسم کا تعصب نہیں ظاہر کیا۔ اوروں کا تو کیا ذکر ہے خود شارع علیہ السلام نے غیر قوموں کی بہت سی باتیں پسند فرمائیں اور اختیار کیں، جنگ احزاب میں حضرت سلمان فارسی نے جب ایران کے طریقہ کے موافق خندق کھودنے اور طائف کے محاصرہ میں منجنیق کے استعمال کرنیکا مشورہ دیا تو آنحضرت نے بے تکلف منظور فرمایا اور اُسپر عمل کیا، ملکی انتظامات میں بھی آپ نے غیر قوموں کے اصول و آئین پسند فرمائے اور اختیار کیے، شاہ ولی اللہ صاحب جنسے بڑھکر محدث اور اسرار شریعت کا نکتہ شناس کون ہوگا تحریر فرماتے ہیں کہ "وکان قباد وابنہ نوشیروان وضعا علیہم الخراج والعشر فجاء الشرع بنحو من ذلک[1] یعنی قباد اور اُسکے بیٹے نوشیرواں نے لوگوں پر خراج اور عشر لگایا تھا تو شریعت اسلامی نے بھی اُسکے قریب قریب حکم دیا۔ آنحضرت کو چونکہ یہودیوں سے اکثر خط کتابت رہتی تھی اسلیے آپ نے زید بن ثابت کو حکم دیا اور اُنہوں نے عبرانی زبان سیکھ لی[2] زید نے اسی قسم

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۱۰ [2] فتوح البلدان صفحہ ۴۷۴۔

کی ضرورتوں سے سُریانی زبان بھی سیکھ لی تھی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب فتوحات کو نہایت
ترقی ہوئی تو ولید بن ہشام نے کہا کہ میں نے شام کے سلاطین کو دیکھا ہے کہ اُنکے ان فوج
اور خزانہ کا جُداگانہ دفتر مرتب رہتا ہے چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی اُصول کے موافق فوج اور خزانہ[1]
کا دفتر قائم کیا یہاں تک کہ نام بھی وہی عجمی یعنی **دیوان** - رکھا جو بعینہ فارسی لفظ ہے صحابہ
میں سے بہتوں نے فارسی زبان سیکھ لی تھی چنانچہ ہرمزان جو عجم کا ایک رئیس تھا جب حضرت
عمرؓ کے دربار میں آیا تو مغیرۃ نے فارسی میں اُس سے سوال وجواب کیے۔

غرض یہ امر محتاج شہادت نہیں کہ قرن اول کے مسلمانوں نے جب موقع اور ضرورت پڑی
تو معاشرت اور تمدن کے متعلق بے تکلف غیر قوموں کے اُصول اور آئین اختیار کیے البتہ
تاریخی طور سے یہ امر بحث طلب ہے کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کے علوم وفنون پر کس زمانہ میں توجہ
کی اور کن اسباب سے کی؟

اصل یہ ہے کہ ابتداہی میں مسلمانوں کو فتوحات کی وسعت کی وجہ سے مختلف قوموں سے
ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور جسقدر یہ روابط بڑہتے گیے اُسیقدر انکو دوسری قوموں کے علوم وفنون
اور خیالات سے زیادہ واقفیت ہوتی گئی حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مصر فتح ہوا تو وہاں وہ
یونانی مشہور فلاسفر موجود تھا جسکو انگریزی میں جان اور عربی میں یحیی نحوی کہتے ہیں[2] وہ عمرو بن
العاص کی خدمت میں حاضر ہوا اور عمرو بن العاص نے اسکی نہایت قدر وعزت کی چنانچہ وہ کثر
اُنسے ملتا رہتا تھا اور یہ اسکی علمی تقریریں سُنکر محظوظ ہوتے تھے[3]۔ امیر معاویہ نے اپنے عہد حکومت
میں غیر قوموں کو زیادہ دخل دیا، اُنسے پہلے کسی خلیفہ نے دفتر خراج کے سوا عیسائیوں اور یہودیوں
کو کوئی ملکی خدمت نہیں دی تھی انہوں نے ایک عیسائی کو دربار کا میر منشی مقرر کیا اور ابن آثال

[1] فتوح البلدان صفحہ ۴۰۹۔ [2] اسکا مفصل حال اور اسکی تصنیفات کا ذکر آگے آئیگا۔ [3] کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۴۔ - طبقات الاطباء ذکر یحیی نحوی

ایک عیسائی کو ضلع حمص کی کلکٹری کی خدمت دی ابن آثال طبیب بھی تھا، اسنے امیر معاویہ کیلیے طب کی بعض کتابیں یونانی زبان سے ترجمہ کیں اور گویا یہ ترجمہ کے رواج کا پہلا دیباچہ تھا۔

اگرچہ یہ وہ زمانہ تھا کہ اسلامی علوم و فنون یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، انساب اس حد تک پہنچگیے تھے کہ سیکڑوں آدمی انکے پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے اور بجز اسکے کہ تصنیف و تالیف کا رواج نہیں ہوا تھا، تعلم و تعلیم میں اور کسی بات کی کمی نہ تھی، لیکن اب تک اہل عرب نے غیر قوموں کے علوم و فنون حاصل کرنے کی طرف خاص توجہ نہیں کی تھی، امیر معاویہ کا پوتا خالد جو اسلامی علوم و فنون میں یکتا تھا اسنے فن طب اور کیمیا میں کمال پیدا کرنا چاہا اور چونکہ اسوقت علمی طور سے اس فن کے ماہر عیسائی یا یہودی تھے خالد کو عیسائی طبیبوں کی شاگردی کرنی پڑی، اس تعلق سے اسنے غیر قوموں کے اور علوم سے بھی واقفیت حاصل کی، ایک یونانی رہبان سے جسکا نام مریانس تھا اسنے علم کیمیا سیکھا اور خود اس فن میں تین مختصر کتابیں لکھیں۔ ایک کتاب میں اسنے مریانس سے تعلیم پانے کا ذکر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ خالد کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اسنے بڑے حوصلہ کیساتھ غیر زبانوں کے ترجمہ پر توجہ کی۔ اس زمانہ میں فلسفہ وغیرہ کی تعلیم یونان سے منتقل ہو کر مصر میں آگئی تھی اور یونانی نسل کے بڑے بڑے حکما اور اہل فن یہیں کے مدرسوں میں پڑھتے پڑھاتے تھے اور چونکہ مصر جبدن سے اسلام کے قبضہ میں آیا تھا اسی وقت سے وہاں عربی زبان رواج پانے لگی تھی یہاں تک کہ تھوڑے دن کے بعد کل مصر کی زبان قبطی کے بجاے عربی ہوگئی۔ اسلیے ان حکما میں بہت سے ایسے بھی تھے جو عربی زبان لکھ پڑھ سکتے تھے خالد نے ان لوگوں کو بلا کر یونانی اور قبطی زبان کی کتابوں کے ترجمہ پر مامور کیا[1]۔ علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں لکھا ہے کہ اسلام میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کیا گیا، خالد کے عہد کا مشہور مترجم اصطفن تھا

[1] فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۴۲ و ابن خلکان تذکرہ خالد بن یزید۔

معلوم ہوتا ہے کہ خالد کی اس کوشش کا اور لوگوں پر بھی اثر ہوا اور خود سلطنت کو اس کام کی طرف توجہ ہوئی چنانچہ مروان بن الحکم جو سلطنت بنی امیہ کا پہلا تاجدار ہے اسکے دربار کے ایک مشہور یہودی طبیب نے جسکا نام ماسرجیس تھا بشپ اہرن کی قرابادین کا سُریانی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اور یہ ترجمہ شاہی کتبخانہ میں داخل کیا گیا۔

علامہ جمال الدین قفطی نے لکھا ہے کہ قدیم زمانہ کے جسقدر قرابادین ہیں یہ سب سے بڑھکر ہے شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے عہد خلافت میں اسکو خزانہ شاہی سے نکلوا کر بہت سی نقلیں کرائیں اور عام طور پر شائع کیں۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کو ایک بڑی وجہ یونانی معلومات کی طرف رغبت کی یہ تھی کہ جب وہ سلیمان بن عبد الملک کے زمانہ میں مصر کے گورنر تھے تو اسکندریہ کی یونانی تعلیم کا پروفیسر اور افسر کُل ابن ابجر نام ایک حکیم تھا۔ معلوم نہیں کن اسباب سے وہ عمر بن العزیز کے ہات پر اسلام لایا جب یہ خلیفہ ہوئے تو اُنہوں نے اسکو اپنے دربار میں بُلا لیا اور طبی صیغہ کی افسری اسکو دی[1] مورخوں نے لکھا ہے کہ عمر بن عبد العزیز کے تخت نشینی کے سال۔ یونانی تعلیم اسکندریہ سے انطاکیہ و حران کو منتقل ہوگئی۔ غالباً اسکی وجہ یہی ہوگی کہ اسکندریہ میں جسکے دم سے یہ تعلیم قائم تھی (یعنی ابن ابجر) وہ عمر بن عبد العزیز کے پاس چلا آیا تھا۔

بعض ملکی ضرورتوں نے بھی ترجمہ کے رواج میں مدد دی۔ اسوقت تک مالگذاری اور خراج کے جسقدر دفتر تھے سب غیر زبانوں میں تھے چنانچہ عراق کا دفتر فارسی میں، شام کا لٹین میں، مصر کا قبطی میں تھا، اور اسیوجہ سے دفتر خراج کے جسقدر عہدہ دار تھے سب مجوسی یا عیسائی تھے، حجاج بن یوسف کے زمانہ میں دربار کا میر منشی ایک مجوسی تھا جسکا نام فرخ تھا اسنے ایک موقع پر یہ دعوے کیا کہ میرے بغیر دفتر خراج کا کام انجام نہیں پا سکتا، وہ تو ایک ہنگامہ میں اتفاق سے مارا گیا لیکن

---

[1] طبقات الاطبا جلد اول صفحہ ۱۱۶۔

اسکے اس مغرورانہ دعوی کے خبر حجاج کو پہنچی، اتفاق یہ کہ حجاج کے دربار میں صالح بن عبدالرحمن ایک شخص موجود تھا جو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں کمال رکھتا تھا۔ حجاج نے اسکو حکم دیا کہ خراج کا جسقدر دفتر ہے فارسی زبان سے عربی میں ترجمہ کر دیا جائے دربار میں جو پارسی موجود تھے اُن کو نہایت اضطراب پیدا ہوا کہ اتنا بڑا محکمہ ہمارے ہاتھ سے نکلا جاتا ہے چنانچہ انہوں نے صالح کے پاس رشوت کے ایک لاکھ درہم پیش کیے کہ تم حجاج سے کہدو کہ عربی زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکتا، لیکن صالح نے نہ مانا اور ۷۸ھ میں عراق کا تمام دفتر عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا، اسکے بعد ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں ۸۷ھ میں عبداللہ بن عبدالملک کی کوشش سے مصر کا دفتر عربی زبان میں منتقل ہوا، پھر ہشام بن عبدالملک نے شام کا دفتر عربی میں ترجمہ کرایا، ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے اخیر تک مسلمانوں میں بہت سے آدمی پیدا ہو گئے تھے جو فارسی، لاطین، قبطی، وغیرہ زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔

ہشام بن عبدالملک جو ۱۰۵ھ میں تخت نشین ہوا حکومت بنی اُمیہ کا گل سرسبد تھا۔ اسکے عہد میں ملکی انتظامات کے نظم و نسق کے ساتھ علوم و فنون کو بہت ترقی ہوئی اور غیر قوموں کے معلومات و خیالات سے واقفیت کے نئے سامان پیدا ہو گئے سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ہشام نے خالد بن عبداللہ قسری کو عراق کا گورنر مقرر کیا۔ جو بے تعصبی اور علمی فیاضی میں یگانہ روزگار تھا۔ فرقہ مانویہ جسکے پیشوا مانی کو شہنشاہ ایران نے قتل کروا دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ اس فرقہ کا ایک شخص بھی دنیا میں زندہ نہ رہنے پائے، عجم کے اخیر سلطنت تک مارا مارا پھرتا تھا، اسلام کی حکومت میں انکو امن حاصل ہوا اور خالد نے اُنکے ساتھ اسقدر مراعات کی کہ درحقیقت انکا مربی بنگیا[1] ہشام کا میر منشی جسکا نام سالم تھا مشہور صاحب قلم اور فصیح و بلیغ تھا اسکے ساتھ غیر زبانوں میں نہایت مہارت

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۳۳۰

رکہتا تہا۔ اسنے ارسطو کے رسالوں کا جو سکندر کے نام تہے عربی زبان میں ترجمہ کیا[1]۔ اسکا بیٹا
جبلہ فارسی زبان میں کمال رکہتا تہا چنانچہ اسنے فارسی زبان کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ
کیں[2] جنمیں سے جنگ رستم واسفندیار و داستان بہرام چوبین کا ذکر علامہ ابن الندیم نے کتاب
الفہرست میں کیا ہے۔ سالم کی ترغیب اور فیاضی سے اور لوگوں نے بہی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔
ہشام کو خود اس کام کے ساتہ نہایت شوق اور شغف تہا شاہان عجم کے علمی ذخیرے سے جو بات
آئے تہے انمیں ایک نہایت مبسوط تاریخ تہی جسمیں تمام شاہان عجم کی سوانح عمریاں، قواعد سلطنت،
تعمیرات، علوم و فنون تفصیل سے درج تہے اور ایک خاص بات یہ تہی کہ جس بادشاہ کا حال تہا اسکی
تصویر بہی تہی، تصویروں میں حلیہ اور لباس و وضع کو اصلی طور سے دکہایا تہا۔ ہشام نے اس کتاب کے
ترجمہ کا حکم دیا اور ۱۱۳ھ میں یہ ترجمہ طیار ہو کر مرتب ہوا، مورخ مسعودی نے لکہا ہے[3] کہ میں نے
سنہ ۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر یہ کتاب مع تصاویر دیکہی۔ سلطنت فارس کے متعلق جسقدر کتابیں قدیم فارسی
میں موجود ہیں کوئی اسقدر مفصل اور مبسوط نہیں ہے۔ ہشام بن عبد الملک نے ۱۲۵ھ میں وفات
پائی اور اسکی وفات کے ساتہ گویا حکومت بنی امیہ کا بہی خاتمہ ہو گیا۔

دولت عباسیہ کا پہلا تخت نشین **سفاح** تہا جسنے صرف دو ڈہائی برس حکومت کی پہر منصور
مسند آرا ہوا اور دولت عباسیہ کا آغاز بہی اسی وقت سے خیال کیا جاتا ہے۔ منصور خود بہت بڑا
عالم اور صاحب فضل و کمال تہا، اسکے حوصلہ افزائی نے علوم و فنون کا دریا بہا دیا، اسکا مبارک
عہد تہا کہ اسلامی علوم کی تدوین شروع ہوئی، یعنی امام ابو حنیفہ نے فقہ کو مدون کیا، ابن اسحاق
نے غزوات نبوی لکہے، امام مالک، اوزاعی، سفیان ثوری وغیرہ نے حدیثیں جمع کیں، منصور کا
مذاق اتفاق سے عجمی واقع ہوا تہا وہ ہر ہر بات میں اہل عجم کی تقلید کرتا تہا یہانتک کہ دربار کا

---

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۱۔ [2] کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۴۔ [3] کتاب التنبیہ والاشراف المسعودی صفحہ ۱۰۶۔

لباس بھی عجمی رکھا منصور ہی پہلا شخص تھا جسنے عرب کے زور گھٹانے کے لیے عجمیوں کا رسوخ بڑھایا اور تمام بڑے بڑے عہدے انکے ہات میں دیدیئے اگرچہ منصور کی کارروائی پولیٹکل حیثیت سے نہایت خراب تھی لیکن اس غلطی سے اتنا فائدہ ہوا کہ عرب میں فلسفہ کی بنیاد قائم ہوئی اور آج مسلمانوں میں عقلی علوم کا جو کچھ رواج ہے وہ اسی غلطی کی بدولت ہے منصور نے جن عجمیوں کو دربار میں رسوخ دیا وہ عموماً صاحب فضل وکمال تھے اور اسوجہ سے انہوں نے طب و فلسفہ کی نادر نادر کتابیں منصور کے لیے بہم پہنچائیں اور اُن کے ترجمے کیے۔ انہیں ایک عبداللہ بن المقفع تھا جسکی نسبت ہمارے علمائے عربیت نے تسلیم کیا ہے کہ شروع اسلام سے آج تک عربی زبان میں ایسا فصیح وبلیغ مقرر اور صاحب قلم نہیں گذرا چنانچہ اسکی کتاب تیمیہ کو ملحدوں نے (نعوذ باللہ) قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کیا ہے۔ وہ مجوسی تھا اور اسکی مادری زبان فارسی تھی۔ اسلام قبول کر کے اسنے عربی زبان میں کمال پیدا کیا اور منصور نے اسکو دربار کا میر منشی مقرر کر دیا چونکہ وہ مختلف زبانوں کا ماہر اور اسکے ساتھ نہایت فصیح و بلیغ تھا اس کے ترجمے نہایت اعلیٰ درجہ کے خیال کیے جاتے ہیں۔ انہیں سے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ اب بھی یادگار ہے اور چھپکر شائع ہو چکا ہے۔ اسنے یونانی زبان کی کتابیں بھی ترجمہ کیں مثلاً قاطیغوریاس باریمیناس انالوطیقا وغیرہ۔ فرفوریوس مصری کی کتاب ایساغوجی کا ترجمہ بھی اسی نے کیا فارسی زبان اسکی مادری زبان تھی۔ اسلیے اس زبان کی کتابیں کثرت سے ترجمہ کیں انہیں سے خدائی نامہ آئین نامہ۔ مزدک نامہ۔ نوشیرواں نامہ۔ جو تاریخ کی نادر کتابیں ہیں زیادہ مشہور ہوئیں پارسیوں کی علم الاخلاق کی دو بڑی کتابیں جو اسنے ترجمہ کیں وہ الادب الکبیر اور الادب الصغیر کے نام سے مشہور ہیں چنانچہ ان کتابوں کا ذکر علامہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں کیا ہے۔

سلہ عبداللہ بن المقفع کے لیے دیکھو کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۸ و طبقات الاطبا جلد اول صفحہ ۳۰۰۔

اہل عجم میں سے ایک اور بڑا صاحب اثر شخص جو منصور کے دربار میں تھا نوبخت نام ایک آتش پرست تھا۔ وہ منصور کے ہات پر اسلام لایا تھا۔ اور دربار میں اسکو وہ جاہ و اقتدار حاصل تھا کہ اکابر دولت میں گنا جاتا تھا۔ اسکا خاندان ایک مدت تک علم و فضل کا سرپرست رہا اور ان کی وجہ سے فارسی زبان کی بہت سے ذخیرے عربی میں آئی ابو سہل اور حسن بن موسی جو بڑے پایہ کے متکلم تھے اور جنکے ہاں مترجمین کا جمگھٹا رہتا تھا اسی نوبخت کے خاندان سے تھے۔[۱] انہی عجموں میں سے جارج ابن جبرئیل بھی تھا جو مشہور مترجم گذرا ہے۔ یہ جندی سابور میں افسر الاطبا کے منصب پر ممتاز تھا۔ سنہ ۱۴۸ھ میں منصور نے اسکو علاج کے لیے طلب کیا اور پھر اسکا تمام خاندان دربار میں داخل ہوگیا۔ منصور نے اسکی یہ قدردانی کی کہ باوجود اسکے کہ اسنے اپنے مذہب کو نہیں بدلا تھا دربار کا طبیب مقرر کیا اور جب مرض الموت کی بیماری میں اسنے وطن کو واپس جانا چاہا تو سفر خرچ کے لیے پچاس ہزار روپئے عنایت کیے۔ جارج پہلا شخص ہے جسنے دولت عباسیہ میں طب کی تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کیں[۲]، اسکی کوشش سے طب کا بڑا ذخیرہ عربی میں فراہم ہوا اسنے خود بھی ایک نہایت مفصل اور عمدہ تجربات کی کتاب سریانی زبان میں لکھی جسکا ترجمہ حنین بن اسحاق نے عربی میں کیا۔ منصور کے عہد سے لیکر سنہ ۲۴۰ھ تک یہ خاندان قائم رہا اور دولت عباسیہ کے اخیر عہد ترقی تک یہ خاندان برابر علوم طبیہ کا سرپرست، علم و فضل کا حامی اور دربار کا زیب و زینت رہا۔

طب کی کتابوں کا ایک اور مشہور مترجم جو منصور کے دربار میں تھا بطریق نام ایک عیسائی تھا اسنے منصور کے حکم سے یونان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ بقراط اور جالینوس کی تصنیفات کے جو ترجمے اسنے کیے ساتویں صدی ہجری تک متداول رہے۔[۳]

---

[۱] کتاب الفہرست صفحہ ۱۷۶ و ۱۷۷ و ۲۴۴ - و مروج الذہب ذکر خلافت قاہر باللہ۔

[۲] جارج کے لیے دیکھو طبقات صفحہ ۱۲۳ و ۲۰۳۔

[۳] بطریق کے لیے دیکھو طبقات صفحہ ۲۰۵۔

منصور کے ذوق علمی کا یہ حال تہا کہ یونان کے علوم و فنون کا جو سرمایہ خود اسکے ملک میں بہم پہنچ سکتا تہا اُسپر اکتفا نہ کر کے قیصر روم کو خط لکہا چنانچہ اس کی درخواست کے موافق قیصر نے فلسفہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں منصور کے پاس روانہ کیں[۱]

منصور کے ذوق کا یہاں تک چرچا پہیلا کہ دور دراز ملکوں سے ہر قوم وملت کے اہل کمال نے اسکے دربار کا رُخ کیا' ۱۵۶ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی داں عالم بغداد میں آیا اور سنسکرت کے مشہور زیج جسکا نام سدھانتا ہے اور جسکے متعلق آگے چلکر ہم کسی قدر تفصیل کیسا تہ لکہینگے منصور کیخدمت میں پیش کی محمد بن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے اسکا ترجمہ کیا۔ مامون الرشید کے زمانہ تک اعمال کواکب میں اسی زیج پر اعتماد کیا جاتا تہا[۲]

مذاہب کی تحقیقات کے لیے منصور نے اجازت دی کہ تمام مختلف فرقوں کی مذہبی کتابیں ترجمہ کی جائیں' اسوقت ایران میں جس مذہب کا بہت چرچا تہا وہ مانی کا مذہب تہا' مانی نے نبوت کا دعویٰ کیا تہا' اور چند کتابیں پیش کی تہیں کہ خدا کی طرف سے اسپر نازل ہوئی ہیں' بادشاہِ وقت نے اسکو قتل کرا دیا اور حکم دیا کہ اسکے پیروؤں میں سے ایک متنفس بہی زندہ نرہنے پائے' چنانچہ عجم کی اخیر سلطنت تک اس فرقہ والے اِدہر اُدہر مارے پہرے لیکن جب اسلام کا زمانہ آیا تو اسنے تمام مذاہب کو آزادی دی' اسوقت یہ فرقہ بہی عراق کو واپس آیا' اور چونکہ خالد بن عبد اللہ قسری گورنر عراق نے اسپر خاص توجہ کی' وہ امن و اطمینان کے ساتھ اپنے مذہب کی ترویج میں مصروف ہوئے۔ عباسیہ کا عہد آیا تو مانی کی تمام تصنیفات ملک میں پہیلی ہوئی تہیں۔ عبد اللہ بن المقفع اور اور مترجموں نے انکا عربی زبان میں ترجمہ کیا' مانی کے سوا مجوسیوں کے اور بانیان مذاہب مثلاً دیسان مرقون کی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور یہ پہلا موقع تہا کہ مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مذہب' اور

---

[۱] جامع لقصص الہندتہ مطبوعہ فرانس۔ [۲] کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۔

مذہبی معلومات سے واقفیت حاصل ہوئی۔ اگرچہ اول اول اسکا یہ اثر ہوا کہ لوگوں میں اعتدال سے زیادہ مذہبی آزادی آگئی اور بعض لوگ الحاد کی طرف مائل ہوگئی یہاں تک کہ ابن ابی العوجا۔ حماد عجرد۔ یحیی ابن زیاد۔ مطیع بن ایاس نے مانی وغیرہ کی تائید میں کتابیں لکھیں[1] تاہم منصور نے آزادی کے لحاظ سے کچھ روک نہیں کی اور سچ پوچھو تو اس سے بڑا نفع یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ایک نیا علم جو **علم کلام** کہلاتا ہے پیدا ہوا جس کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے الحاد اور زندقہ کا راستہ رُک گیا۔

اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ مانی وغیرہ کی کتابوں کے پھیلنے سے جب الحاد کی ہوا چلی تو منصور کے فرزند خلیفہ مہدی نے اپنے عہد حکومت میں اس آگ کو آب تیغ سے بجھانا چاہا چنانچہ سیکڑوں اور ہزاروں آدمی قتل کرادیئے لیکن خیالات کی آزادی جبر و تعدی سے رُک نہیں سکتی تھی آخر اسنے علمائے اسلام کو حکم دیا کہ ملحدوں کے رد میں کتابیں لکھیں اس طرح علم کلام کی بنیاد پڑی۔ ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ مخالفوں کے مذہب اور خیالات کے رد کرنے کے لیے انکی مذہبی تصنیفات سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اسوجہ سے خواہ مخواہ غیر زبانوں کے سیکھنے اور ترجمہ کرنے کا زیادہ تر رواج ہوا۔

مہدی کے بعد جب ہرون الرشید تخت خلافت پر بیٹھا تو اسوقت تک یونانی فارسی سُریانی ہندی تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا ہرون الرشید نے انکو منتظم صورت میں رکھنے کے لیے ایک عظیم الشان محکمہ قائم کیا جسکا نام بیت الحکمہ رکھا اور انہیں ہر زبان اور ہر مذہب کے ماہرین فن ترجمہ کے کام پر مامور کیے انہیں فضل بن نوبخت مجوسی بھی تھا اور وہ خاص فارسی کتابوں کے ترجمہ پر مامور تھا۔ رشید کے دور میں فلسفہ کا بڑا سرمایہ ایک خاص وجہ سے ہاتھ آیا۔ شاہان

[1] مروج الذہب ذکر خلافت قاہر باللہ ۱۲

روم کا معمول تھا کہ خلافت عباسیہ کو سالانہ نذرانہ بھیجا کرتے تھے نایس فورس جو رشید کے عہد میں روم کے تخت سلطنت پر بیٹھا، اسنے نذرانہ بھیجنے سے انکار کیا، اور رشید کو گستاخانہ خط لکھا، اس کے انتقام میں رشید نے ایشیاے کوچک پر جو اسوقت رومیوں کا پاے تخت تھا پی در پی حملے کیے اور دار السلطنت ہرقلہ کو برباد کر دیا، یونان کے بعد یونانی فلسفہ کی تعلم و تعلیم انہی ممالک میں منتقل ہو گئی تہی چنانچہ رشید نے انگوریہ اور اموریہ وغیرہ کو فتح کیا تو بیشمار یونانی کتابیں ہات آئیں۔ رشید نے انکو نہایت احتیاط سے محفوظ رکہا، اور اس زمانہ کے مشہور مترجم کو جسکا نام یوحنا بن ماسویہ تہا، انکے ترجمہ پر مامور کیا[1]۔ یہ تمام کتابیں خزانۃ الحکمۃ میں داخل کی گئیں اور یوحنا خزانۃ الحکمۃ کا افسر مقرر کیا گیا۔

سنسکرت کی علمی تصنیفات اگرچہ منصور کے عہد میں بغداد پہنچ چکی تہیں لیکن اس زمانہ میں اور نئے سامان پیدا ہو گئے۔ ہرون الرشید ایک دفعہ سخت بیمار ہوا اور گو بغداد طبیبوں سے معمور تہا تاہم اسکو کسی کے علاج سے شفا نہیں ہوئی، اسوقت ہندوستان کا ایک طبیب جو فلاسفر بہی تہا شہرت عام رکہتا تہا، اور چونکہ دربار خلافت اور فرمانروایان ہندوستان سے دوستانہ مراسم قائم تہے اور باہم خط کتابت رکہتے تہے۔ سب نے اُسکے بلانے کی رائے دی، غرض وہ طبیب طلب کیا گیا اور بغداد میں برامکہ کا جو ہسپتال تہا اُسکا مہتمم اور افسر مقرر کیا گیا، سنسکرت کی علمی کتابیں اکثر اسنے ترجمہ کرائیں چنانچہ سُشْرت کی کتاب جو ۱۰ بابوں میں ہے اور سامیکا جسمیں زہروں کے علاج کا بیان ہے اسنے ترجمہ کی[2]۔ رشید کے دربار میں اور بہی ہندو طبیب تہے جنکی وجہ سے ویدک کی معلومات عربی زبان میں منتقل ہوئیں۔ انہیں سے صالح (اصلی نام سالی ہوگا) کا حال علامہ ابن ابی اصیبعہ نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے

ہارون کے بعد مامون کا دور آیا اور اسکی بدولت عربی زبان تمام دنیا کے علوم و فنون سے مالا مال

---

[1] طبقات صفحہ ۱۷۵ [2] طبقات جلد دوم صفحہ ۳۳ - وکتاب الفہرست صفحہ ۳۰۳ و ۲۴۵ -

ہو گئی، مامون کی شہزادگی اور ابتدائی خلافت کا زیادہ زمانہ مرو میں گذرا، مامون ماں کی طرف سے عجمی نژاد تہا، اور عجم کی صحبت میں رہکر خود بہی عجمی بنگیا تہا۔ ہر ہر بات میں وہ شاہان عجم کی تقلید کرتا تہا، اور اردشیر کا آئین سلطنت اسکا دستورالعمل تہا[۵۱]۔ دربار میں جسقدر وزرا اور اُمرا تہے مجوسی الاصل تہے جنمیں سے اکثر اسکے ہات پر مسلمان ہو گئے تہے۔ ان باتوں کے ساتھ چونکہ وہ علوم قدیمہ کا نہایت شائق تہا اسلیے فارسی لٹریچر اور علوم و فنون کا بے انتہا سرمایہ اسکے خزانہ میں جمع ہو گیا۔ سنہ ۲۰۴ھ میں وہ خراسان سے بغداد میں آیا۔ یہاں یونانی فلسفہ کا زور شور تہا۔ اسنے اسمیں بہی کمال بہم پہنچایا اور خزانۃ الحکمۃ کو زیادہ وسعت دی، فلسفہ کے ساتھ اسکی شیفتگی اس حد تک پہنچی کہ ایک دن خواب میں دیکھا کہ ایک شخص جسکا یہ حلیہ ہے، سفید رنگ کشادہ پیشانی پیوستہ ابرو، آنکھوں میں سیاہی کے ساتھ نیلاپن تخت پر بیٹھا ہے مامون نے ہیبت زدہ ہو کر نام پوچھا، اسنے کہا ارسطو۔ مامون خوشی سے پہڑک اٹھا اور اس سے سوال و جواب کیئے، اس خواب نے مامون کو فلسفہ کا اور دلدادہ بنا دیا۔ چنانچہ سنہ ۲۱۵ھ میں[۵۲]، قیصر روم کو خط لکہا کہ ارسطو وغیرہ کی جسقدر کتابیں بہم پہنچ سکیں بہنچائی جائیں۔ یہ وہ زمانہ تہا کہ خلفائے عباسیہ کے خطوط، قیصر روم پر فرمان کا اثر رکہتے تہے قیصر تعمیل ارشاد پر آمادہ ہوا اور کتابوں کے بہم پہنچانے کی کوشش کی، ایک عیسائی خانقاہ نشین نے پتہ دیا کہ یونان میں ایک مکان ہے جو قسطنطین کے زمانہ سے مقفل چلا آتا ہے، قسطنطین نے اسمیں فلسفہ کی کتابیں اس خیال سے بند کرا دی تہیں کہ فلسفہ سے مذہب عیسوی کو ضرر پہنچتا ہے"۔ قیصر کے حکم سے یہ مکان کہولا گیا تو بہت سی کتابیں نکلیں۔ قیصر کو حسد ہوا کہ یہ گنجینۂ بے بہا مسلمانوں کے ہات میں جاتا ہے لیکن درباریوں نے تسکین کر دی کہ یہ بلا (فلسفہ) جہاں جائیگی آفت لائیگی۔ غرض پانچ اونٹ پر لدکر یہ کتابیں دارالخلافۃ کو روانہ کی گئیں[۵۳]،

---

[۵۱] مسعودی ذکر خلافۃ قاہر باللہ۔ [۵۲] مقریزی جلد دوم صفحہ ۲۵۷ ۔ وکتاب الفہرست صفحہ ۲۴۳۔

[۵۳] تفصیل۔ تاریخ التواریخ حالات ارسطو کے بیان میں مذکور ہے۔

مامون نے اپنے قاصدوں کے ساتھ اُن بڑے بڑے مترجموں کو بھی بھیجا تھا جو خزانۃ الحکمۃ
کے مہتمم اور یونانی و سُریانی زبان میں کمال رکھتے تھے چنانچہ ان میں سلما۔ حجاج بن مطر۔ ابن البطریق۔
بھی تھے۔ مامون کے دربار میں اگرچہ مترجموں کا ایک گروہ کثیر موجود تھا لیکن چونکہ اسوقت تک ترجمہ
میں اکثر لفظی رعایت کا رواج تھا یعنی مترجمین لفظ کے مقابلہ میں لفظ رکھ دیتے تھے مامون کو ایسے
مترجم کی تلاش تھی جو خود ان فنون میں اجتہاد کا درجہ رکھتا ہو تاکہ ترجمہ کے ساتھ کتاب کے اصلی
مشکلات کو بھی حل کردے ایسے شخص اس زمانہ میں صرف دو تھے حنین و یعقوب کندی حنین
کی لائف جہاں تک اس موقع سے تعلق رکھتی ہے یہ ہے کہ وہ ایک صراف بچہ عیسائی تھا اور حیرۃ میں جو
عراق کا ایک مشہور شہر ہے سکونت رکھتا تھا چونکہ اسوقت عیسائیوں کی بدولت در و دیوار سے تعلیم
کی صدا آتی تھی اسنے ہوش سنبھالکر طب کے سیکھنے کی طرف توجہ کی اس زمانہ میں یونانی فلسفہ کا
بڑا ماہر یوحنا بن ماسویہ تھا جو ہرون الرشید کے خزانۃ الحکمۃ اور دفتر ترجمہ کا افسر تھا حنین اسکے حلقہ درس
میں پہنچا لیکن چند روز کے بعد اُستاد شاگرد میں رقیبانہ شکر رنجی ہوگئی۔ یوحنا نے کہا کہ تم جا کر صرافی
کی دکان کھولو تمکو علم نہیں آسکتا حنین غمزدہ ہوکر روتا اُٹھا اور دل میں ٹھان لی کہ یونانی زبان میں وہ
کمال پیدا کرونگا کہ تمام ملک میں کسی کو ہمسری کا دعوی نہ ہو، ممالک اسلامیہ میں اسوقت یونانی زبان
کا مرکز اسکندریہ تھا وہاں یونانی علم ادب اور فلسفہ کی تعلیم کے بہت سے درسگاہ تھے اسکے علاوہ یونانی نہایت
کثرت سے وہاں آباد تھے اسلیے اسنے اسکندریہ کا رُخ کیا اور وہاں رہکر یونانی زبان حاصل کی۔ چنانچہ یونان کے
مشہور شاعر ہومر کا کلام حفظ یاد کیا کرتا تھا اسکے بعد عربیت کی تکمیل کے لیے بصرہ میں آیا۔ یہاں
خلیل بصری جو عربی علم نحو کا موجد ہے نحو کا درس دیتا تھا اور سیبویہ وغیرہ اسکے حلقہ درس میں بیٹھتے
تھے حنین نے عربی پڑھنی شروع کی اور اسمیں بھی نہایت کمال پیدا کیا فارسی اسکی ملکی زبان تھی غرض
حنین کا ابھی آغاز شباب تھا کہ اسکی شہرت دُور دُور پھیلگئی چنانچہ مامون کو جب ترجمہ کے لیے تلاش ہوئی

تو لوگوں نے اسکا نام لیا۔ مامون نے اسکو بلا کر بیش بہا انعامات دیئے اور ترجمہ کی خدمت متعلق کی۔ مشہور ہے کہ انعامات وغیرہ کے علاوہ **مامون** ہر کتاب کے ترجمہ کے صلہ میں کتاب کے برابر تولکر سونا دیتا تھا' اور شاید یہی وجہ تھی کہ حنین ان ترجموں کو نہایت گندہ کاغذ پر لکھواتا تھا' اور خط نہایت جلی۔ اور صفحہ میں صرف چند سطریں ہوتی تھیں۔

حنین کو یونانی کتابوں کے مہیا کرنے اور ترجمہ کرنے کا عشق تھا' کتابوں کی تلاش میں ملنے ایشیا کوچک کا ایک ایک شہر چھان مارا یہاں تک کہ انتہائے آبادی تک پہنچا۔ خود اسکا بیان ہے کہ جالینوس کی کتاب البرہان کی تلاش میں مینے یہ کوشش کی کہ جزیرہ اور شام کے ایک ایک شہر میں دورہ کیا' فلسطین ومصر میں جستجو کی' اسکندریہ گیا' ان تمام کوششوں پر صرف آدھی کتاب ہات آئی اور وہ بھی نامرتب اور پریشان' ترجمہ کے شوق کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ جب اسکی عمر ۴۸ برس کو پہنچی تو وہ جالینوس کی (۱۲۱) کتابوں اور رسالوں کا ترجمہ کرچکا تھا[۱]۔ (حنین ۱۹۴ھ ہجری میں پیدا ہوا اور ستر برس کی عمر پاکر ۲۶۴ھ میں وفات پائی')

مامون کے دربار کا دوسرا مشہور مترجم یعقوب کندی تھا۔ یعقوب کندی وہ شخص تھا کہ علمائے اسلام نے اسی کو فیلسوف (فلاسفر) کا لقب دیا' بوعلی سینا' اور ابن رشد وغیرہ اس لقب کے مستحق نہیں سمجھے گئے' ابن الندیم نے (کتاب الفہرست صفحہ ۲۹۴) اسکا مستقل تذکرہ لکھا ہے۔

یعقوب کندی کے بدولت عرب پر سے یہ اعتراض اٹھ گیا کہ اب تک نسل عرب سے کوئی شخص غیر زبانوں کا ماہر یا حکیم وفلاسفر نہیں پیدا ہوا۔ مامون الرشید کے زمانہ سے چوتھی صدی کی آغاز تک تمام مسلمانوں میں اسکی تصنیفات رائج تھیں' اور ارسطو کی تصنیفات کے ہم پلہ خیال کی جاتی تھیں' وہ یونانی زبان کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اور یونانی' فارسی' سنسکرت اکے علوم وفنون میں کمال رکھتا تھا اسنے **فلسفہ**

---

[۱] حنین کے متعلق یہ پوری تفصیل ہیں نے طبقات الاطبا تذکرہ حنین اور تذکرہ جالینوس سے لکھی ہے۔ ۱۲

بہت سی کتابیں ترجمہ کیں، اور بڑا کام یہ کیا کہ اصل کتاب میں جو مشکلات اور پیچیدگیاں تھیں اُن کے عقدے حل کر دیئے[1]۔ مامون نے اسکو خاص ارسطو کی کتابوں کے ترجمہ پر مامور کیا کیونکہ ارسطو کے فلسفہ کا سمجھنے والا اس سے بڑھکر کون ہوسکتا تھا۔ علامہ ابن الندیم اور ابن ابی اصیبعہ نے اس کی تصنیفات کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے جس سے اسکے حکیم اور فلاسفر ہونے کی تصدیق ہوسکتی ہے لیکن یہ اُسکے لکھنے کا محل نہیں۔

اسی زمانہ میں قسطا ابن لوقا ایک عیسائی فاضل نے فلسفہ وغیرہ میں بہت کمال حاصل کیا وہ یونانی نسل سے تھا اور یونانی زبان میں نہایت فصاحت سے تقریر کرتا تھا۔ اسکے ساتھ چونکہ بچپن سے شام میں پرورش پائی تھی۔ عربی زبان میں بھی اسکو کمال حاصل تھا۔ وہ یونانی فلسفہ کا نہایت دلدادہ تھا، چنانچہ خاص اس غرض کے لیے اسنے ایشیائے کوچک کا سفر کیا، اور یونانی علم کی بہت سی کتابیں بہم پہنچائیں۔ مامون نے اُسکا حال سُنکر بلا بھیجا اور بیت الحکمۃ میں ترجمہ کے کام پر مامور کیا۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اسنے یونان کی بہت سی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں اور پچھلے ترجموں کی اصلاح کی[2]۔

یہ تمام سامان تو یونانی کتابوں کے ترجمہ کے تھے۔ فارسی اور پہلوی کے ترجمہ کے لیئے مامون نے مجوسی خاندان کے اہل کمال فراہم کیئے سہل بن ہرون ایک مجوسی تھا جو مجوسیوں کے علوم وفنون کا بہت بڑا ماہر تھا، اسکے ساتھ عربی زبان کا ایسا انشاپرداز تھا کہ اس زمانہ کے نہایت فصیح و بلیغ لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا، یہاں تک کہ جاحظ اسکے استادی کا اعتراف کرتا تھا۔ چنانچہ علامہ ابن الندیم نے اسکا نام انشاپردازوں ہی کے ذیل میں لکھا ہے۔ اسنے کلیلہ دمنہ کے طرز پر ایک

---

[1] یعقوب کندی کے لیے دیکھو طبقات الاطبا جلد اول صفحہ ۲۰۷ و کتاب الفہرست صفحہ ۲۵۵۔ اور مونک صاحب کی کتاب۔

[2] دیکھو طبقات الاطباء صفحہ ۲۴۴ جلد اول مختصر الدول حالات یعقوب کندی۔ و کتاب الفہرست صفحہ ۲۹۵۔

کتاب لکھی جسکا نام ثعلہ وعفرا رکہا مامون نے اسکو خزانۃ الحکمۃ میں مقرر کیا اور فارسی کتابوں کے ترجمہ کی خدمت دی۔ سہل کا بہائی سعید بہی نہایت فصیح و بلیغ تہا۔ مامون نے اسکو بہی خزانۃ الحکمۃ میں ترجمہ کے کام پر مامور کیا[۵۱]۔ شاکر کا خاندان بہی خزانۃ الحکمۃ میں کام کرتا تہا۔ لیکن ان لوگوں نے ترجمہ کے کام کو اسقدر وسعت دی کہ ہم آگے چلکر اُن کا جُداگانہ تذکرہ کرینگے۔ انکے سوا سلما اور ابن البطریق و علان شعوبی وغیرہ خزانۃ الحکمۃ میں ملازم تہے۔ ایک ایسا محکمہ جس میں یعقوب کندی، حنین، قسطا بن لوقا، سہل بن ہرون، سعید بن ہرون، سلما، ابن البطریق، حجاج بن مطر، علان شعوبی جیسے ارباب کمال ملازم اور کارپرداز ہوں اُسکی وسعت اور خوبی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مامون کے عہد میں علوم عقلیہ اور دوسری زبانوں سے واقفیت کا ایک اور خاص سبب تہا۔ برمکیوں کی بدولت مناظرہ کی مجلسوں کا جو طریقہ تمام ملک میں جاری تہا ہرون الرشید نے اپنے اخیر زمانہ میں فقہا کے کہنے سے بند کرا دیا تہا جسکا یہ نتیجہ ہوا کہ فلسفہ وغیرہ کی طرف سے لوگوں کا میلان کم ہو چلا۔ مامون کے زمانہ سے پہلے یہ بات مشہور ہو چکی تہی کہ دنیا میں اسلام بزور شمشیر پہیلا۔ کیونکہ اگر اسلام خود اپنی خوبیوں کی وجہ سے پہیل سکتا۔ تو لوگوں کو مناظرہ اور مباحثہ سے کیوں روکا جاتا۔ مامون نے یہ شہرہ سُنکر بغداد میں ایک بہت بڑا مجمع کیا۔ اور تمام ملک میں جسقدر پیشوایان مذہب اور مختلف فرقوں کے لوگ تہے سب طلب کیے گئے۔ فرقہ مانویہ کا سردار جسکا نام **یزداں بخت** تہا ری سے بلایا گیا۔ اور مامون نے اسکو خاص ایوان شاہی کے قریب اُتارا۔ اس جلسہ میں علمائے **کلام** نے تمام مخالفین اسلام پر فتح حاصل کی[۵۲] اور لوگوں پر علانیہ ثابت ہو گیا کہ اسلام کی اشاعت تلوار سے نہیں بلکہ زبان و قلم سے ہوئی اور ہو سکتی ہے۔ اسکے بعد مامون نے نہایت فراخ حوصلگی سے حکم دیا

۵۱۔ ان دونوں کا حال فہرست ابن الندیم صفحہ ۱۲۰ میں مذکور ہے ۱۲

۵۲۔ ان حالات کیلیے دیکہو کتاب الملل والنحل یحیی المرتضی اور مروج الذہب مسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ و کتاب الفہرست صفحہ ۳۳۰

کہ تمام ملک میں مناظرہ اور بحث کے عام جلسے قائم کیے جائیں، اور ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کو
عام اجازت دیجائے کہ اپنے مذہب کا اثبات اور دوسرے مذاہب پر نکتہ چینی کریں۔ ان مجلسوں
کی وجہ سے تمام مسلمانوں کو فلسفہ اور علوم عقلیہ کی طرف میلان ہوا کیونکہ دوسرے مذاہب کے رد کرنے
کے لیے فقہ اور حدیث وغیرہ کام نہیں آسکتے تھے۔ اسکے ساتھ چونکہ دوسری قوموں کے مذہبی مسائل
معلوم کیے بغیر انکے مذہب کا رد نہیں ہوسکتا تھا، اسلیے خواہ مخواہ دوسری قوموں کی زبان سیکھنی پڑی
مامون کے بعد معتصم تخت حکومت پر بیٹھا وہ جاہل محض، اور سپاہیانہ مذاق کا آدمی تھا،
اگرچہ اسکے عہد میں سلطنت کی شوکت وشان کو نہایت ترقی ہوئی۔ رومیوں پر اسنے آٹھ متواتر حملے
کئے۔ اور عموریہ کے معرکہ میں تو گویا۔ رومیوں کی سلطنت کی جڑ ہلا دی۔ لیکن علمی فتوحات کو کچھ ترقی نہ
نہ دیسکا۔ البتہ عقلی علوم میں کچھ مزاحمت بھی نہیں کی، اسلیے جو لوگ اپنے شوق سے ان کاموں میں
مصروف تھے بدستور مصروف رہے۔ لیکن جب معتصم کے بعد ۲۲۷ھ میں خلیفہ واثق باللہ مسند آرا ہوا
تو ترجمہ کے کام کو نئے سر سے رونق حاصل ہوئی۔ وہ تقلید کا سخت مخالف تھا اور ہر فرقہ وہر مذہب کو
نہایت آزادی سے اظہار خیالات کا مجاز کیا تھا، تمام بڑے بڑے مشہور مترجم اور فلاسفر اس کے
دربار میں حاضر رہتے تھے اور وہ اُنسے فلسفیانہ بحثیں کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ ایک صحبت کا حال جسمیں
ابن بختیشوع۔ ابن ماسویہ۔ میخائیل۔ حنین بن اسحاق۔ سلمویہ وغیرہ بھی موجود تھے۔ علامہ مسعودی نے
نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ حنین بن اسحاق سے وقتاً فوقتاً اسنے جو علمی مسائل دریافت کیے انکو
حنین نے ایک مستقل کتاب میں لکھا ہے جسکا نام کتاب المسائل الطبیعۃ ہے۔ یوحنا بن ماسویہ مشہور مترجم
جسکو ہرون الرشید نے خزانۃ الحکمۃ کا افسر مقرر کیا تھا۔ واثق نے اسکو اپنا ندیم خاص قرار دیا۔ اور
دولت ومال سے مالامال کردیا۔ چنانچہ ایک موقع پر تین لاکھ درہم عطا کیے[۱]۔ واثق کے بعد متوکل باللہ

---

[۱] مروج الذہب مسعودی ذکر خلافۃ واثق باللہ وطبقات الاطبا تذکرہ یوحنا بن ماسویہ ۱۲

خلیفہ ہوا۔ وہ اگرچہ محض ملّایانہ طبیعت کا آدمی تھا چنانچہ مناظرہ کے جلسے بالکل بند کرا دیے لیکن ترجمہ کے کام پر اسکو بھی توجہ رہی، حنین بن اسحاق کو ترجمہ کے محکمہ کا افسر مقرر کیا' اور بہت سے زباندان مترجم جنمیں حطفن بن لبیس اور موسیٰ بن خالد بھی داخل تھے اسکی ماتحتی میں دیئے۔ یہ لوگ ترجمہ کرتے تھے اور حنین انکو اصلاح کی نظر سے دیکھتا تھا اور درست کرتا تھا[1]۔ متوکل نے حنین کی قدردانی بے انتہا کی اسکے رہنے کے لیے خاص شاہی ایوانات میں سے تین بڑے بڑے محل عنایت کیئے اور اس خیال سے کہ آیندہ کوئی اسکے قبضہ سے نکالنے نہ پائے شرعی گواہی کرا دی یہ بھی حکم دیا کہ وہ ہر قسم کے اسباب و سامان سے سجا دی جائیں۔ اور کتب خانہ بھی وہیں مہیا کر دیا جائے اسکی ساتھ پندرہ ہزار ماہوار تنخواہ مقرر کر دی **متوکل** کے بعد عباسیوں کی سلطنت برائے نام رہگئی لیکن اس سلسلہ سے الگ جو اسلامی حکومتیں قائم ہو گئیں انکو ہمیشہ اس کام کی طرف توجہ رہی۔

سیف الدولہ کے دربار میں عیسیٰ رقی اس خدمت پر مامور تھا اور سُریانی سے عربی میں ترجمہ کرتا رہتا تھا[2]۔ اندلس میں عبدالرحمن ناصر ترجمہ کا بڑا شائق تھا۔ چنانچہ اسکے عہد کے بعض کارنامے آگے آئینگے۔ ساسانی خاندان نے **پہلوی** زبان سے تاریخ کا بہت کچھ سرمایہ مہیا کیا تھا اور درحقیقت یہی سرمایہ تھا جس سے فردوسی نے شاہنامہ کی نقش آرائی کی۔ **ہندوستان** میں سلطان فیروز شاہ جب ۷۷۲ھ میں جوالامکھی پہاڑ کی سیر کو گیا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے بتخانہ میں ۱۳ سو سنسکرت کے قدیم تصنیفات موجود ہیں۔ فیروز شاہ نے وہ کتابیں حضور میں طلب کیں اور انکے ترجمہ کا اہتمام کیا۔ نجوم کی ایک کتاب کا ترجمہ عزالدین نے نظم میں کیا اور دلائل فیروزی نام رکھا۔ یہ کتابیں اکثر موسیقی اور کشتی کے فن میں تھیں۔ عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۰۰۰ھ میں جب میں لاہور پہنچا تو یہ ترجمہ شدہ کتابیں میری نظر سے گذریں۔ **اکبر شاہ** کو

[1] طبقات الاطباء جلد اول صفحہ ۱۸۹۔ [2] طبقات الاطباء جلد دوم صفحہ ۱۴۰۔

سنسکرت کی کتابوں کا جو اہتمام تھا وہ عام طور سے مشہور ہے خلفا اور سلاطین کے علاوہ اکثر ارباب دولت نے بھی اس صیغہ کو بہت وسعت دی اور ان میں سے بعضوں کا تذکرہ اس مقام پر ضرور ہے۔ اس فخر کا طرّہ جسکے سر پر ہے وہ برامکہ کا خاندان ہے اور انصاف یہ ہے کہ دولت عباسیہ میں جو کچھ کام ہوا اسکا بڑا حصہ برامکہ ہی کی بدولت تھا۔ اس خاندان کا مورث اعلیٰ برمک بلخ کی مشہور آتشکدہ کا جسکو مجوسی کعبہ کا جواب سمجھتے تھے۔ مہتمم اور افسر تھا۔ اسکا بیٹا **خالد** اسلام لایا اور دولت عباسیہ کے آغاز میں وزیر رہکر منصور کے زمانہ میں قضا کی۔ خالد کا بیٹا یحییٰ بن خالد۔ ہرون الرشید کے عہد تک وزارت پر ممتاز رہا۔ چونکہ یہ خاندان اصل میں مجوسی تھا اور آتشکدہ کے تعلق سے مجوس کی کل قوم سے انکو واسطہ رہا تھا اسیلئے فارسی کا سرمایۂ علمی جسقدر وہ مہیا کرسکتے تھے کوئی شخص نہیں کرسکتا تھا۔

ایک بڑا سبب انکے زمانہ میں ترجموں کی ترویج کا یہ ہوا کہ اسلام میں سب سے پہلے اسی خاندان نے علمی عام جلسوں کی بنیاد ڈالی۔ یحییٰ بن خالد خود اپنے ہاں مناظرہ کی مجلس منعقد کراتا تھا جسمیں ہر فرقہ اور ہر قوم کے آدمی شامل ہوتے تھے۔ اور جو نہایت ترتیب اور حسن انتظام سے انجام پاتی تھی یحییٰ کے دربار میں ہشام بن حکم مشہور متکلم تھا جسکو مجلس کا سکرٹری مقرر کیا تھا[۵۱] یحییٰ پہلا شخص ہے جسنے ہندوستان کے پنڈتوں فلاسفروں اور طبیبوں کو طلب کیا[۵۲]۔ اور اُنسے سنسکرت کی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ کلیلہ دمنہ کا دوسرا ترجمہ جو عبداللہ بن ہلال اہوازی نے ۱۶۵ھ میں کیا یحییٰ کے حکم سے کیا۔ مجسطی کا سب سے اول ترجمہ اسی کے حکم سے کیا گیا معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ خود ان فنوں میں کمال رکھتا تھا ابن الندیم نے لکھا ہے کہ جب مجسطی کے متعدد ترجمے اسکے سامنے پیش ہوئے تو اسنے سب کو ناپسند کیا اور ابو حسان وسلما کو حکم دیا کہ دوبارہ انکی اصلاح کریں چنانچہ ان دونوں نے بہت

[۵۱] کتاب الفہرست صفحہ ۱۷۵۔ [۵۲] کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۵۔

اعلیٰ درجہ کے مترجم جمع کیے اور ان کے ترجموں کا باہم موازنہ اور مقابلہ کر کے ایک نہایت عمدہ نسخہ مرتب کیا۔ براکمہ کے خاص مترجم۔ سلام ابرش۔ عبداللہ بن بلال۔ مانک ہندو۔ ابن دہن ہندو وغیرہ تھے۔ عمر بن فرخان جسکو رئیس المترجمین کا لقب حاصل ہے اسی دربار کا مترجم تھا۔

دوسرا خاندان جسنے ترجمہ کے کام میں مدد دی موسی ابن شاکر کا خاندان ہے۔ موسی اصل میں ایک رہزن تھا اور اسی پیشہ سے اسکی بسر اوقات تھی اخیر میں اسنے توبہ کی اور غالباً بہادری کے جوہر کی وجہ سے مامون کے دربار میں ملازم ہوگیا چند روز کے بعد تین اولاد چھوڑ کر مر گیا۔ مامون کا ایک یہ بھی اصول تھا کہ وہ ہونہار نسلوں کی پرداخت اور تربیت بڑے اہتمام سے کرتا تھا۔ چنانچہ عجم کے بہت سے خاندان مثلاً سامانی خاندان۔ آل طولون وغیرہ اسی کی تربیت کی وجہ سے بڑے مناصب پر پہنچے اور اور انکے ہاتھ سے بڑے بڑے کام انجام پائے۔ مامون نے موسی کی اولاد کی تربیت بڑے اہتمام کے ساتھ کی یہاں تک کہ جب وہ ایشیائے کوچک کی لڑائیوں میں مصروف تھا تو اسوقت بھی وہاں سے انکی خبرگیری کے متعلق اسکے احکام آتے رہتے تھے غرض یہ تینوں بھائی جنکے نام محمد۔ حسن۔ احمد تھے بڑے صاحب کمال ہوئے محمد تمام علوم قدیمہ کا بڑا ماہر تھا۔ احمد نے خاص مکانک کے علم میں وہ بات پیدا کی اور وہ مسائل ایجاد کیے کہ یونانیوں کے خیال میں نہیں آئے تھے۔ اسکی کتاب الحیل اس بات کی پوری دلیل ہے۔ حسن کو ہندسہ میں کمال تھا اور بہت سے مسائل ایجاد کیے تھے جنمیں سے ایک زاویہ کا تین مساوی حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔

اس فضل و کمال کے ساتھ انکو یونانی علوم و فنون کے ترجمہ کی طرف توجہ ہوئی اور اسمیں اسقدر انہماک ہوا کہ اپنی تمام طاقت اسپر صرف کردی۔ خوش قسمتی سے دولت اور مال نے بھی انکا ساتھ دیا تھا چنانچہ صرف بڑے بھائی کی سالانہ آمدنی چار لاکھ اشرفیاں تھیں۔ ان لوگوں نے ایشیائے کوچک کے تمام شہروں میں کارندے بھیجے اور بیشمار کتابیں بہم پہنچائیں۔ نہایت دور دراز مقامات سے

جہاں کسی مترجم کا پتہ لگا بلوا کر ترجمہ پر مامور کیا[51]۔ ثابت بن قرۃ جو اپنے زمانہ میں راس المترجمین تھا ہی خاندان کا تربیت یافتہ تھا۔ ثابت نے علاوہ ترجمہ کے بہت سے قدیم ترجموں کی اصلاح کی اور آج اکثر اسکی اصلاح کردہ کتابیں موجود ہیں۔ ثابت صرف مترجم نہیں بلکہ خود حکیم اور صاحب تصنیف تھا اسکی تصنیفات سُریانی زبان میں بھی موجود ہیں۔ ثابت کا ایک شاگرد عیسی بن اسید جو عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ سُریانی میں نہایت کمال رکھتا تھا۔ چنانچہ اسنے سُریانی زبان کی بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔

ان لوگوں کے سوا جن قدر دانوں نے ترجمہ کے صیغہ کو وسعت دی انکے نام اور مختصر حالات ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوں گے[52]۔

نام	کیفیت
محمد بن عبد الملک الزیات	یہ خلیفہ معتصم باللہ کا وزیر تھا۔ بہت سی یونانی کتابوں کے ترجمے اس کے اہتمام سے ہوئے بڑے بڑے مشہور مترجم مثلاً یوحنا۔ جبرئیل۔ بختیشوع۔ داؤد بن سرابیون۔ سلمویہ۔ الیسع۔ اسرائیل بن زکریا۔ حبیش بن الحسن وغیرہ نے اسکے لیے کتابیں ترجمہ کیں۔ اس کام میں اسکے دس ہزار ماہوار صرف ہوتے تھے۔
شیر شوع بن قطرب۔	جندی سابور کا رہنے والا تھا۔ مترجموں پر نہایت فیاضی کرتا تھا۔ اس نے زیادہ تر سُریانی زبان میں ترجمے کرائے۔
علی بن یحیی معروف با بن المنجم۔	مامون کا منشی اور ندیم تھا۔ اسکو خاص طب کی کتابوں کی طرف میلان تھا۔
نادری۔	یہ بغداد کا بشپ تھا۔ کتابوں کے جمع کرنے اور ترجمہ کرانے کا نہایت شائق تھا۔
محمد بن موسی بن عبد الملک۔	یہ خود بہت بڑا فاضل تھا۔ اور کتابوں کی خوبی اور بُرائی کی نہایت صحیح جانچ کرتا تھا۔

[51] اس تمام تفصیل کے لیے دیکھو کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۳ و ۲۷۱۔ و تاریخ الحکما رجمال الدین القفطی ۱۲۔

[52] اس فہرست کے لیے دیکھو طبقات الاطبا رجلد اول صفحہ ۲۰۳۔

نام	کیفیت
عیسیٰ بن یونس کاتب۔	عراق کا رہنے والا تہا۔ یونانی کتابوں کا زیادہ تر شائق تہا۔
احمد بن محمد المعروف ابن المدبر	مترجموں کو بیش بہا انعامات اور صلہ دیتا تہا۔
علی المعروف بہ قیوم۔	ایضاً
ابراہیم بن ابن موسی الکاتب	خاصکر یونانی کتابوں کا زیادہ شائق تہا۔
عبداللہ بن اسحاق	ترجمہ کے ساتھ اسکو بے انتہا شغف تہا۔
بختیشوع بن جبریل۔	بغداد کے تمام اطبا میں کوئی شخص دولت و مال کے لحاظ سے اسکا ہمسر نہ تہا۔ دس پندرہ لاکھ سال کی آمدنی تہی۔ جالینوس کی اکثر کتابیں اسکے لیے ترجمہ کی گئیں۔

رفتہ رفتہ اس مذاق کو اسقدر ترقی ہوئی کہ سلاطین و امرا کی طرف سے کسی قسم کی ترغیب و تحریص کی ضرورت نہیں رہی۔ اکثر ارباب کمال خود اپنے شوق سے غیر زبانیں سیکھتے تہے اور کتب علمیہ کے ترجمے کرتے تہے۔ انہیں سے سعید بن یعقوب جو سنہ ۳۰۲ھ میں بغداد اور مکہ و مدینہ کے ہسپتالوں کا انسپکٹر جنرل تہا۔ اور متی بن یونان المتوفی سنہ ۳۲۸ھ جسنے سُریانی زبان سے بہت سی کتابیں ترجمہ کیں اور یحییٰ بن عدی جو حکیم فارابی کا شاگرد اور سُریانی زبان کا بہت بڑا ماہر تہا۔ اور ابو علی بن زرعہ جو بہت بڑا منطقی اور مترجم تہا زیادہ مشہور ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے انکے حالات کسی قدر تفصیل سے لکہے ہیں۔

اخیر زمانہ میں مختلف اسباب کی وجہ سے سنسکرت کے علمی خزانوں پر زیادہ دسترس ہوا۔ سلطان علی مردکے زمانہ میں ایک پنڈت جسکا نام بہوجر تہا، مسلمانوں سے مباحثہ کرنے کے لیے بنارس سے روانہ ہوا اور شہر الکفوت پہنچکر قاضی رکن الدین سمرقندی سے ملاقات کی۔ مباحثہ کا ارادہ چھوڑکر قاضی صاحب سے عربی پڑہنی شروع کی۔ اور ایک کتاب جسکا نام انبرت کنڈ تہا انکی خدمت میں

نذر گذرانی۔ قاضی صاحب نے اسکے مطالب سُننے تو ایسے گرویدہ ہوے کہ بھوجر سے سنکرت پڑہنی شروع کی سنسکرت میں کمال حاصل کرکے اس کتاب کا ترجمہ کیا لیکن بعض بعض مقامات حل شدہ رہ گئے اتفاق سے بھوجر کا ایک شاگرد جسکا نام ابہوانا تہ تہا ہندوستان سے چلکر اس طرف آنکلا۔ ایک سنسکرت دان عالم نے اُس سے یہ کتاب پڑہی اور عربی زبان میں اسکا دوبارہ ترجمہ کیا اور مرأۃ المعانی لادراک العالم الانسانی اسکا نام رکہا۔ میں نے خود اس ترجمہ کا ایک قدیم نسخہ دیکھا ہے۔

محمد بن اسمعیل تنوخی ایک عالم نے ہئیت و نجوم سیکہنے کے لیے خود ہندوستان کا سفر کیا اور برسوں وہاں رہکر ان علوم کی تحصیل کی۔ اس قسم کی اور بہی مثالیں ہیں لیکن اس سلسلہ میں ابوریحان بیرونی کا قدم سب سے آگے ہے۔ پروفیسر زخاؤ۔ جرمن کا نہایت مشہور عالم ہے اسنے بیرونی کی کتاب الہند کی دیباچہ میں لکھا ہے کہ سکندر کے ساتھ جو یونانی مصنف موجود تہے انہوں نے ہندوستان کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ چینی مسافروں نے بہی خود اپنی ذاتی واقفیت سے اس ملک کے حالات قلمبند کیے ہیں لیکن ابوریحان بیرونی نے جب ہندوستان کا سفر کرکے وہاں کے علوم و فنون اور رسم و عادات پر کتاب لکہی تو تمام پچہلی تصنیفیں بازیچہ اطفال بنگئیں۔

ابوریحان بڑا ریاضی داں عالم تہا اور شیخ بو علی سینا کا معاصر اور بہت سے علوم میں اسکا حریف مقابل تہا۔ اسنے ہندوؤں کے علوم حاصل کرنے کے لیے جو محنتیں اُٹہائیں وہ حقیقت میں تعجب انگیز ہیں خود اسکا بیان ہے "اس زبان کے سیکہنے میں مجکو نہایت مصیبتیں پیش آئیں۔ ہندوؤں کا تعصب اسقدر بڑہا ہوا ہے جسکی کچھ انتہا نہیں وہ ہم مسلمانوں کو ملچھ کہتے ہیں۔ ہم سے جو چیز چہو جائے انکے نزدیک ناپاک ہوجاتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو ہمارے نام سے ڈراتے ہیں اور ہمکو شیطان کہتے ہیں۔ ان سب باتوں کے ساتہ وہ تمام دنیا کو جاہل اور وحشی سمجہتے ہیں"۔ ایک بڑی مشکل یہ تہی کہ ہندو اسکو کتابوں کو دینے میں

سلہ جامع القصص الہندیہ ۱۲

نہایت بخل کرتے تھے حالانکہ وہ کتابوں کے خریدنے میں بیدریغ روپیہ خرچ کرتا تھا۔ غرض ان تمام مشکلات کے ساتھ جس طرح ہو سکا اسنے سنسکرت زبان حاصل کی اور نہایت کمال درجہ پر حاصل کی بہت سی مفید کتابوں کے ترجمے کیے۔ بعض کے خلاصے لکھے چنانچہ انکا بیان آگے چلکر ہم تفصیل سے لکھینگے

مترجموں کا بیشمار گروہ جو رات دن ترجمہ کے کام میں مصروف تھا اگرچہ ہم انکے نام اور حالات استقصاء کے ساتھ نہیں بتا سکتے تاہم "مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ" کی بنا پر ہم انکی ایک اجمالی فہرست حروف تہجی کی ترتیب سے لکھتے ہیں۔

مترجمین زبان فارس

نام	کیفیت
عبداللہ بن المقفع	اسکا ذکر اوپر گذر چکا۔
فضل بن نوبخت	(فہرست ۲۷۴)
ابوسہل اسمعیل بن علی بن نوبخت	بہت بڑا عالم تھا اسکے ہاں متکلمین کی مجلس منعقد ہوا کرتی تھی۔ بہت سی کتابیں اسکی تصنیف ہیں۔ (فہرست ۱۷۶)
حسن بن موسی بن نوبخت ابی سہل	اسکے ہاں اکثر مترجمین مثلاً ابوعثمان دمشقی۔ اسحاق۔ ثابت وغیرہ کا مجمع رہتا تھا۔ (فہرست ۱۷۷)
حسن بن سہل	مشہور منجم تھا۔ (فہرست ۲۴۲ و ۲۷۵)۔
موسی بن خالد	داؤد بن عبداللہ بن حمید بن قحطبہ کے ہاں ترجمہ کے کام پر مامور تھا (فہرست ۲۴۴)
یوسف بن خالد	ایضاً۔
ابوالحسن علی بن زیاد التمیمی	شہریار کے زیچ کا اسنے ترجمہ کیا تھا۔ (فہرست ۲۴۴)
احمد بن یحیی البلاذری	مشہور مورخ ہے فتوح البلدان جسکے اکثر حوالے میری تصنیفوں میں ہیں اسکی تصنیف ہے (فہرست ۲۴۲)

جبلہ بن سالم	اوپر گذر چکا۔
اسحاق بن یزید	سیرۃ الفرس اسی نے ترجمہ کی تہی۔ (فہرست ۲۴۵)
محمد بن جہم البرمکی	مشہور مصنف ہے (فہرست ایضاً)
ہشام بن القاسم	(فہرست ایضاً)
موسی بن عیسی الکردی	(فہرست ایضاً)
زادویہ بن شاہویہ الاصفہانی	ایران کی تاریخیں جو اسنے ترجمہ کیں اکثر اسکے حوالے کتابوں میں مذکور ہیں (فہرست ایضاً)
محمد بن بہرام بن مطیار الاصفہانی	(فہرست ایضاً)
بہرام بن مردان شاہ	نیشاپور کا موبد موبدان تہا۔ (فہرست ایضاً)
عمر بن فرخان الطبری	گذر چکا۔
عبداللہ بن علی	(فہرست صفحہ ۳۰۲)
سہل بن ہرون	اوپر گذر چکا
سعید بن ہرون	〃
اسحاق بن علی	(فہرست ۳۱۵)
عبداللہ بن ہلال آہواز	مترجم کلیلہ و دمنہ للبرامکۃ۔
	مترجمین زبان سُریانی [1]
ماسرجیس یہودی	
عیسی بن ماسرجیس	اوپر گذر چکا
ہیشدی کرخی۔	〃

[1] دیکھو کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۴ - وطبقات الاطباء جلد اول صفحہ ۲۰۳ و ۲۰۴ —

	کیفیت
ابن شہدی کرخی	بقراط کی کتاب الاجنة کا اسنے ترجمہ کیا تھا۔
ایوب الرہاوی	نہایت عمدہ ترجمہ کرتا تھا۔
یوحنا بن بختیشوع	
منصور بن باناس	سریانی زبان عمدہ جانتا تھا۔
مرلاحی	علامہ بن الندیم کا معاصر تھا۔
دارشوع	اسحاق بن سلیمان کے مترجموں میں تھا۔
ایوب بن قاسم الرقی	ایساغوجی کا ترجمہ اسی نے کیا تھا۔
متی بن یونان	اوپر گذرا۔

مترجمین زبان سنسکرت

منکہ	اوپر گذرا۔
ابن دہن	اسکے باپ کا نام دہن تھا اور اسکی طرف منسوب ہوکر یہ ابن دہن کہلاتا تھا۔ بغداد کے ہسپتال کا جسکو برامکہ نے قائم کیا تھا افسر تھا۔ (فہرست صفحہ ۲۴۵)
اسمٰعیل تنوخی	
ابوریحان بیرونی	اوپر گذرا۔
فیضی	اکبر کے دربار کا مشہور شاعر تھا۔

مترجمین زبان یونانی ولاطینی ونیز سریانی۔

اصطفن	اوپر گذرا۔
طریق	منصور کے دربار کا مشہور مترجم تھا۔

یحییٰ بن بطریق	مذکورالصدر کا فرزند حسن بن سہل (وزیر مامون الرشید) کے دربار میں تھا۔
حجاج بن مطر	مشہور مترجم مجسطی اور اقلیدس کا ترجمہ اسی نے کیا تھا۔
عبدالمسیح ابن ناعمۃ الحمصی	
سلام ابرش	برامکہ کا مشہور مترجم۔
حبیب بن بہریز	موصل کا بشپ تھا۔ مامون الرشید کے لیے ترجمے کیے۔
زرویا بن ماتحوۃ الحمصی	عمدہ ترجمہ کرتا تھا۔
ہلال بن ابی ہلال الحمصی	فصیح بلیغ نہ تھا لیکن ترجمہ صحیح کرتا تھا۔
فثیون	اسکے ترجمہ میں غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ عربی نہیں جانتا تھا۔
تذاری	
ابونصر بن ادی بن ایوب	
بسیل	بہت سی کتابیں ترجمہ کیں۔ عمدہ ترجمہ کرتا تھا۔
ابونوح بن الصلت	
اصطاث	متوسط درجہ کا مترجم تھا۔
حیرون بن رابطہ	
اصطفن بن بسیل	حنین کے قریب قریب ترجمہ کرتا تھا۔
بن رابطہ	
موسیٰ بن خالد	جالینوس کی اکثر کتابیں ترجمہ کیں
تیوفیلی	
شملی	
عیسیٰ بن نوح	

ابراہیم قویری	بہت بڑا منطقی تھا۔ متی بن یونان اسی کا شاگرد تھا۔
تدرس	فلسفہ کی کتابیں ترجمہ کیں۔
داریع راہب	
ہیا ہیشون	
صلیبا	
ایوب ادہی	
ثابت بن قمع	
ایوب	یہ دونوں محمد بن خالد بن یحییٰ برمکی کے ہاں ملازم تھے۔
سمعان	
باسیل	طاہر ذو الیمینین کے ہاں ملازم تھا۔
ابو عمرو یوحنا بن یوسف	فلاطوں کی کتاب آداب الصبیان کا ترجمہ اسی نے کیا تھا۔
قسطا بن لوقا البعلبکی	مشہور مترجم۔
حنین بن اسحاق	مشہور مترجم
اسحاق بن حنین	مشہور مترجم
ثابت بن قرۃ	مشہور مترجم
حبیش الاعسم	مشہور مترجم حنین بن اسحاق کا بھانجا تھا۔
عیسیٰ بن یحییٰ بن ابراہیم	حنین بن اسحاق کا شاگرد
ابراہیم بن الصلت	متوسط درجہ کا ترجمہ کرتا تھا۔
ابراہیم بن عبداللہ	

نام	کیفیت
یحییٰ بن عدی	مشہور مترجم
تفلسی	
سرجس	راس العین کا رہنے والا تہا۔ حنین نے اسکے ترجموں کی اصلاح کی ہے
یوسف بن عیسیٰ المتطبب	خوزستان کا رہنے والا تہا۔
ثابت الناقل	جالینوس کی کتاب الکیموس اسی نے ترجمہ کی۔
قیضا الرہاوی	حنین کا مددگار تہا۔
عبدیسوع بن بہریز	
ابو سعید عبید بن یعقوب	مشہور مترجم
ابراہیم بن بکس	مشہور طبیب اور مترجم تہا۔
ابو الحسن علی بن ابراہیم	باپ کا ہمسر تہا۔

ترجمہ کا طریقہ اور اسکی صحت

ترجمہ کا اول اول یہ طریقہ تہا کہ اصل میں جو لفظ ہوتا تہا۔ اسکے ہم معنی الفاظ ڈہونڈ کر لفظی ترجمہ کرتے جاتے تہے چنانچہ یوحنا ابن بطریق اور ابن ناعمۃ حمصی کا یہی طرز تہا لیکن اسمیں دو دقتیں تہیں۔ اولاً تو ہر لفظ کے مقابل میں ایسا لفظ ملنا جو تمام خصوصیتوں کے لحاظ سے اسکا ہم معنی ہو ناممکن یا قریب ناممکن کے ہے دوسرے لفظی ترجمہ سے مطلب اچہی طرح سمجہ میں نہیں آتا تہا۔ ان خرابیوں کو دیکہکر دوسرا طریقہ اختیار کیا گیا یعنے یہ کہ پوری عبارت کا مطلب عبارت میں ادا کرتے تہے۔

غالباً یہ طریقہ حنین سے شروع ہوا اور پہر اور لوگوں نے بہی تقلید کی۔ لیکن چونکہ اکثر ترجمے پہلی قسم کے ہی

موجود تھے اسلیے اصلاح کا طریقہ ایجاد ہوا یعنے ان ترجموں میں جہاں جہاں ابہام اور پیچیدگیاں تھیں رفع کردی گئیں۔ چنانچہ پچھلے بڑے بڑے نامور مترجم مثلاً ثابت بن قرہ یحییٰ بن عدی وغیرہ نے ترجمہ کی زیادہ پچھلے ترجموں کی اصلاحیں کیں اور درحقیقت ان اصلاحوں سے بڑا فائدہ ہوا[1]۔

آجکل یورپ کے ناسپاس مصنف طعنہ دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے علمی دنیا پر جو احسان کیا وہ صرف اسقدر کہ یونانی کتابوں کو بعینہ عربی میں ترجمہ کردیا جس سے یونانی کتابیں محفوظ رہگئیں لیکن وہ اس بات کو نظر انداز کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے صرف اسی قدر نہیں کیا بلکہ دنیا کو اُن کتابوں کے مطالب سمجھا دیے جو خود یونان کے شارحوں نے نہیں سمجھے تھے۔ ارسطو و افلاطون کی تحریر کا یہ طرز تھا کہ دانستہ مضمون کو پیچیدہ طور پر ادا کرتے تھے یہاں تک کہ خود ارسطو نے جب کسی قدر اپنی تحریرات میں توضیح سے کام لیا تو افلاطون نے نہایت زجر کے ساتھ اسکو خط لکھا کہ تم علم کو مبتذل اور پامال کرتے ہو۔ ارسطو نے جواب میں لکھا کہ "میں نے پھر بھی ایسی پیچیدگیاں رکھی ہیں کہ اکثر لوگ اصل مطلب کی تہ کو نہیں پہنچ سکتے"

یہی وجہ تھی کہ خود یونانی مصنفوں نے ان دونوں حکیموں کے مطلب سمجھنے میں غلطیاں کیں اور رفتہ رفتہ دو جدا فرقے پیدا ہو گئے۔ حکیم ابو نصر فارابی نے ایک کتاب لکھی ہے جسکا نام **الجمع بین الرائین** ہے یہ کتاب یورپ میں چھپ گئی ہے۔ اسمیں حکیم مذکور نے دکھایا ہے کہ افلاطون و ارسطو کا طرز تحریر کیا تھا اور اسکی وجہ سے زمانہ مابعد میں یونان وغیرہ کے مصنفین نے کیسی غلطیاں کیں۔ فارابی نے پھر ان غلطیوں کو درست کیا ہے اور ارسطو و افلاطون کی عبارتوں کا حل کر کے بتایا ہے کہ ان دونوں حکیموں میں کچھ اختلاف نہیں۔

ترجموں کی درستی اور صحت میں جو اہتمام بلیغ کیا جاتا تھا اُسکے اندازہ کرنے کے لیے اس مقام پر ایک واقعہ کا نقل کرنا کافی ہوگا۔ مفرد دواؤں کے بیان میں یونان کی سب سے عمدہ تصنیف دیسقوریدس

[1] ترجموں کے ان دونوں طریقوں کا ذکر بہاء الدین عاملی نے اپنی کشکول میں بحوالہ صلاح الدین صفدی کیا ہے ۱۲

کی کتاب ہے۔ یہ کتاب المتوکل باللہ کے زمانہ میں اصطفن بن بسیل نے ترجمہ کی۔ اور حنین نے اسپر نظر ثانی کرکے درست کیا لیکن جن دواؤں کے نام عربی میں نہ تھے اُنکے نام یونانی رہنے دیئے یہی ترجمہ اسپین پہنچا لیکن یونانی الفاظ کی وجہ سے عام طور پر لوگ منتفع نہیں ہو سکتے تھے سنہ ۳۳۷ھ میں جو عبدالرحمٰن ناصر کی حکومت کا زمانہ تھا۔ قیصر روم نے (جسکا نام مارنیس تھا) اصل کتاب جس میں دواؤں اور بوٹیوں کی تصویریں بہی بنی ہوئی تہیں عبدالرحمٰن کو تحفہ میں بہیجی۔ عبدالرحمٰن کے دربار میں اگرچہ لاطینی زبان جاننے والے موجود تھے لیکن قدیم یونانی زبان بالکل متروک ہوگئی تھی اسوجہ سے اطبا اور حکما جو اس کتاب کے حل کرنے کے نہایت شائق تھے۔ یونانی الفاظ میں مجبور ہو جاتے تھے۔ عبدالرحمٰن نے خط لکھکر قیصر روم کے ہاں سے ایک عیسائی عالم کو بلوایا جو یونانی اور لاطینی دونوں زبانوں کا ماہر تھا سنہ ۳۴۰ھ میں وہ دربار میں پہنچا۔ اور اطباء اسلام مثل۔ محمد شجار۔ ابن جلجل ابسباسی۔ ابو عثمان خزاز۔ محمد بن سعید۔ عبدالرحمٰن بن اسحاق۔ ابو عبداللہ صقلی۔ نے نہایت شوق اور توجہ سے یہ کتاب اُس سے پڑہنی شروع کی اس مجمع نے نہایت غور و تحقیق و تجربہ سے خود قرطبہ (کارڈوا) میں اُن تمام مجہول دواؤں کے پتے لگائے۔ اور اُنکے ناموں کی تصحیح کی۔ ابن جلجل جو اُن تمام طبیبوں میں نہایت نامور تھا اسنے ایک مفصل شرح اس کتاب پر لکہی۔ اور اسکے تمام مقامات حل کیے۔ ابن جلجل نے ایک اور کتاب لکہی جسمیں صرف اُن دواؤں کی تفصیل کی جو اس کتاب میں مذکور نہ تہیں [۱]

ترجمہ کی صحت اور غلطی پر یورپ کے علما نے بہت بحثیں کی ہیں اور چونکہ بدقسمتی سے ہم مسلمان یونانی وغیرہ سے بے بہرہ ہیں اسلیے ہمکو اس باب میں یورپ ہی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ گبن صاحب لکہتے ہیں کہ ان ترجموں کی خوبی پر ناڈٹ نے خوب بحث کی ہے اور کامیری نے دیانت داری کر

---

[۱] دیکھو طبقات الاطبا تذکرہ ابن جلجل الاندلسی۔ ۱۲

اسکی حمایت کی ہے" لوئیس صاحب نے ہسٹری آف فلاسفی میں لکھا ہے کہ مونک کہتا ہے کہ بعض ترجمے نہایت خوبی سے کیے گئے" فرانس کے نہایت نامور مصنف پروفیسر مونک جسنے مسلمانوں اور یہودیوں کے فلسفہ اور اسکے باہمی ربط پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور جو مدت تک میرے مطالعہ میں رہی ہے وہ لکھتا ہے کہ "جن مصنفوں نے مسلمانوں کے ترجموں پر بیرحمانہ اعتراضات کیے ہیں اسکی یہ وجہ ہے کہ انہوں نے اصلی عربی ترجمے نہیں دیکھے بلکہ ان ترجموں کے ترجمے جو عربی سے لیٹن زبان میں کی گئی دیکھی ہیں"

ترجموں کی صحت و غلطی کا تو ہم مجتہدانہ فیصلہ نہیں کر سکتے اور اسی وجہ سے ہم نے اس بحث میں صرف یورپ کی تقلید کی لیکن یہ امر ہر شخص کو صاف نظر آتا ہے کہ مسلمانوں نے ترجمہ کو اصل زبان سے کسقدر آزاد کر دیا۔ آج انگریزی زبان کس قدر وسیع ہو گئی ہے لیکن علمی اصطلاحات میں ابھی تمام یونانی الفاظ قائم ہیں۔ اگرچہ اسکی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ تمام یورپ میں مشترک اصطلاحوں کا قائم رہنا ضرور ہے اور وہ بغیر اسکے نہیں ہو سکتا کہ یونانی الفاظ بعینہ قائم رکھے جائیں بہرحال عربی ترجمے اس غلامی سے بالکل بری ہیں منطق فلسفہ ہیئت ہندسہ طب میں سیکڑوں ہزاروں اصطلاحی الفاظ تھے لیکن ان سب کے مقابل میں عربی کے ایسے مناسب الفاظ انتخاب کیے گئے کہ گویا یہ علوم اسی زبان میں پیدا ہوئے تھے۔

یونانی الفاظ سے تو ملک بالکل ناآشنا ہے لیکن فارسی میں جو اصطلاحیں اسلام سے پہلے موجود تھیں اور جو دساتیر میں مذکور ہیں انکو اور ان کے مقابل عربی اصطلاحات کو ہم اس موقع پر نمونہ کے لیے لکھتے ہیں جس سے ظاہر ہوگا کہ اصطلاحی الفاظ کا کس خوبی سے ترجمہ کیا گیا تھا

---

۵۱ کتاب مذکور صفحہ ۲۱۴۔ ۵۲ اُن صحیفوں کے مجموعہ کا نام ہے جو آتش پرستوں کے اعتقاد میں زردشت وغیرہ پر اُتری ۱۲۰

۵۳ لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یورپ کے محقق جنہوں نے ژند اور پہلوی زبان میں کمال پیدا کیا ہو انکی رائے یہ ہے کہ دساتیر ایک [illegible]

اصطلاحات فلسفہ وطب وغیرہ			
پہلوی	عربی	پہلوی	عربی
کسی	تشخص	زنجیر	تسلسل
نوشدہ	حادثہ	آمیغ	حقیقت
فروزہ	صفت	جداشناس	فصل
پرتوی	اشراقی	رہبر	دلیل
رہبری	مشائی	ہمادی	کلی
برین فرہنگ	الہیات	پانہازی	جزوی
مایہ	ہیولی	ادچیز	ہویت
پیکر	صورت	چارآمیزہ	اخلاط اربعہ
بایستہ ہستی	واجب الوجود	جنبش شمپوری	حرکت قسری
شایستہ ہستی	ممکن الوجود	بازگیر	اعتراض
نخستین انداز خرد	بالبداہتہ	کنود	علّتہ
نابابے	محال	اشکیوہ	مرکب
چرخہ	دور	کاموس	بسیط

یونانی ولاطینی الفاظ عربی ترجموں میں خال خال اب بھی موجود ہیں۔ مثلاً اصطلاحات طبی میں۔ کیموس۔ کیلوس۔ مالیخولیا۔ تریاق۔ نقرس۔ قولنج۔ وغیرہ لیکن یہ صرف گویا اس بات کے یادگار ہیں کہ ان علوم کا ماخذ یونان ہے۔

غیر قوموں کے علوم وفنون جو ترجمہ کے ذریعہ سے عربی زبان میں آگئے

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد اب ہم ایک ایک زبان کے متعلق تفصیلی گفتگو کرینگے۔ اور چونکہ مسلمانوں نے سب سے زیادہ یونان کے علمی ذخیرہ کے ساتھ اعتنا کیا اسلیئے اول اسی سے شروع کرتے ہیں پھر فارسی، سُریانی، قبطی، سنسکرت، وغیرہ کے متعلق لکھینگے۔

یونان

فلسفہ

یونانی فلسفہ کی ابتدا تھیلز Thales سے ہوئی جسکو اہل عرب طالیس کہتے ہیں۔ یہ حکیم حضرت عیسی سے ۶۲۰ برس قبل پیدا ہوا اسنے مصر میں تعلیم پائی تھی اور وہیں یہ اُصول سیکھا تھا کہ تمام اشیا پانی سے پیدا ہوئیں۔ اسکے فلسفہ کو آیونک فلاسفی کہتے ہیں اسکے بعد فلسفہ کی اور بہت سی شاخیں نکلیں اور بڑے بڑے حکما پیدا ہوئے فلسفہ یونانی کا یہ سلسلہ ۵۲۲ء تک جاری رہا یعنی جبکہ اتھینز کا اسکول اسی سنہ میں قیصر روم جسٹینین کے حکم سے بند کر دیا گیا۔ اس ممتد دور کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ قدیم۔ جدید۔ دور قدیم کی انتہا افلاطون پر ہوتی ہے اور ارسطو سے دور جدید شروع ہوتا ہے۔ قدما میں سات بڑے حکیم جو حکمت و فلسفہ کے ستون کہلاتے ہیں یہ تھے Thales طالیس Anaxagoras انکساغورس۔ Anaximenes انکیمانس۔ اپندقلس Pythagoras فیثاغورس Socrates سقراط۔ Plato افلاطون۔ فیثاغورس کے زمانہ تک تصنیف کا چنداں رواج نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں ہسٹری آف فلاسفی کے عنوان سے جو کتابیں لکھی گئیں انمیں ان حکما کی تصنیفات کے بہت کم نام ملتے ہیں۔ تاہم انکے فلسفیانہ اُصول اور مسائل محفوظ تھے اور مسلمانوں نے انسے پوری واقفیت حاصل کی علامہ شہرستانی نے طالیس۔ انکساغورس۔ انکیمانس۔

اپنڈقلس

اپنڈقلس کے اُصول پر مفصل گفتگو کی ہے۔ اور غالباً یورپین تصنیفات میں اُصول مسائل کے متعلق اس سے زیادہ تفصیل نہیں ملسکتی۔ اپنڈقلس کا فلسفہ مسلمانوں میں زیادہ مقبول ہوا اسکی تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ محمد بن عبداللہ کو جو قرطبہ کا رہنے والا تھا۔ اپنڈقلس کی تصنیفات کا اسقدر شوق تھا کہ ہمیشہ اپنے مطالعہ میں رکھتا تھا۔ ابوالہذیل علاف جو مسلمانوں میں علم کلام کا بہت بڑا فاضل اور خلیفہ مامون الرشید کا اُستاد تھا صفات باری کے متعلق اسی حکیم کے خیالات کا پیرو تھا[1]۔ اپنڈقلس ہی پہلا شخص ہے جو اربعہ عناصر کا قائل ہوا اور وہی خیال اب تک مسلمانوں میں چلا آتا ہے۔

فیثا غورث

فیثا غورث المتولد ۵۸۰ھ قبل مسیح نے فلسفہ کو نہایت ترقی دی یہاں تک کہ اس علم کا یہ نام اسی کے عہد میں ایجاد ہوا۔ اسکی تصنیفات جسقدر ملسکیں بہم پہنچائی گئیں اور ترجمہ کی گئیں۔ چنانچہ انہیں سے جو علامہ ابن الندیم کے زمانہ یعنی چوتھی صدی کے وسط تک موجود تھیں حسب ذیل ہیں۔

رسالۃ فی السیاسۃ العقلیۃ۔ رسالۃ الی متمرد صقلیۃ۔ رسالۃ الی سیفانس فی استخراج المعانی[2]

ابن ابی اصیبعہ نے ان کتابوں کے علاوہ مفصلۂ ذیل کتابوں کا بھی نام لیا ہے۔

کتاب ارثماطیقی۔ کتاب الالواح۔ کتاب فی النوم والیقظہ۔ کتاب فی کیفیۃ النفس الجسد۔ الرسالۃ الذہبیۃ۔ ملیخس نے ان کتابوں کی جو شرحیں لکھی تھیں اُن کا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔

سقراط

سقراط المتوفی ۴۰۰ھ قبل مسیح فلسفہ کا باپ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسنے اگرچہ مستقل کتابیں نہیں تصنیف کیں کیونکہ وہ تحریر و تصنیف کا مخالف تھا تاہم تعلم و تعلیم کے وقت اسنے فلسفہ کے مسائل پر جو تقریریں کی اسکے شاگردوں نے اکثر محفوظ رکھیں۔ اور وہ رسالوں کی شکل میں مرتب ہو کر اسکی طرف منسوب ہیں۔ چنانچہ ازخانس کو فلسفہ کے متعلق پہیلیوں کے طور پر جو اسرار لکھے اُسکو

[1] طبقات الاطبا صفحہ ۳۷ جلد اول ۱۲۔ [2] فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۴۵ - ۱۲

شہرستانی نے اپنی کتاب میں گویا بعبارتہ نقل کیا ہے لسکے سوا اسنے اپنے عزیزوں کو جو تحریر لکھی اور پالٹیکس پر آپکی جو رائے تھی آپکی تصنیفات میں محسوب ہیں اور عربی میں انکا ترجمہ موجود ہے۔

فلاطون

فلاطون المتوفی ۳۴۷ قبل مسیح۔ نے فلسفہ کا بالکل ایک نیا اسکول قائم کیا۔ اس نے ۵ برس تک سقراط سے تعلیم حاصل کی۔ سقراط کے مرنے پر مصر گیا۔ اور فیثاغورث کے شاگردوں سے استفادہ کیا۔ پھر ایتھنز میں آکر ایک دار العلوم قائم کیا اور فلسفہ پر لکچر دینے شروع کیے۔ اس نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ تصنیفات میں اسکا خاص طرز یہ تھا کہ فرضی اشخاص کی زبان سے مسائل بیان کرتا تھا اور کتاب کا نام بھی انہی لوگوں کے نام پر رکھتا تھا۔ فلاطون کی تصنیفات جو عربی میں ترجمہ کی گئیں اُنکی تفصیل نقشہ ذیل سے معلوم ہوگی۔

نام کتاب	مضمون	مترجم یا مفسر
کتاب السیاستہ	پالٹیکس	حنین بن اسحاق
کتاب النوامیس	قانون	حنین و یحیی بن عدی
کتاب بنام سوفطس		اسحاق
کتاب بنام طیاوس	مابعد الطبیعۃ	یحیی بن البطریق و حنین بن اسحاق
اُصول الہندسہ	جامیٹری کے اُصول	قسطا بن لوقا۔

ان کتابوں کے سوا ابن ابی اُصیبعہ نے اور بہت سی کتابوں کے نام گنوائے ہیں جنکا مجموعہ ۲۰ تک پہنچتا ہے۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فلاطون مطالب کو دانستہ نہایت پیچیدہ طریقہ سے بیان کرتا تھا اسلیے خود یونانی حکمانے اسکے مطلب سمجھنے میں اکثر غلطیاں کیں لیکن حکمار اسلام خصوصاً **فارابی** نے نہایت صحت و خوبی سے انکی تشریح کی۔

ان سات حکما کے سوا اس دور میں اور اسکے بعد اور بھی اہل کمال گذرے جنکو فلسفیت کی حیثیت حاصل تھی۔ مثلاً ارستیپ المتولد ۴۳۵ء قبل مسیح جو سقراط کا شاگرد تھا اور جسکا فلسفہ صرف لذت وعیش پر مبنی تھا، اور ہرقلس Heracles المتولد ۵۰۰ء قبل مسیح جو پہاڑوں میں زندگی بسر کرتا تھا اور دیمقراطیس Democritus جو اجزاء لایتجزی کا قائل تھا، اور کسنوفانس Xenophanes المتولد ۵۷۱ء قبل مسیح لیکن ان حکما کی مستقل تصنیفات نہ تھیں، البتہ انکے اصول اور مسائل جو انکے ہمعصروں یا شاگردوں نے محفوظ رکھے تھے موجود تھے اور وہ عربی زبان میں ترجمہ کیے گئے چنانچہ ان تمام حکما کے فلسفہ کو شہرستانی اور جمال الدین قفطی اور صاعد اندلسی نے تفصیل سے لکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ یورپ کی تصنیفات میں بھی اس سے زیادہ نہیں ملسکتا۔

حکمائے متاخرین کا دور ارسطو المتولد ۳۸۴ء قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ وہ امام الفلسفہ کے لقب سے مشہور ہے اور درحقیقت وہ اس لقب کا مستحق تھا۔ یورپ نے اکثر طعنہ دیا ہے کہ مسلمانوں نے صرف ارسطو کے فلسفہ سے واقفیت حاصل کی اور ہمیشہ اسی کا کلمہ پڑھتے رہے یونان کے اور نامور حکما سے وہ بہت کم واقف ہیں، اگرچہ یہ اعتراض درحقیقت یورپ کی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے۔ مسلمانوں نے ارسطو کے سوا تمام اور حکما کے فلسفیانہ مسائل کا جو ذخیرہ بہم پہنچایا۔ آج یورپ اس سے زیادہ سرمایہ مہیا نہیں کرسکتا۔ لیکن ہمیں شبہ نہیں کہ اور حکما کی بہ نسبت مسلمانوں نے ارسطو کے فلسفہ کے ساتھ زیادہ اعتنا کی جسکے مختلف اسباب تھے۔ اول تو ارسطو سے پہلے تصنیف وتالیف کا منتظم طریقہ نہیں قائم ہوا تھا، اسواسطے حکمائے قدیم کے خیالات اور مسائل اچھی طرح منضبط نہیں تھے۔ فلاطوں نے تصنیف کو زیادہ ترقی دی لیکن وہ مضامین کو نہایت پیچیدہ طور سے ادا کرتا تھا اور اسکو فرض منصبی خیال کرتا تھا، چنانچہ جب اسکی زندگی میں ارسطو کی بعض مفصل تصنیفات شائع ہوئیں تو اسنے ارسطو کو نہایت ناراضی کا خط لکھا کہ اسرار فاش

کیے دیتے ہیں۔ شاید یہ وجہ بھی تھی کہ اپیکیوریس Epicurus ڈیاجینز Diogenes دیمقراطیس وغیرہ کے بعض مسائل اسلام کے برخلاف تھے لیکن ارسطو کا فلسفہ اسلام سے ملتا جلتا تھا۔ ارسطو۔ وحدانیت۔ صفات باری۔ ثواب۔ عقاب۔ حشر و نشر کا قائل تھا

بہر حال یہ عیب ہو یا ہنر لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں نے نہایت جد و جہد سے ارسطو کی ایک ایک تصنیف بہم پہنچائی، اور ان سب کے ترجمے کیے۔ چنانچہ ہم اس موقع پر اس کی تصنیف کی ایک مفصل فہرست لکھتے ہیں۔

کیفیت	مترجم	مضمون	نام کتاب
فارابی، متی، ابن مقفع، ابن بہریز، کندی، اسحاق، احمد بن طیب رازی، نے اسکے خلاصے اور شرحیں لکھیں۔	حنین بن اسحاق	مقولات عشر یعنی کم کیف وغیرہ	قاطیغوریاس Catagory
حنین نے سُریانی میں اور اسحاق نے عربی میں ترجمہ کیا۔ متی فارابی نے شرحیں لکھیں اسحاق۔ بن مقفع۔ کندی۔ ابن بہریز رازی احمد بن طیب نے خلاصے لکھے۔	״ و اسحاق	اسمیں معقولات مرکبہ کا بیان ہے۔	باری ارمنیاس
حنین نے سُریانی میں اور اسحاق نے عربی میں اسکے بعض اجزا کا ترجمہ کیا۔ کندی و متی نے شرح لکھی۔	تیوڈورس	تحلیل قیاسات	انالوطیقا اول Analytics
حنین نے بعض اجزا کا سُریانی میں ترجمہ کیا۔	اسحاق وغیرہ	بُرہان	انالوطیقا ثانی

[1] افلاطون اور ارسطو کی اس خط و کتابت کو فارابی نے اپنی کتاب الجمع بین الرایین میں نقل کیا ہے۔ دیکھو رسائل فارابی مطبوعہ مصر [illegible] صفحہ [illegible]

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
			متی نے اس سُریانی کی عربی کی متی کندی۔ فارابی نے شرحیں لکھیں
دلوبیقا (Topic)	بحث وجدل	یحیٰی بن عدی	اسحاق نے سُریانی میں۔ اور یحییٰ ابن عدی نے اس سریانی کا عربی میں ترجمہ کیا۔ سات مقالے دمشقی نے ترجمہ کیے اور ابراہیم بن عبداللہ نے آٹھ مقالے یحییٰ ابن عدی نے ہزار ورق میں شرح لکھی۔ فارابی و متی نے بھی شرحیں لکھیں۔
سوفسطیقا (Sophistry)	مغالطہ	ابن ناعمہ	متی و ابن ناعمہ نے سُریانی میں ترجمہ کیا اور یحییٰ و قویری و ابراہیم نے عربی میں
ریطوریقا (Rhytoric)	فصاحت و بلاغت یا خطابیات	اسحاق و ابراہیم بن عبداللہ	فارابی نے شرح لکھی
بوطیقا (Poetic)	شاعری	متی و یحییٰ بن عدی	متی نے سُریانی سے عربی میں ترجمہ کیا

یہ آٹھوں کتابیں منطق میں ہیں، کیونکہ ارسطو نے منطق کے آٹھ حصّہ قرار دیئے تھے۔ انہیں سے قاطیغوریاس یورپ میں چھپ گئی ہے اور باری ارمیناس و اناطولیقا اول و ثانی مع شرح ابن رشد کا قلمی نسخہ اسوقت میرے مطالعہ میں ہے۔ ارسطو کی اور تصنیفات حسب ذیل ہیں

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
سمع الکیان	طبعیات میں ہے۔ اور ہیولی، صورت، مکان، حرکت، زمانہ کا بیان ہے	حنین و قسطا بن لوقا وغیرہ	یہ کتاب آٹھ مقالوں میں ہے

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب السماء والعالم	اسمیں عناصر اربعہ و فلک کا بیان ہے	ابن البطریق - دمشقی	ابو زید بلخی - اور جعفر خازن نے اسکی شرح لکھی، ابو ہاشم نے اصل کتاب رد و قدح کیا
کتاب الکون و الفساد	انقلابات عناصر کا بیان ہے۔	حنین و اسحاق	حنین نے سریانی اور اسحاق - و دمشقی نے عربی میں ترجمہ کیا - مقالہ اول کا ترجمہ قسطا نے کیا۔
الآثار العلویہ	عنصریات۔		ابن رشد نے اسکے ترجمہ کی جو اصلاح کی وہ میری نظر سے گذرا ہے۔
کتاب النفس	نفس کی حقیقت کا بیان ہے	حنین وغیرہ	حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا - اسحاق نے دو ترجمے ناقص کامل کیے۔
کتاب الحس و المحسوس	حس کے اسباب اور علل سے بحث کی ہے		اس کتاب کی تلخیص جو ابن رشد نے کی ہے وہ میری نظر سے گذری ہے۔
کتاب الحیوان	حیوانات کا بیان ہے	ابن البطریق	۹ مقالے ہیں سریانی میں بھی اسکا ترجمہ ہوا
کتاب النبات	نباتات کا بیان ہے	اسحاق بن حنین	ثابت بن قرہ - نے ترجمہ کی اصلاح کی - میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔
اثولوجیا	الٰہیات	کندی	فرفوریوس مصری نے اس کتاب کی جو تفسیر کی وہ یورپ میں چھپ گئی ہے
کتاب الحروف	یونانی حروف تہجی کی ترتیب پر ہے۔	یحیی بن عدی	حروف الف سے میم و واو تک اسکا نسخہ ملا جسکا ترجمہ یحیی بن عدی نے کیا۔

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب الاخلاق	•	اسحاق بن حنین	فرفوریوس نے اسکے بارہوں مقالہ کی تفسیر لکھی جسکا ترجمہ اسحاق بن حنین نے کیا
کتاب المرأۃ	•	حجاج بن مطر	•

ان کتابوں کے سوا ارسطو کی اور بہت سی تصنیفات ہیں اور ان سب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا چنانچہ انمیں سے جو کتابیں ساتویں صدی تک موجود تھیں۔ اور علامہ بن ابی اصیبعہ کی نگاہ سے گذریں حسب ذیل ہیں۔

کتاب الفراسۃ۔ کتاب السیاسۃ المدنیہ۔ کتاب السیاسۃ العلمیہ۔ مسائل فی الشراب۔ کتاب فی التوحید۔ کتاب الشباب والہرم۔ کتاب الصحۃ والسقم۔ کتاب فی الاعدار۔ کتاب فی الباہ۔ رسالہ الی ابنتہ۔ وصیتہ الی نیقاتر۔ کتاب الحرکہ۔ کتاب فضل النفس۔ کتاب فی العظم الذی لاتیجزا۔ کتاب النقل۔ الرسالۃ الذہبیتہ۔ رسالۃ الی الاسکندر فی تدبیر الملک۔ کتاب الکنایات۔ کتاب فی علل النجوم۔ کتاب الانوار۔ رسالۃ فی الیقظہ۔ کتاب الاحجار۔ السبب فی خلق الاجرام السماویہ۔ کتاب فی الروحانیات۔ رسالۃ فی طبائع العالم۔ کتاب الاصطماخیس۔ کتاب الحیل۔ کتاب مابعد الطبیعہ۔ کتاب نعت الحیوانات الغیر الناطقہ۔ کتاب ایضاح الخیر المحض۔ کتاب الملاطیس۔ کتاب فی نفث الدم۔ کتاب المعادن۔ کتاب اسرار النجوم۔ کتاب الغالب والمغلوب۔

ارسطو کے بعد تصنیف وتالیف کا عام رواج ہوگیا۔ اور اس زمانہ میں جسقدر حکما پیدا ہوئے اکثر صاحب تصنیف تھے۔ ارسطو کا فلسفہ اگرچہ درحقیقت افلاطونی فلسفہ سے مختلف نہ تھا لیکن دونوں حکیموں کی طرز تحریر وادائے مطالب میں اسقدر اختلاف تھا کہ لوگوں نے انکو باہم مخالف سمجھا اور اس بنا پر فلسفہ کی دو الگ الگ اسکول قائم ہوگئے۔ ارسطو کے فلسفہ نے زیادہ

وسعت حاصل کی اور اسکے پیروؤں میں بڑے بڑے مشہور حکیم پیدا ہوئے انہیں سے ثاوفرسطس Theophrastus اور اسکندر افرودسی Alexander Aphrodisius زیادہ مشہور ہیں۔

ثاوفرسطس ۳۲۱ق ارسطو کا خاص شاگرد تھا اور ارسطو نے اپنے مدرسہ کا اسکو جانشین مقرر کیا تھا۔ یونان کے بڑے بڑے حکما اسکے حلقہ درس میں بیٹھتے تھے۔ وہ قائل تھا کہ خدا کی ذات وصفات میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوسکتا۔ وہ ستاروں کو روحانی اجسام مانتا تھا اور انکے مدبر عالم ہونیکا قائل تھا۔ فلسفہ میں اسکی متعدد تصنیفات ہیں جنکے نام حسب ذیل ہیں۔ کتاب النفس۔ کتاب الآثار العلویۃ۔ کتاب الادب۔ کتاب الحس والمحسوس۔ کتاب مابعد الطبیعہ۔ کتاب النبات۔ یہ تمام کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ پہلی تین کتابوں کا ترجمہ ابراہیم بن بکس اور یحیی بن عدی نے کیا۔

اسکندر افرودسی

اسکندر افرودسی دمشقی ۱۲۹ء میں پیدا ہوا۔ اسنے ارسطو کی تصنیفات پر نہایت کثرت سے شرحیں لکھیں۔ وہ ارسطو کے فلسفہ کا ایک بڑا رکن خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے بعض اصول خود بھی ایجاد کیے چنانچہ خدا کے عالم کلیات وجزئیات ہونے پر اول اسی نے دلیل قائم کی۔ اسی نے ارسطو کے برخلاف یہ مسئلہ بیان کیا کہ نفس کو مفارقت بدن کے بعد کسی قسم کا ادراک و احساس نہیں ہوسکتا۔ اس کی شرحیں اور مستقل تصنیفات دونوں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ چنانچہ نقشہ ذیل سے تفصیل معلوم ہوگی۔

ترجمہ شروح

نام کتاب	مترجم	کیفیت
شرح قاطیغوریاس	ابوزکریا	یہ شرح ۶۰۰ صفحوں میں ہے

[1] دیکھو شہرستانی مطبوعہ یورپ صفحہ ۳۰۳ و فہرست ابن الندیم ذکر ثاوفرسطس۔ ۱۲

کتاب	مترجم	کیفیت
شرح انالوطیقا		مصنف نے اسکی دو شرحیں لکھیں ایک زیادہ مفصل اور کامل ہے۔
شرح طوبیقا		آٹھ مقالوں میں سے صرف پانچ مقالوں کی شرح ہے۔
شرح سماع طبعی	ابو روح الصابی حنین و قسطا و دمشقی	ان مترجموں نے کتاب کی مختلف حصوں کو ترجمہ کیے۔
شرح کتاب السماء والعالم		صرف پہلے مقالہ کی شرح ہے
شرح کتاب الکون و الفساد	متی و قسطا	
شرح الآثار العلویۃ		اس شرح کا ترجمہ پہلے عربی میں کیا گیا۔ پھر یحیی بن عدی نے اس ترجمہ کا ترجمہ سریانی زبان میں کیا۔
شرح کتاب الحروف		

اسکندر افرودیسی کی جو تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب النفس۔ کتاب الرد علی جالینوس فی التمکن۔ کتاب الرد علی جالینوس فی الزمان۔ کتاب الابصار۔ کتاب اصول العامۃ۔ کتاب عکس المقدمات۔ کتاب مبادی الکل۔ کتاب فی ان الموجود لیس بجنس للمقولات العشر۔ کتاب العنایۃ۔ کتاب الفرق بین الهیولی والجنس۔ کتاب الرد علی من قال انه لایکون شئ الا من شئ۔ کتاب فی ان الابصار لایکون الا بشعاعات تنبث من العین۔ کتاب اللون۔ کتاب الفصل۔ کتاب المالیخولیا۔

فلسفہ ارسطو کے اور بھی بہت سے شارح و مفسر گذرے جنکی تصنیفات کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا۔ مثلاً نیقولاؤس[1]۔ امیقاروس۔ نیقولاؤس نے علاوہ شرحوں کے مستقل تصنیفات بھی کیں چنانچہ انہیں سے کتاب فی فلسفۃ ارسطو فی النفس۔ وکتاب النبات وکتاب الرد علی جاعل الفعل والمفعولات شیئاً واحداً۔ وکتاب اختصار فلسفۃ ارسطو۔ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا۔

[1] Nicolaus

۵۱ اسکندر افرودیسی اور اسکی تصنیفات کیلئے دیکھو فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۵۳۔ وطبقات الاطباء جلد اول صفحہ ۶۹ - ۷۰۔

پلوٹارک
Plutarch

ارسطو کا فلسفہ اگرچہ تمام ملک پر قبضہ کرچکا تھا۔ اور پہلی حکما کے پیرو بہت کم رہ گئے تھی تاہم بالکل معدوم نہیں ہوئے تھے سنہ ء میں پلوٹارک جو سنہ ء میں موجود تھا اسنے سقراط کے فلسفہ کو رونق دی اور فلسفۂ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ اسکی تصنیفات نہایت مقبول ہوئیں اور وہ مجدد فلسفہ قرار پایا۔ انگریزی مورخوں نے لکھا ہے کہ شکسپیر نے اپنی پلیز میں قوم کی اخلاقی حالت کی جہاں جہاں تصویر کھینچی ہے اکثر پلوٹارک کے بیان سے مذدلی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ حصے نہایت مؤثر اور مفید ہیں۔ بہرحال مسلمانوں نے باوجود اسکے کہ وہ فلسفۂ ارسطو کے زیادہ دلدادہ تھے پلوٹارک کے فلسفہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا، اور اسکی اکثر تصنیفات کے ترجمے کیئے، اسنے ایک کتاب میں طبیعیات کے متعلق تمام حکما کی رائیں نقل کی تھیں۔ قسطا ابن لوقا نے اسکا ترجمہ کیا۔ اسکے سوا اسکی اور کتابیں مثلاً۔ کتاب الی موریایا۔ کتاب الغضب۔ کتاب الریاضہ۔ کتاب النفس عربی و سریانی میں ترجمہ کی گئیں۔

یہ تقسیم زمانہ کے اعتبار سے تھی لیکن اصول فلسفہ، طرز تعلیم، اخلاق و عادات، کی لحاظ سے فلسفہ کے سات اسکول قرار دیئے گئے ہیں۔

(۱) **فیثاغورثیہ**۔ اسکا حال اوپر گذر چکا۔

(۲) **قورینیہ**۔ اس فرقہ کا بانی ارسیفوس تھا اور چونکہ وہ قورنیا کا رہنے والا تھا اسلیئے یہ فرقہ اسی کیطرف منسوب ہوکر مشہور ہوا۔

(۳) **رواقیہ** (اسٹوئیک) Stoic اس فرقہ کا بانی زینون Zeno المتولد ۳۴۰ قبل مسیح تھا اور چونکہ وہ چھت کے نیچے بیٹھکر تعلیم دیتا تھا، رواقیہ کے نام سے مشہور ہوا۔

(۴) **کلابیہ** Dogmatic اس فرقہ کا بانی انتیسین تھا۔ یہ حکیم تمام آدمیوں کو حقیر سمجھتا تھا اور خاصکر امرا اور دولتمندوں کو گویا کاٹ کھانا چاہتا تھا۔ اس مناسبت سے لوگ اسکو کتا کہتے تھے اور اسی

مناسبت سی اس فرقہ کا نام کلابیہ مشہور ہوگیا۔ اس فرقہ کا سب سے نامور شخص دیوجانس کلبی Diogenes تھا۔ جسکے حالات اور اقوال و افعال عربی کتابوں میں اکثر مذکور ہیں۔ وہ ۴۱۳ سنہ قبل مسیح پیدا ہوا۔

(۵) **مانعہ**۔ اسکا بانی فورن تھا اور چونکہ وہ لوگوں کو تعلیم سے منع کرتا تھا اسلیئے اس نام سے مشہور ہوا۔

(۶) **لذتیہ**۔ اسکا بانی اپیکوریس المتولد ۳۴۲ سنہ قبل مسیح تھا جسکا فلسفہ یہ تھا کہ آیندہ حشر و نشر کچھ نہیں اسلیئے جسقدر ہوسکے یہاں عیش کرلینا چاہیئے۔

(۷) **مشائین**۔ اسکے بانی افلاطون اور ارسطو تھے اور چونکہ یہ لوگ پڑہانیکے وقت ٹہلتے جاتے تھے اور پڑہاتے جاتے تھے اسلیئے اس نام سے مشہور ہوئے۔

ان میں سے بعضوں نے تصنیف و تالیف نہیں کی بلکہ زبانی مسائل کی تعلیم کرتے تھے۔ چنانچہ انکے اُصول اور اقوال دوسروں کی تصنیفات میں حوالہ کے طور پر ملتے ہیں۔ غرض ان میں سی جن حکما کی تصنیفات موجود تھیں عربی میں ترجمہ کی گئیں، اور جنکے صرف اقوال اور مسائل محفوظ تھے اسی حیثیت سی محفوظ رہے۔ چنانچہ علامۂ شہرستانی نے دیوجانس۔ اپیکورس۔ زینون کے اقوال اور مسائل کو اپنی کتاب میں نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعضوں کا اُصول چونکہ مذہب اسلام کے مخالف تھا اسلیئے انکی پیروی نہیں کی گئی لیکن بعض بعض حکماے اسلام کے خیالات میں انکا پرتو پایا جاتا ہے مثلاً عمر خیام کی رباعیاں اپیکورس کے خیالات سی لبریز ہیں لیکن چونکہ وہ خیالات شاعری کے پردہ میں ادا کیئے گئے ہیں اس لیے الحاد و زندقہ کی طعنہ سے کسی قدر وہ محفوظ رہا۔

زینون

زینون۔ وحدت وجود کا قائل تھا اور یہ خیال تو اس وسعت سی مسلمانوں میں پھیلا کہ ایک بڑے مذہبی گروہ کا دار مدار اسی پر ہے۔

یونان کے فلسفہ نے وہ قبول حاصل کیا کہ مصر کی درسگاہوں میں جہاں کسی زمانہ مین خود حکماے یونان نے تعلیم پائی تھی۔ اسکا رواج ہوگیا۔ اسکندریہ کے تمام مدارس میں یونانی ہی فلسفہ پڑہایا جاتا تہا، کچھ دنوں تک مقلدانہ تعلیم رہی پہر وہاں خود ایسے اہل کمال پیدا ہوگئے کہ فلسفہ کے خاص خاص اسکول کے بانی قرار پائے۔ چنانچہ امونیس Ammonius نے جو ۲۲۰ء میں تہا ایک نئے طریقہ کی بنیاد ڈالی جسکا نام نیوپلاٹونیزم یعنی جدید فلسفہ افلاطونی ہے۔ اس حکیم نے افلاطون کے فلسفہ میں چند خاص اُصول اضافہ کیے اور بہت سے لوگ اسکے پیرو ہوگئے۔ امونیس نے ارسطو کے بہت سی کتابوں پر شرحیں بہی لکہیں۔ مثلاً شرح قاطیغوریاس شرح طوبیقا۔ وغیرہ چنانچہ ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

امونیوس نے مستقل تصنیفیں بہی لکہیں، جو عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ مثلاً شرح مذہب ارسطالیس فی الصانع۔ کتاب فی اغراض ارسطالیس۔ کتاب حجۃ ارسطالیس فی التوحید۔

نیوپلاٹونیزم یعنی جدید فلسفہ افلاطونیہ جو اسکندریہ میں قائم ہوا اسکے اُصول اولیں چار تھے۔

(۱) خدا میں تین اقنوم ہیں۔ وحدت۔ فہم۔ قوت۔

(۲) نفس وحدت حاصل کرسکتا ہے اور اس حیثیت سے خدا کی برابری حاصل کرسکتا ہے۔

(۳) موجودہ زندگی کے تصورات سب وہم و خیال ہیں۔

(۴) مادہ نہایت حقارت کے قابل ہے[1]۔

اس فلسفہ کے مشاہیر حکما یہ تہے۔

فرفوریوس Porphyrius ۲۳۳ء میں پیدا ہوا۔ فن بلاغت کی تحصیل ایتھنز میں کی۔ یہ مذہب عیسوی کا مخالف تہا اور عیسائیت کی رد میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں

[1] میزان الحق مطبوعہ بیروت صفحہ ۳۰۴۔

فلسفہ میں ارسطو کی اکثر کتابوں کی شرح لکھی۔ اور کلیات خمس کی ترتیب اسی نے دی مسلمانوں نے اسکی تصنیفات کو بڑی جد و جہد سے مہیا کیا۔ اور انکے ترجمے کیے جنکی تفصیل ذیل میں ہے۔

نام کتاب	مضمون	مترجم
ایساغوجی	یعنی کلیات خمس	
مدخل الی القیاسات		ابوعثمان دمشقی
کتاب العقل والمعقول		
اناپو کے نام دو کتابیں	اناپو۔ فرفوریوس کا شاگرد تھا	
کتاب الرد علی بجیوس	عقل و معقول کے بیان میں ہے	
الاسطقسات	عناصر کا بیان ہے	
شرح کتاب باری ارمنیاس لارسطو		
شرح کتاب سماع طبعی لارسطو		بسیل
شرح کتاب اخلاق لارسطو		اسحاق بن حنین۔ یہ کتاب بارہ مقالوں میں ہے۔

فرفوریوس نے حکما کے حال میں ایک نہایت مفصل اور مفید کتاب لکھی تھی اُسکا بھی عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ چنانچہ طبقات الاطبا کا ابتدائی حصہ بہت کچھ اسی سے ماخوذ ہے اور مسلمان مصنفوں نے حکماے یونان کے حالات میں جو کتابیں لکھی ہیں اکثر اس سے ماخوذ ہیں۔

اس فلسفہ کا دوسرا مشہور حکیم براقلس تھا۔ یہ ۴۱۲ء میں پیدا ہوا۔ فلسفہ و ریاضی میں اُستاد وقت تھا۔ یہ بھی مذہب عیسوی کا سخت مخالف تھا۔ اسکی اکثر تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں جنکی تفصیل ذیل میں ہے۔

کتاب حدود اوائل الطبعیات۔

ثمان عشرۃ مسائل	اٹھارہ مسئلوں کا بیان ہے۔
شرح قول فلاطون فی النفس	تین مقالوں میں ہے۔
اثولوجیا	یعنی الہیات
تفسیر وصایای فیثاغورث	فیثاغورث کی وصیتیں جو آب زر سے لکھی گئی تھیں انکی شرح ہے ۳۰۰ صفحوں میں ہے
الجواہر العالیہ۔	
دیادخس	یونانی نام ہے اسمیں دس مسئلوں پر بحث ہے۔
الخیر الاول	
المسائل العشر المعضلات	دس نہایت مشکل مسئلوں پر بحث ہے
الجزء الذی لایتجزی	جزء لایتجزی کی بحث میں ہے۔

ثامسطیوس

اس طبقہ کا ایک اور مشہور حکیم ثامسطیوس Themisteas تھا جو ۳۵۵ء میں تھا۔ یہ بھی عیسائیت کا منکر تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ بادشاہ روم لیولیانس نے جو مذہب عیسوی کا سخت دشمن تھا اسکو اپنا سکرٹری مقرر کیا تھا۔ اسنے ارسطو کی تصنیفات کی شرحیں لکھیں جنمیں سے شرح کتاب قاطیغوریاس شرح انالوطیقا۔ شرح انالوطیقا ثانی۔ تفسیر کتاب طوبیقا تفسیر سماع طبعی۔ تفسیر کتاب السماء والعالم تفسیر کتاب الکون والفساد۔ تفسیر کتاب النفس۔ تفسیر کتاب الحروف۔ کا ترجمہ عربی زبان میں موجود ہے۔ علامہ ابن الندیم نے ان کتابوں کی اور انکے ترجموں کی بھی تفصیل لکھی ہے۔

ثامسطیوس کی ذاتی تصنیفات بھی ہیں اور انکا بھی عربی ترجمہ کیا گیا۔ انمیں سے ایک کتاب نفس کے بحث میں ہے اور باقی دو رسالے ہیں جو اسنے لیولیانس کو لکھے تھے۔

یحیی نحوی

حکمائے اسکندریہ کا خاتم یحیی نحوی (John the Grammarian) تھا جو اسلام کے زمانہ تک موجود رہا اور عمرو بن العاص نے اسکی بہت قدر و منزلت کی۔ وہ بہ یک واسطہ برقلس

کا شاگرد تھا اور اسکی صحبت سے مشرف ہوا تھا یحییٰ کا اصل فن طب تھا چنانچہ اسکی طبی تصنیفات کا ذکر آگے آتا ہے لیکن اسنے فلسفہ پر بھی کتابیں لکھیں چنانچہ ارسطو کی کتاب قاطیغوریاس۔ و انالوطیقا اول و دوم۔ وطوبیقا۔ وسماع الطبعی۔ والکون والفساد۔ ان سب کتابوں کی شرحیں لکھیں۔ انکے سوا اسکی مستقل تصنیفات بھی ہیں۔ ایک کتاب برقلس کے رد میں ہے اور اٹھارہ مقالوں میں ہے۔ ارسطو کے رد میں بھی اسنے ایک کتاب چھ مقالوں میں لکھی۔ انکے سوا اور تصنیفیں ہیں۔ چنانچہ ان سب کی تفصیل علامہ ابن الندیم و ابن ابی اصیبعہ نے کی ہے۔ یہ تمام کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں اور انمیں سے بعض آجتک موجود ہیں۔

ہیئت

اس فن کا موجد تھیلیس (ثالیس ملطی) کہا جا سکتا ہے جو حضرت عیسیٰؑ سے ۶۰۰ برس پہلے تھا اسنے زمین کو مرکز کائنات مانا۔ اور وہ پہلا شخص ہے جس نے زیچ بنائی۔ اور خسوف کی پیشین گوئی کی۔ اسکے بعد فیثاغورث و افلاطون نے اس فن کو نہایت ترقی دی۔ فیثاغورث نے جو ۵۳۶ء قبل مسیح تھا بجائے زمین کے آفتاب کو مرکز مانا۔ ان حکما کی تحقیقات اور مسائل اگرچہ عربی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہیں لیکن اس فن کے متعلق انکی کسی مستقل تصنیف کا کچھ پتہ نہیں ملتا جو عربی زبان میں ترجمہ کی گئی ہو۔ البتہ اس دور کے بعد جن حکما نے اس فن کو ترقی دی انکی کتابوں کے ترجمے عربی میں موجود ہیں۔ انمیں سب سے مقدم اور نامور ارسترخوس تھا جو ارشمیدس کا ہمعصر تھا۔

ارسترخوس

ارسترخوس۔ یونانی الاصل اور حضرت عیسیٰ سے ۲۷۰ برس پہلے تھا یہ اس بات کا قائل تھا کہ زمین آفتاب کے گرد حرکت کرتی ہے۔ اسکی تصنیفات میں سے جس کتاب کا ترجمہ موجود ہے

اسکا نام جرم الشمس والقمر ہے اسمیں آفتاب و ماہتاب کی جسامت اور مقدار اور فاصلہ کا بیان ہے
یہ عجیب بات ہے کہ یورپ کو بھی باوجود انتہائے تلاش کے یہی ایک کتاب مل سکی چنانچہ اصل
کتاب ۱۵۷۲ء اور اسکا فرنچ ترجمہ ۱۸۱۰ء میں چھاپا گیا۔[1]

اسی دور کا دوسرا مشہور فاضل ابرخس ہے جو حضرت عیسٰی سے ۱۴۰ برس قبل تھا

ابرخس

ابرخس Hipparchus نے اس فن میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ علم ہئیت میں جبر و مقابلہ
سے اول اسی نے کام لیا۔ اس مصنف کی تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں لیکن یہ تعجب ہے
کہ علامہ ابن الندیم نے جن کتابوں کا نام لکھا ہے وہ جبر و مقابلہ کے متعلق ہیں ہئیت کی
کسی کتاب کا نام نہیں لکھا۔

بطلیموس

بطلیموس یہ پہلا شخص ہے جسنے اسطرلاب بنایا اور آلات نجوم طیار کیے۔ اسکے زمانہ میں
بہت بڑے سامان سے رصدخانہ بنا اور اجرام فلکی کے حالات تحقیق کیے گئے۔ مسلمانوں نے اسکی
ہئیت کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا۔ چنانچہ اسکی کتاب مجسطی کا ترجمہ بڑے اہتمام اور جد و جہد سے ہوا
سب سے پہلے یحییٰ ابن خالد برمکی نے اسکے ترجمہ کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ بہت سے مترجمین نے
اسکی فرمایش سے ترجمے کیے اور تفسیریں لکھیں۔ لیکن وہ سب مبہم اور غیر مفہوم تھیں۔ اسلیئے اسنے
بیت الحکمۃ کے افسروں یعنی سلما اور ابوحسان کو اسکام پر مامور کیا۔ ان لوگوں نے نہایت مشہور
اور نامور مترجموں کو جمع کر کے ترجمہ پر مامور کیا اور نہایت محنت کیساتھ ترجمہ کیا گیا۔ اس کتاب
کے کل ترجمے جو مقبول ہوئے تین ہیں۔ ایک حجاج بن مطر کا۔ دوسرا اسحاق کا۔ جسکو ثابت
نے صحیح کیا۔ تیسرا اخو ثابت کا۔ چونکہ مامون الرشید کو اس کتاب کے ساتھ نہایت شغف
تھا اس کے حکم سے حنین بن اسحاق نے بھی ترجمہ کیا۔ حجاج بن یوسف۔ ثابت بن قرہ نے

[1] دائرۃ المعارف مرتبہ زمانہ حال و فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۷۰۔

زوائد سے پاک کر کے خلاصہ لکھا۔ ابوریحان بیرونی نے اسکا اختصار کیا۔ اور عمر و بن فرخان، ابراہیم بن الصلت، فضل بن حاتم، شمس الدین سمرقندی، نظام الدین نیشاپوری، وغیرہ نے شرحیں لکھیں[۵۱]۔

بطلیموس کا نظام تمام یورپ میں مدتوں یعنی کوپرنیکس کے زمانہ تک متداول رہا۔ یہ بات بھی یاد رکھنیکے قابل ہے کہ بطلیموس کی یہ کتاب (مجسطی) اول عرب ہی کی بدولت یورپ میں پہنچی چنانچہ عربی زبان سے لاٹین میں اسکا ترجمہ کیا گیا۔ پھر یونانی نسخہ بھی ملا اور فرنچ میں اسکا ترجمہ کیا گیا۔ جو پیرس میں ۱۸۱۳ء میں چھاپا گیا[۵۲]۔

بطلیموس نے آلات رصدیہ میں ذات الحلق اور ذات الصفایح۔ پر دو مستقل کتابیں لکھیں اور ایک نہایت مفصل کتاب علم نجوم میں لکھی جسکا نام قانون ہے۔ یہ کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ چنانچہ مورخ یعقوبی نے ان کتابوں کے ابواب اور فصلوں کے مضامین کو تفصیل سے لکھا ہے۔ بطلیموس کی اور تصنیفات جو ترجمہ کی گئیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب المو الید۔ کتاب استخراج السہام۔ کتاب تحویل سنی العالم۔ کتاب تحویل سنی المو الید۔ کتاب المرض و شرب الدواء۔ کتاب فی سیر سبعہ۔ کتاب فی الاسراء والمحبین۔ کتاب فی اثر الصعود۔ کتاب تحصین ایہما یفلح۔ کتاب ذوات الذوایب۔ کتاب السابع۔ کتاب القرعہ۔ کتاب اقتصاص احوال الکواکب۔ کتاب الثمرۃ۔ کتاب الاربعۃ۔ یہ کتاب ایک شاگرد کے نام سے لکھی تھی۔ ابراہیم بن الصلت نے اسکا ترجمہ کیا۔ حنین نے اصلاح کی۔ ثابت و عمر بن الفرخان وغیرہ نے شرحیں لکھیں۔

یہ تینوں حکیم۔ فن ہیئت کے بانی اور موجد خیال کیے جاتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں نے انکے علاوہ اور اہل کمال کی بھی کتابیں بہم پہنچائیں اور ترجمہ کیں۔ چنانچہ تفصیل حسب ذیل ہے

---

[۵۱] کتاب الفہرست و کشف الظنون و دائرۃ المعارف ۱۲ [۵۲] دائرۃ المعارف ۱۲

اوطولوقس — **اوطولوقس** Autolycus یہ ارسطو کا معاصر اور دیوجانس کا اُستاد تھا۔ اسکی دو کتابیں اس فن میں ہیں اور دونوں کا ترجمہ کیا گیا۔

کتاب الکرۃ المتحرکۃ۔ کتاب الطلوع والغروب۔

ابسقلاؤس — **ابسقلاؤس** Hypsicles سنہ ۱۶۰ء میں تھا۔ اور اسکندریہ میں رہتا تھا اسکی تصنیفات میں کتاب الاجرام والابعاد۔ کتاب الطلوع والغروب کا ترجمہ ہوا۔ اسنے اقلیدس کے چوتھے اور پانچویں مقالہ کی اصلاح بھی کی تھی اور اسکا بھی عربی میں ترجمہ ہوا۔

ثاون — **ثاون** (Theon) اسکندریہ کا رہنے والا تھا۔ اسنے آلات رصدیہ میں سے ذات الحلق اور اسطرلاب کے متعلق دو مستقل کتابیں لکھیں بطلیموس کی زیچ پر بھی ایک کتاب لکھی مجسطی پر بھی اسکی ایک کتاب ہے۔ چنانچہ ان سب کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

فالیس رومی — **فالیس رومی۔** اسکی تصنیفات جنکا ترجمہ ہوا حسب ذیل ہیں

مدخل الی صناعۃ النجوم۔ کتاب الموالید۔ کتاب المسائل۔ کتاب الزایجہ۔ کتاب المسائل الکبیر کتاب السلطان۔ کتاب الامطار۔ کتاب تحویل سنی العالم۔ کتاب الملوک۔

تیودورس — **تیودورس** (Theodorus) اسکی تصنیفات جو ترجمہ ہوئیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب الاکر۔ کتاب المساکن۔ کتاب اللیل والنہار۔

بپس — **بپس** (Pappus) ثاون اسکندرانی کا معاصر تھا اسنے بطلیموس کی کتاب پر جو کرہ کی تسطیح کے متعلق ہے شرح لکھی اس کتاب کا ترجمہ ثابت نے کیا۔

ایرن — **ایرن** Heron سنہ ۵۰ قبل مسیح تھا۔ اسنے اسطرلاب پر ایک کتاب لکھی اور اسکا ترجمہ کیا گیا۔ اقلیدس کے شکوک پر بھی ایک کتاب لکھی اور اُسکا بھی ترجمہ ہوا

ابیون — **ابیون** Apion اخیر حکما میں سے ہے۔ اسکی تصنیفات میں سے اسطرلاب پر ایک کتاب ہے

اور وہ عربی میں ترجمہ کی گئی۔

جبر ومقابلہ وحساب

جبر ومقابلہ کا فن اگرچہ مسلمانوں نے گویا خود ایجاد کیا۔ کیونکہ مسلمانوں سے پہلے اسکی ابتدائی حالت ایسی تھی کہ فن کا لفظ اسپر صادق نہیں آسکتا تھا اور اس بات کا تمام یورپ اعتراف کرتا ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یونانیوں نے بھی اس فن میں کچھ کتابیں لکھیں تھیں۔ چنانچہ وہ عربی میں ترجمہ کی گئیں۔

ابرخس

سب سے اول جسنے یونان میں اسکے متعلق کچھ لکھا وہ ابرخس تھا جو ۱۶۰ قبل مسیح نہایت مشہور ریاضی داں گذرا ہے۔ سیارات کی حرکت، چھ سو برس مابعد تک خسوف کی تاریخیں، ستاروں کے فاصلے، اجرام فلکی کی فہرست ان مضامین پر اسنے بہت سے رسالے لکھے۔ جبر و مقابلہ پر اسکی جو کتاب ہے اسکا ترجمہ اور اصلاح ابوالوفا محمد بن محمد حاسب نے کی ابوالوفا نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی۔ اور دعووں کو براہین ہندسیہ سے ثابت کیا۔ ابرخس کی ایک اور کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جسکا نام قسمۃ الاعداد[1] ہے۔ ابرخس کے بعد دیوفنطس نے اس فن کو ترقی دی۔

دیوفنطس

دیوفنطس (Diphantus) یونانی تھا اور اسکندریہ میں سکونت رکھتا تھا۔ جبر و مقابلہ پر اسنے ۱۳ رسالے لکھے جو ایک مجموعہ میں مرتب تھے۔ ان رسالوں میں مربعات ومکعبات وغیرہ کے بہت سے مسائل موجود ہیں۔ عربی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا۔ یورپ کو مدت تک دیوفنطس کا نام تک معلوم نہ تھا۔ سب سے پہلے آٹھویں صدی عیسوی میں یوحنا شامی نے

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۲۶۹ ودائرۃ المعارف ۱۲

اسکا حوالہ دیا۔ سنہ ۱۵۶۷ء میں اسکی کتاب اصل یونانی میں مع لاٹین ترجمہ کے چھاپی گئی۔ اور سنہ ۱۶۲۵ء میں اسکا ترجمہ کیا گیا[۵۱]۔

حساب کے متعلق عام طور پر مسلم ہے کہ مسلمانوں نے ہندؤں سے لیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ رقوم اعداد کو ہندی طریقہ سے لکھتے ہیں۔ تاہم یونان کی تصنیفات بھی مسلمانوں نے بہم پہنچائیں۔ سب سے قدیم تصنیف فیثاغورس کی تھی جسکا نام ارثماطیقی یعنی اریتھمیٹک تھا۔ یہ کتاب عربی زبان میں ترجمہ کی گئی[۵۲]۔ اسکے علاوہ اور مصنفوں کی کتابیں بھی ترجمہ کی گئیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

نیقوماخس

نیقوماخس Nicomachus ارسطو کا باپ اور بہت بڑا موسیقی داں تھا۔ آخر اس فن میں ایک کتاب لکھی جسکا نام ارثماطیقی ہے۔ یہ کتاب دو مقالوں میں ہے اور اصل یونانی میں سنہ ۱۵۳۸ء میں بمقام پیرس چھاپی گئی ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ترجمہ کی گئی[۵۳]۔

مکانک (یا) علم الآلات[۵۴]

یہ فن اگرچہ درحقیقت موجودہ زمانہ کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے۔ لیکن یونان میں اسکی ابتدا ہو چکی تھی۔ سب پہلے جسنے جرثقیل اور حرکت کے اصول دریافت کیے وہ ارشمیدس

ارشمیدس

(Archimedes) ہے جو سنہ ۲۱۲ قبل مسیح تھا۔ اسنے پانی کی گھڑی ایجاد کی جس میں گھنٹوں کے گذرنے پر خودبخود گھنٹوں کی تعداد کے موافق گولیاں گرتی تھیں۔ اسی زمانہ میں

---

[۵۱] دائرۃ المعارف جلد ۷ صفحہ ۴۴۴۔ [۵۲] طبقات الاطبا جلد اول صفحہ ۴۲۔

[۵۳] کتاب الفہرست صفحہ ۲۶۹۔ و دائرۃ المعارف۔ لفظ حساب۔ ۱۱

[۵۴] مکانک کے لیئے دیکھو دائرۃ المعارف ذکر آلات و فہرست بن الندیم صفحہ ۱۲۲ و ۲۶۹ و ۲۷۰ و ۲۸۵ و یعقوبی صفحہ ۱۳۵۔

ایرون نے اس فن میں بہت سی باتیں اضافہ کیں۔ پانی کے بلند کرنے کا آلہ اول اسی نے ایجاد کیا۔ اسنے آلات کی ۵ تقسیمیں کیں لیکن آج کل چھ قرار دی جاتی ہیں یعنی سطح مائل بہی ایک قسم قرار دیجاتی ہے حالانکہ ایرن نے اسکو چہوڑ دیا تہا۔ ایرن نے جرثقیل پر ایک مستقل کتاب لکہی۔

ایک اور حکیم جو اس فن کا استاد گذرا ہے مارطس تہا۔

مارطس Ctesibius یونانی الاصل تہا۔ اسنے ارگن باجہ پر ایک کتاب لکہی اور ایک آلہ دریافت کیا جس کی آواز ۶۰ میل تک جاسکتی تہی۔

غرض اس فن کے متعلق جو کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں حسب ذیل ہیں۔

نام کتاب	مضمون	کیفیت
آلہ ساعات الماء	پانی کی گھڑی	ارشمیدس
کتاب شیل الأثقال	جرثقیل کے بیان میں	ایرون
الاشیاء المتحرکہ من ذاتہا	چیزوں کا خود بخود حرکت کرنا	"
الآلات المصوتة	ارگن باجہ جو آپ سے آپ بجتا ہے	مارطس
کتاب الدوالیب	گھڑی وغیرہ میں جو چکر ہوتے ہیں	"

موسیقی

موسیقی کا فن اگرچہ عرب میں مدت سے موجود تہا لیکن علمی حیثیت سے نہ تہا۔ یونان میں اول جس شخص نے علمی حیثیت سے اس فن کو مرتب کیا وہ غالباً فیثاغورث تہا۔ اقلیدس نے بہی اسکو ترقی دی اور اس فن میں اسکی تصنیفات بہی ہیں۔ اگرچہ یہ امر یقینی ہے کہ ان قدما کی تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں چنانچہ علامہ ابوالفرج اصفہانی نے اسحاق موصلی کے حال میں تصریح

کی ہے کہ موسیقی کی تمام کتابیں محمد بن حسن بن مصعب کی حکم سے ترجمہ کی گئیں۔

لیکن ہمکو کسی کتاب اور اُسکے مترجم کا نام بہ تعین معلوم نہیں ہوسکا۔ جہاں تک ہمکو معلوم ہے سب سے پہلی تصنیف جو مسلمانوں کے ہاتھ آئی وہ نیقوماخس کی کتاب ہی جو ارسطو کا باپ تھا یہ کتاب اب اصلی زبان میں بمقام لیڈن ۱۸۶۷ء میں چھاپی گئی ہے۔

دوسری تصنیف اس فن میں ارسطکاس کی تھی۔

ارسطکاس (Aristoxenus) ارسطو کا شاگرد اور فن موسیقی کے ارکان میں تسلیم کیا گیا ہے۔ فیثاغورث نے اس فن کو صرف ذوق پر محمول رکھا تھا۔ ارسطکاس پہلا شخص ہے جسنے راگ کے ایقاعات کو ریاضی کے اُصول سے ثابت کیا۔ اور فیثاغورث سے جداگانہ طریقہ پر ایک درسگاہ کی بنیاد ڈالی۔ اسکی کتاب جو خاص ایقاع کے متعلق ہے اُسکا ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اور اسکا اصلی نسخہ آج یورپ میں موجود ہے ارسطکاس کی اور بھی بہت سی تصنیفات تھیں لیکن غالباً مسلمانوں کو نہیں ملیں۔ اور آج یورپ کو بھی اعتراف ہے کہ کتاب الایقاع کے سوا اسکی اور کوئی تصنیف نہیں ملتی

جغرافیہ

یونانی اسکول میں اس فن کی ابتدا اراٹسشنیز سے ہوئی جو حضرت عیسیٰ سے تقریباً سو برس پہلے اسکندریہ میں تھا۔ اسکے بعد ابرخس نے بہت کچھ اسپر اضافہ کیا۔ ابرخس کے بعد استرابون ہوا جو یونانی تھا۔ اسنے خود دور دراز مقامات کے سفر کیے اور جغرافیہ پر ایک عمدہ کتاب لکھی۔ اسی دور کے قریب مارنیوس تھا جسکے جغرافیہ میں زمین کا رنگین نقشہ موجود ہے۔ سب سے اخیر لیکن سب سے زیادہ نامور بطلیموس ہوا۔ وہ دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ اسنے تمام دنیا میں اپنی طرف سے

سیاح بھیجے جنہوں نے نہایت جدوجہد سے ملکتوں اور آبادیوں اور دریا و نہر وغیرہ کے
حالات بہم پہنچائے[۵۱]۔ اور انکی مدد سے ایک نہایت مفصل جغرافیہ لکھا جو آج بھی موجود ہے۔ اس
جغرافیہ میں اکثر شہروں کا عرض بلد و طول بلد بھی درج ہے۔

مسلمانوں نے اگرچہ ان تمام تصنیفات سے واقفیت پیدا کی چنانچہ مورخ مسعودی۔
کتاب التنبیہ والاشراف میں جابجا انکی طرف اشارہ کرتا ہے۔ لیکن جن کتابوں کا ترجمہ ہوا وہ
مارینوس اور بطلیموس کا جغرافیہ ہے۔

مارینوس۔ ـــــــ کے جغرافیہ میں تمام اقالیم کے جدا جدا رنگ تھے۔ مورخ مسعودی
نے لکھا ہے کہ تمام قدیم جغرافیوں میں یہ سب سے اچھا ہے[۵۲]

بطلیموس ـــــــ کا جغرافیہ آٹھ بابوں میں ہے اور نہایت مفصل ہے۔ اول
یعقوب کندی کے حکم سے اسکا ترجمہ ہوا۔ لیکن وہ اچھا نہ تھا۔ اسلئے دوبارہ ثابت نے ترجمہ کیا
اور نہایت عمدگی سے کیا۔ سریانی زبان میں بھی اس کتاب کا ترجمہ کیا گیا۔

طب

طب کی ابتدا یونان میں سقلیبس سے ہوئی۔ یونانیوں نے اسکو ابوالطب کا لقب دیا تھا اور
انکا خیال تھا کہ اسپر خدا کی طرف سے یہ فن الہام ہوا تھا۔ سقلیبس نے اپنی اولاد کو زبانی اس فن کی
تعلیم دی اور وصیت کی کہ یہ فن خاندان سے باہر نہ جانے پائے۔ اسکے خاندان میں بڑے بڑے
نامور حکما اور طبیب گذرے ہیں۔ اقلیدس۔ افلاطون۔ سولن وغیرہ اسکے خاندان سے تھے۔ سولھویں نسل میں تقریباً
حضرت عیسیٰ سے پانسو برس پہلے بقراط پیدا ہوا۔ اور یونانیوں میں وہ پہلا شخص ہے جسنے اس فن کو مرتب کیا

[۵۱] کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۳۰۔ [۵۲] کتاب مذکور صفحہ ۳۳۔

اور کتابیں لکھیں طب کی تعلیم کو عام بھی اُنہی نے کیا ورنہ اس سے پہلے بجز اس خاندان کے کوئی شخص اس فن کو حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ بقراط کے بعد جالینوس پر اس فن کا خاتمہ ہوگیا۔ یونانیوں کے نزدیک فن طب کو آٹھ ارکان ہیں اول اسقلیبس اور اخیر جالینوس۔ انکے بیچ میں غورس نیفس۔ برمانیدس۔ افلاطن۔ اسقلیبوس دوم اور بقراط تھے۔ ان لوگوں کے سوا اور بھی بہت سے صاحب تصنیف اطبا گذرے لیکن وہ ارکان فن نہیں کہے جاسکتے۔

(Axtepius)

مسلمانوں نے طب کے اس تمام سرمایہ کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ اور چونکہ بقراط و جالینوس نے اس فن کو درحقیقت نہایت کمال کے رتبہ پر پہنچایا اسیلئے انکی تصنیفات پر زیادہ توجہ کی۔ بقراط کی طرف اگرچہ بہت سی کتابیں منسوب ہیں لیکن انمیں سے ۳۰ کتابیں قطعی طور سے انکی تصنیف کہی جاسکتی ہیں چنانچہ یہ سب ترجمہ کی گئیں اور انمیں سے ۱۲۔ اسقدر مقبول و متداول ہوئیں کہ درس میں داخل ہوگئیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے ان کتابوں کے علاوہ بقراط کی اور بہت سی کتابیں گنوائی ہیں جنکا شمار ۹۴ تک پہنچتا ہے لیکن مصنف مذکور کا بیان ہے کہ انمیں بعض مشتبہ ہیں۔ بقراط کی ترجمہ شدہ تصنیفات میں سے جنکے مترجموں کا نام ہم تفصیل سے معلوم کرسکتے ہیں انکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
عہد بقراط	اس میں بقراط نے وہ شرائط بتائے ہیں جنکے بغیر کسی کو فن طب نہیں پڑھانا چاہیئے	حنین حبیش عیسی بن یحیٰی	اول الذکر نے سریانی میں۔ اور حبیش و عیسیٰ نے عربی میں ترجمہ کیا۔
فصول	تمام مسائل طبیہ کا خلاصہ ہے	حنین	محمد بن موسیٰ کیلئے ترجمہ کی گئی۔ سات مقالوں میں ہے
تقدمۃ المعرفۃ	علامات مرض کا بیان ہے	حنین و عیسیٰ	تین مقالے ہیں۔
الامراض الحادۃ	غذا، فصد، مسہل وغیرہ کا بیان ہے	عیسیٰ بن یحییٰ	اس کتاب کے پانچ مقالوں میں سے صرف تین کا ترجمہ ہوا

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب الکسر والجبر	ہڈیوں کے ٹوٹنے اور جوڑنے کا بیان ہے۔	حنین	چار مقالے
اسیدیمیا	•	عیسیٰ بن یحییٰ	•
اخلاط	•	ر	اس کتاب کا ترجمہ احمد بن موسیٰ شاکر کے حکم سے ہوا۔
قاطیطریون	اعمال ید کا بیان	حنین	محمد بن موسیٰ شاکر کے حکم سے۔
کتاب الماء والھواء	مختلف ملکوں کی آب و ہوا کی تاثیر	حبیش	
طبیعۃ الانسان	بدن کی ترکیب کا بیان	ر	

جالینوس ۹۵۸ء میں پیدا ہوا اور ہندسہ و حساب پڑھنے کے بعد سترہ برس کی عمر میں طب کی تحصیل شروع کی۔ اور اسکی تکمیل کے لئے اتھینز۔ سایپرس۔ اٹلی۔ اسکندریہ۔ وغیرہ کا سفر کیا۔ اسنے فن طب کے متعلق بہت سے نئے مسائل دریافت کئے۔ اور اس فن کو اس حد تک پہنچا دیا کہ اسلام کے دور تک اسپر کچھ اضافہ نہ ہو سکا۔ مسلمانوں نے اسکی تصنیفات کے بہم پہنچانے اور ترجمہ کرنے میں بے انتہا کوشش کی۔ ایک کتاب البرہان کی تلاش میں۔ جزیرہ۔ شام۔ فلسطین۔ مصر کے ایک ایک شہر کی خاک چھانی گئی۔ تصنیفات کے پتہ لگانے میں بڑی آسانی یہ ہوئی تھی جالینوس نے اپنی تصنیفات کی خود ایک فہرست لکھی تھی اور اسکا ترجمہ کر لیا گیا تھا۔ مترجمین میں سے حنین بن اسحاق نے اپنی تمام زندگی اُسی کی تصنیفات کے ترجمہ میں صرف کر دی۔ چنانچہ اس نے اپنی ایک تصنیف میں جالینوس کی ۱۲۹ کتابوں اور رسالوں کا نام مع تصریح مضامین لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ یہ تمام کتابیں عربی میں

۵۱ بقراط کی ان تصنیفات اور انکی علاوہ اور تصنیفات کے مضامین کو مؤرخ یعقوبی اور ابن ابی اصیبعہ نے نہایت تفصیل سے لکھا ہے۔ ۱۲ ۵۲ جالینوس نے اپنے حالات آپ نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ چنانچہ ابن ابی اصیبعہ نے اسکے حوالہ سے نہایت دلچسپ واقعات اپنی تاریخ میں جمع کیے ہیں۔ ۱۲

ترجمہ کرلی گئیں۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے حنین کا یہ قول نقل کرکے لکھا ہے کہ "اُسوقت حنین کی عمر ۴۸ برس کی تہی اور اُسوقت اسقدر کتابیں اسکو بہم پہنچ سکیں۔ اور چونکہ حنین نے ۷۰ برس کی عمر پائی اسلیے یہ یقینی ہے کہ اسنے جالینوس کی اور تصنیفات بہی حاصل کی ہونگی"۔ اسکے بعد علامہ ابن اصیبعہ نے لکھا ہے کہ میں نے خود جالینوس کی بہت سی کتابیں عربی زبان میں دیکھیں جنکا ذکر حنین نے اپنی فہرست میں نہیں کیا ہے چنانچہ علامہ موصوف نے ان کتابوں کے نام تفصیل سے لکھی ہیں جنکی تعداد ۲۲ ہے۔ جالینوس نے بقراط کی اکثر کتابوں کی شرح لکھی ہے ان کا ترجمہ بہی عربی میں کیا گیا چنانچہ بقراط کی جسقدر کتابوں کا نام اوپر مذکور ہوا جالینوس کی سب پر شرحیں ہیں اور سب کا ترجمہ عربی میں موجود ہے۔ بہرحال اسمیں شبہہ نہیں کہ جالینوس کی تصنیفات جسقدر اسوقت دنیا میں موجود ہیں ایک ایک کرکے ترجمہ کی گئیں جن کتابوں کے متعلق ہم زیادہ تفصیل معلوم کرسکے انکا ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب الفرق	•	حنین	
الصناعۃ	•	"	
کتاب النبض	•	"	
شفاء الامراض	•	"	
مقالات خمس	تشریح میں ہے	"	
اسطقسات	اربع عناصر	"	
کتاب المزاج	•	"	
القوی الطبیعیۃ	•	"	

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
العلل والاعراض		حنین	
تعرف علل الاعضاء الباطنۃ		حبیش	
کتاب النبض الکبیر		"	سولہ مقالہ ہیں
کتاب الحمایات		حنین	
البحران		"	تین مقالہ ہیں
ایام البحران		"	"
تدبیر الاصحاء		حبیش	چھ مقالہ ہیں
حیلۃ البرء		"	۱۴ مقالے ہیں پہلے مقالے کو حنین نے درست کیا

یہ تمام کتابیں قدیم زمانہ میں اسلامی درسگاہوں کی نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ انکے سوا جالینوس کی اور تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب التشریح الکبیر	تشریح کا بیان ہے	حبیش	۱۵ مقالوں میں ہے
اختلاف التشریح		"	۲ مقالے ہیں۔
تشریح الحیوان المیت	مردہ جانور کی تشریح	"	۱ مقالہ ہے۔
تشریح الحیوان الحی	زندہ جانور کی تشریح	"	۲ مقالے۔
علم البقراط بالتشریح		"	۵ مقالے
علم ارسطو فی التشریح		"	۳ مقالے
تشریح الرحم		"	۱ مقالہ
حرکات الصدر والرئیہ		اصطفن بن بسیل	۲ مقالے حنین نے ترجمہ کی اصلاح کی۔

نام کتاب	مضمون	مترجم	
علل النفس	۰	صطفن بن بسیل	۲ مقالے
کتاب الصوت	۰	حنین	یہ کتاب محمد بن عبدالملک الزیات کے لیے ترجمہ کی گئی ۴ مقالے
حرکۃ العضل	۰	حنین صطفن	حنین نے اصلاح کی ۱ مقالہ
کتاب الحاجۃ الی النفس	۰	حبیش	۱ مقالہ
کتاب الحاجۃ الی النفس	۰	صطفن	۰
کتاب العادات	۰	حبیش	۱ مقالہ
آراء بقراط و فلاطن	۰	"	۱۰ مقالے
کتاب الحرکات المجہولۃ	۰	حنین	۱ مقالہ
کتاب الامتلاء	۰	صطفن	"
منافع الاعضاء	۰	حبیش	۱۷ مقالے
کتاب فضل الہیأت	۰	حنین	سُریانی و عربی دونوں میں ترجمہ ہوئی ۱ مقالہ
خصب البدن	۰	حبیش	۱ مقالہ
کتاب سوء المزاج المختلف	۰	حنین	"
الادویۃ المفردہ	۰	"	۱۱ مقالے
کتاب الاورام	۰	ابراہیم بن الصلت	۱ مقالہ
کتاب المنی	۰	حبیش	۲ مقالے
المولود سبعۃ اشہر	۰	حنین	۱ مقالہ
کتاب المرۃ السوداء	۰	صطفن	"

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
کتاب داوۃ النفس	.	حنین	۳ مقالے
تقدمۃ المعرفۃ	.	عیسٰی بن یحییٰ	ا مقالہ
کتاب الفصد	.	"	"
کتاب الذبول	.	حنین	"
صفات الصبی الصرع	.	ابن الصلت	"
قوی الاغذیہ	.	حنین	۳ مقالے
التدبیر الملطف	.	"	ا مقالہ
کتاب الکیموس	.	ثابت و شملی و حبیش	.
کتاب ارسطرازس	.	حنین	.
تدبیر بقراط للامراض الحادہ	.	"	ا مقالہ
ترکیب الادویہ	.	حبیش الاعسم	۱۷ مقالے
الادویۃ المقابلۃ للادوار	.	عیسٰی بن یحییٰ	۲ مقالے
کتاب التریاق	.	یحیی بن البطریق	ا مقالہ
کتاب الی تراسابولس	.	حنین	.
الریاضۃ بالکرۃ الصغیرہ	.	حبیش	ا مقالہ
الریاضۃ بالکرۃ الکبیرہ	.	"	"
فی ان الطبیب الفاضل فیلسوف	.	حنین	"
کتب بقراط الصحیحۃ	.	"	"

نام کتاب	مضمون	مترجم	کیفیت
الحث علی تعلیم الطب		حبیش	ا مقالہ
محنۃ الطبیب		حنین	"
کتاب البرہان		"	یہی کتاب ہے جسکی تلاش میں حنین نے تمام ملکوں کا سفر کیا تھا۔
تعریف المرء عیوب نفسہ		توما	
کتاب الاخلاق		حبیش	۴ مقالے
انتفاع الاخیار باعدائہم		"	ا مقالہ
ما ذکرہ افلاطن فی طیماوس		حنین و اسحاق	۴ مقالے
فی ان قوی النفس تابعۃ لمزاج البدن		حبیش	

ان مشہور اطبا کے سوا۔ اور یونانی اطبا کی تصنیفات و تالیفات کے بھی ترجمے کیے گئے مثلاً ارسیجانس جو جالینوس سے پہلے تھا اسکے تین کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ کتاب ابتقام الارحام طبیعۃ الانسان۔ کتاب فی النقرس[۱]۔

روفس

جالینوس سے پہلے ایک اور بڑا نامی طبیب گذرا ہے جسکا نام روفس Rufus تھا اسکی ۴۲ کتابوں کے نام علامہ ابن الندیم نے اپنی کتاب میں بتفصیل نقل کئے ہیں۔ اور چونکہ علامہ موصوف کی کتاب کا موضوع انہی کتابوں کا نام لکھنا ہے جو عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں اس لیے یہ یقینی ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ انکے سوا اور جن حکما کی تصنیفات کے ترجمے ہوئے انکے اور انکی تصنیفات کے نام حسب ذیل ہیں۔

---

[۱] یہ پوری فہرست ابن الندیم کی کتاب سے مرتب کی گئی ہے دیکھو کتاب الفہرست صفحہ ۲۹۰

[۲] ابن ابی اصیبعہ صفحہ ۲۴۔

نام مصنف	تصنیفات ترجمہ کردہ شدہ
فیلغریوس Philagrius	کتاب من لایحضرہ طبیب۔ وجع النقرس۔ کتاب الحصاۃ۔ کتاب الماء الاصفر۔ کتاب وجع الکبد۔ کتاب قولنج۔ کتاب الیرقان۔ کتاب خناق الرحم۔ کتاب عرق النساء۔ کتاب السرطان۔ کتاب صنعۃ تریاق الملح۔ کتاب عضت کلب۔ کتاب علامات الاستقام کتاب فی القوباء۔ کتاب فیما یعرض للثۃ والاسنان۔
اوریباسیوس Oribasius	کتاب الی ابیہ۔ کتاب الی ابنہ۔ رسالۃ فی التشریح۔ کتاب الادویۃ کتاب السبعین۔ اول دو کتابوں کا ترجمہ حنین نے اور کتاب الادویہ کا ترجمہ اصطفن نے کیا۔
اوارس	کتاب العلل المھلکۃ۔
افلاطن طبیب	کتاب الکی
مغنس الحمصی (بقراط کا شاگرد)	کتاب البول۔
فولیس الاجانیطی	کتاب الکناش۔ کتاب علل النساء۔ مترجمہ حنین۔
اقریطون	کتاب الزینہ۔ یہ طبیب جالینوس سے پہلے اور بقراط کے بعد تھا۔
اسکندروس	علل العین و علاجہا۔ کتاب البرسام۔ کتاب الحیات والدیدان اللتی تتولد فی البطن مترجمہ ابن البطریق۔
مورنوس	کتاب الحقن۔ مترجمہ اصطاث۔

فیلغریوس
اوریباسیوس
اوارس
افلاطن طبیب
مغنس الحمصی Magnus
Paulus فولیس
Crita اقریطون
Alexander of Tralis اسکندروس
Discurides دیسقوریدس

اس سلسلہ میں دیسقوریدس کا نام خاص حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ حکیم ہے جس نے دواؤں اور ہر قسم کی بوٹیوں پر اپنے ذاتی تجربہ کے بنا پر ایک بہت بڑی مفصل کتاب لکھی۔ وہ ہمیشہ جنگلوں اور صحراؤں۔ جزیروں اور دور دراز مقامات میں سفر کیا کرتا تھا، اور جو دوائی ہات آتی تھی اُسکی تاثیر قلمبند کرتا تھا۔ اسکے ساتھ اس کی تصویر بھی کھینچتا تھا۔ جالینوس کا بیان ہے کہ ادویہ

مفردہ کے متعلق میں نے چودہ کتابیں مختلف مصنفوں کی دیکھیں لیکن دیسقوریدس کی کتاب کو کوئی نہیں پہنچتی۔" اس کتاب کا ترجمہ اور اسکی تصحیح جس اہتمام سے کی گئی۔ اسکو ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ اوپر لکھ آئے۔ دیسقوریدس کی یہ کتاب خود ہماری نظر سے بھی گذری ہے۔ تعجب ہو کہ دیسقوریدس کی اس کتاب پر اطبا ما بعد نے کچھ اضافہ نہیں کیا۔ مسلمانوں میں ابن جلجل اندلسی صرف ایک شخص گذرا ہے جسنے اپنے تجربہ سے کچھ دوائیں اسپر اضافہ کیں اور اُن کو ایک مستقل کتاب میں قلمبند کیا۔

یونانی تعلیم نے چونکہ عام عالمگیری حاصل کی تھی تمام ممالک میں اس کی شاخیں قائم ہو گئی تھیں۔ اس سلسلہ میں اسکندریہ سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ یہاں سات بڑے بڑے نامور طبیب پیدا ہوئے جنہوں نے طب یونانی کو بہت ترقی اور وسعت دی۔ ان لوگوں نے جالینوس کی ۱۶ کتابوں کو خاص کر لیا تھا اور انکے خلاصے اور شرحیں لکھی تھیں۔

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام حکما کی تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں لکھا ہے کہ "ان تمام شرحوں میں سے جسکو سب سے بڑھ کر پایا وہ جالینوس کی شرح ہے۔ اس شرح سے اسکا نہایت فضل و کمال ثابت ہوتا ہے۔"

یحییٰ نحوی

ان میں سب سے اخیر یحییٰ نحوی تھا جسکا مختصر ذکر فلسفہ کے بیان میں ہو چکا ہے۔ وہ فلسفہ اور طب میں نہایت کمال رکھتا تھا اور اسکندریہ میں بشپ کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ قیصر روم نے اسکو قسطنطنیہ میں بلایا تھا اور چونکہ فن طب میں کوئی شخص اسکا ہمسر نہ تھا۔ دربار میں نہایت قبول حاصل ہوا اور مدت تک وہ قسطنطنیہ میں رہا۔ اسنے جالینوس کی ۱۶ کتابوں پر شرحیں لکھیں جو سب عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ ابن ابی اصیبعہ نے ان سب کے نام تفصیل سے لکھے ہیں۔ لیکن میں بلحاظ اختصار قلم انداز کرتا ہوں۔

اطبائے اسکندریہ کے معاصر شام و روم میں بھی بہت سے نامی اطبائ تھے مثلاً شمعون۔
اہرن۔ یوحنا۔ طلیس۔ برطلاوس۔ سندہشار۔ کہلان۔ ادراس۔ بونیوسس بیروتی۔ سیوخنا۔
فلاغوسوس۔ عیسیٰ۔ سرجیس۔ اطنوس۔ غریغوریوس۔ وغیرہ وغیرہ۔

ابن ابی اصیبعہ نے مذکورہ بالا طبیوں اور ان کی تصنیفات کے نام لکھکر لکھا ہے کہ ان حکیموں کی اکثر تصنیفات اسوقت موجود ہیں اور ابوبکر رازی نے اپنی کتاب میں جسکا نام حاوی ہے۔ اکثر ان کتابوں سے نقل کیا ہے۔

ہندسہ (یا) جامیٹری

طالیس

اس فن کا موجد اول جس نے اسکی ابتدائی اور جذری مسائل کو فن کی صورت میں مرتب کیا تھیلز ہے جو حضرت عیسیٰ سے ۶۰۰ برس پہلے تھا۔ دائرہ اسی کی ایجاد ہے۔ اقلیدس کے تیسرے مقالہ کی یہ شکل بھی کہ "جو زاویہ نصف دائرہ میں ہوتا ہے قائمہ ہوتا ہے۔ اسی کی ایجاد ہے۔

انکساغوراس

اسکے بعد انکزیگورس نے کچھ مسائل اضافہ کیے جنمیں سے دائرہ کی تربیع بھی تھی لیکن ان حکما کی تصنیفات مسلمانوں کو نہیں مل سکیں کیونکہ وہ اسلام سے پہلے ناپید ہوچکی تھیں۔ اس سلسلہ میں سب سے مقدم زمانہ کی جو تصنیف مسلمانوں کو مل سکی وہ اقلیدس کی تصنیف تھی

اقلیدس

یہ مشہور فاضل حضرت عیسیٰ سے ۲۷۲ برس پہلے تھا۔ وہ اگرچہ یونان کا باشندہ نہ تھا لیکن چونکہ تعلیم یونان میں پائی تھی اور اسکی تصنیفات بھی یونانی ہی زبان میں تھیں اسلیئے وہ یونانی ہی کہلاتا ہے۔ مسلمانوں نے اسکی تصنیفات نہایت جد و جہد سے بہم پہنچائیں اور عربی زبان میں انکے

۱ے اس عنوان کی تفصیل میں جن حکما اور اہل فن کے نام آئے ہیں انکی تصحیح انگریزی حرفوں میں اوپر گذر چکی ہے۔

ترجمے کیے گئے۔

ہندسہ میں اسکی مشہور کتاب جو اُسکے نام سے مشہور ہے اسکا ترجمہ اول حجاج بن یوسف بن مطر نے ہرون الرشید کے لئے کیا۔ پھر اسی نے دوسرا ترجمہ مامون الرشید کے لئے کیا اور یہ ترجمہ زیادہ صحیح اور صاف ہو۔

اسحاق بن حنین نے بھی اسکا ترجمہ کیا اور ثابت بن قرہ نے اسکی اصلاح کی۔ حجاج کے نسخہ میں کل شکلیں ۴۶۸ ہیں۔ ثابت کے نسخہ میں ۱۰ شکلیں زائد ہیں۔ کچھہ مقالے ابو عثمان دمشقی نے بھی ترجمہ کیے۔

علماے اسلام نے نہایت کثرت سے اس کتاب کی شرحیں لکھیں۔ جنمیں سے۔ یزیدی۔ جوہری۔ ماہانی۔ ابو حفص الحرث خراسانی۔ ابوالوفا الجوزجانی۔ ابو القاسم الانطاکی۔ احمد بن محمد بن الکرابیسی۔ ابو یوسف الرازی۔ قاضی عبدالباقی بغدادی۔ ابو علی الحسن بن الہیثم المصری۔ ابو جعفر خازن اہوازی۔ ابو داؤد سلیمان بن عقبہ۔ کا نام خصوصیت سے لیا گیا ہے۔ قاضی عبدالباقی کی شرح نہایت بسیط ہے۔ اسنے اشکال کی مثالیں اعداد سے دی ہیں۔ ابن ہیثم نے مصادرات کی شرح لکھی ہے اور ایک کتاب میں اسکے مسائل پر اعتراضات لکھے ہیں اور پھر جواب دیئے ہیں۔ ثابت بن قرہ نے ان علل کی تشریح کی جنپر اقلیدس نے شکلوں کی ترتیب رکھی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنیکے قابل ہے کہ یورپ کو یہ کتاب عرب ہی کی بدولت اور عربی ہی زبان میں ملی۔ چنانچہ اول اسکا ترجمہ عربی زبان سے اڈیلرڈ دوباٹ نے کیا[۱]۔

ہندسہ میں اقلیدس کی اور بھی تصنیفات ہیں اور وہ عربی میں ترجمہ کی گئیں۔

اقلیدس کے بعد دو بہت بڑے ناموز فاضل گذرے جنہوں نے فن ریاضی کو اوج کمال تک

---

[۱] دائرۃ المعارف مطبوعہ بیروت ذکر اقلیدس۔ ۱۲

ارشمیدس
ابلونیوس

پہنچادیا۔ **ارشمیدس و ابلونیوس** ۔ ارشمیدس سرقوسہ میں ۲۸۷ برس قبل مسیح پیدا ہوا اور اسکندریہ کے مدرسہ میں علوم کی تحصیل کی وہ پہلا شخص ہے جسنے ہندسہ کو عملی طور پر برتا اور اسکے ذریعہ سے بہت سے مفید آلات ایجاد کیئے۔ پانی کی گھڑی بھی غالباً اسی کی ایجاد ہے۔ اس حکیم کی جو تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں حسب ذیل ہیں۔

نام کتاب	کیفیت	نام کتاب	کیفیت
کتاب الکرۃ والاسطوانہ	دو مقالے ہیں	تربیع الدائرہ	ایک مقالہ ہے
تسبیع الدائرہ	دائرہ کو سات حصہ کرنیکا طریقہ	الدوائر المماسۃ	
المثلثات		الخطوط المتوازیہ	
المفروضات		الماخوذات فی اصول الہندسہ	
ساعات الماء	یعنی پانی کی گھڑیاں۔	خواص المثلثات القائمۃ الزوایا۔	

ارشمیدس کی کتابیں آج کل اصل یونانی میں چھاپی گئی ہیں۔ اور میسو پیرارنے فرنچ زبان میں انکا ترجمہ بھی کیا ہے[۵۱]۔

ارشمیدس کی تصنیفات میں سے چونکہ کرہ اور اسطوانہ کی کتاب زیادہ مہتم بالشان تھی مسلمانوں نے اسی کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا۔ ثابت بن قرہ نے ترجمہ کی اصلاح کی۔ اوطوقیوس نے اسکی شکلات کی جو شرح لکھی تھی اسکا بھی عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ محقق طوسی نے اسکی تحریر لکھی۔ اس کتاب میں ۴۸ شکلیں ہیں اسی طرح کتاب الماخوذات کی طرف بھی بہت توجہ کی گئی۔ ابوالحسن علی نے اسکی تفسیر لکھی۔ طوسی نے اصلاح کی۔ ابوسہل نے بھی اسکو ترتیب دیا۔

ابلونیوس نے اس فن کو اور بہت زیادہ ترقی دی اور اسکندریہ کے مدرسہ کی شہرت اسکی

[۵۱] ارشمیدس اور اسکی تصنیفات کے لیئے دیکھو کتاب الفہرست و دائرۃ المعارف ذکر ارشمیدس و کشف الظنون - ۱۲

وجہ سے حد کمال کو پہنچ گئی۔ اسکی تصنیفات کے بہم پہنچانے میں بہت زیادہ جد و جہد کی گئی۔ کیونکہ پوری کتاب کا نسخہ کہیں موجود نہ تھا۔ مامون الرشید نے روم سے جو کتابیں منگوائی تھیں انمیں یہ بھی آئی تھی۔ یہ کتاب اصل میں آٹھ مقالوں میں تھی لیکن مسلمانوں کو صرف ۷ مقالے ملے اور آٹھویں مقالے کی صرف ۴ شکلیں۔ چار پہلے مقالوں کا ترجمہ ہلال حمصی نے اور ۳ مقالوں کا ثابت بن قرہ نے ترجمہ کیا۔ ابلونیوس کی اور کتابیں جو عربی میں ترجمہ کی گئیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب قطع الخطوط علی نسبتہ	
کتاب فی النسبتہ المحدودة	ثابت بن قرہ نے اسکے پہلے مقالہ کی اصلاح کی۔
کتاب قطع السطوح علی نسبتہ۔	
کتاب الدوائر المماسہ	

ان دو مہندسوں کے بعد منالاؤس اور اوطوقیوس کا نام زیادہ مشہور ہوا اور انہوں نے درحقیقت اس فن کو ترقی دی۔ منالاؤس Menlaus اسکندریہ کا رہنے والا تھا اور سنہ ۱ء میں تھا۔ بطلیموس نے اپنی کتاب مجسطی میں اسکا حوالہ دیا ہے۔ اسکی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔ جنکا ترجمہ عربی زبان میں ہوا۔

الاشکال الکریہ	
کتاب معرفة الکمیتہ	چند اجسام جو مخلوط کر دیے جائیں انکی کمیت دریافت کرنیکا طریقہ۔
اصول الہندسہ	تین مقالوں میں سے ثابت بن قرہ نے ترجمہ کیا۔
کتاب المثلثات	صرف چند اجزا کا عربی میں ترجمہ ہوا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ اس مصنف کی جو تصنیفات یورپ کو ملیں وہ عربی زبان کے ذریعہ سے ملیں ورنہ انکی اصل مفقود ہے۔

ان مشہور اہل فن کے سوا اور جن مصنفوں کی کتابیں ترجمہ ہوئیں انمیں سے ارسطو وغیرہ کی

کتابوں کا ذکر اوپر گذر چکا باقی کی تفصیل حسب ذیل ہے

اوطوقیوس ۵۰۰ء میں تھا اور شام کا رہنے والا تھا اسنے ارشمیدس کی مشہور کتاب الکرہ والاسطوانہ کے پہلے مقالہ کی شرح لکھی۔ ہندسہ میں اسکی ایک اور کتاب وخطوں کے بیان میں ہے اسمیں اسنے تمام حکمائے مہندسین کا مذہب اور انکے اقوال اور دلائل نقل کی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا پہلی کتاب کا ترجمہ ثابت نے کیا اور نہایت خوبی سے کیا[۵۷]

سنبلیقوس Senuplyous یہ یحییٰ نحوی کا معاصر تھا اسنے اقلیدس کی شرح لکھی چنانچہ اسکا ترجمہ عربی زبان میں موجود ہے۔

دیگر علوم وفنون

علوم مذکورہ بالا کے علاوہ اور بہت سے علوم وفنون تھے جنپر یونانی زبان میں سیکڑوں تصنیفات موجود تھیں اور جہاں تک مل سکیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں لیکن انکی تفصیل لکھی جاسے تو بہت بڑا دفتر بنجائے اور ناظرین گھبراجائیں اسلیے اجمالی طور پر اشارہ کرنا کافی ہوگا۔

بہت بڑا سرمایہ یونانی زبان میں ادب اور تاریخ کا تھا۔ یونان کو فصاحت وبلاغت پر اسقدر ناز تھا کہ وہ تمام دنیا کو الکن سمجھتے تھے۔ فصاحت وبلاغت کے اُصول اول یونانیوں نے منضبط کیے۔ ارسطو نے اس فن کو منطق میں داخل کیا اور اسکو ایک جداگانہ باب میں لکھا

---

[۵۷] فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۶۷

جسکا نام ریطوریقا ہے یہ کتاب بعینہٖ عربی زبان میں ترجمہ کی گئی۔ ارسطو کے سوا اور لوگوں نے بھی اس فن میں کتابیں لکھیں اور قراین سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سے معتدبہ کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔

یونانی لٹریچر کی جان اور روح ہومر کا کلام ہے جسکی نسبت یورپ کا دعوی ہے کہ کل دنیا میں اس سے بڑھ کر کوئی شاعر نہیں ہوا۔

ہومر کا ترجمہ خلیفہ مہدی کے عہد میں اسکے مشہور منجم ثاوفلیوس نے سُریانی زبان میں کیا۔ یونان کے اور بہت سے افسانے جو انشا کی حیثیت رکھتے تھے ترجمہ کیے گئے۔ علامہ ابن الندیم نے انکے نام بھی گنائے ہیں مثلاً کتاب سمسہ و دمن۔ سوردیانوس۔ انطوس سیاح۔ دیون درجیل وغیرہ وغیرہ لیکن عربی لہجہ کے تصرفات میں ان کتابوں کے نام اسقدر بدل گئے ہیں کہ ہم ان کے اصلی یونانی نام نہیں معلوم کر سکے۔ تاریخ اور اسکے متعلق اس کثرت سے عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں کہ یونان و روم کے حالات عربی زبان میں جس وسعت اور استقصار سے ملتے ہیں خود اسلامی ممالک کے حالات میں اس قسم کی اکثر جزئیات نہیں ملتیں۔ چنانچہ مورخ مسعودی کی تصنیفات کے دیکھنے سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مسعودی کے زمانہ سے پہلے اور خود اسکے زمانہ میں بہت سے مصنفوں نے مفید تاریخیں عربی زبان میں لکھیں جو یونانی تصنیفات سے ماخوذ تھیں اور اس لحاظ سے انکو بھی ایک قسم کا ترجمہ کہنا چاہیے۔ مثلاً فرقہ مارونیہ میں سے قیس مارونی نے ایک کتاب بادشاہان روم و مختلف ممالک کے حالات میں لکھی فرقہ ملکیہ میں سے ابن قسطنطن کی کتاب نہایت عمدہ خیال کیجاتی ہے اسی طرح سعید بن البطریق جو اسکندریہ کا لارڈ بشپ تھا اسکی کتاب جو عربی زبان میں ہے نہایت مستند خیال کیجاتی ہے اور ہمارے ملاحظہ سے بھی

سلہ دائرۃ المعارف جلد ۴ صفحہ ۳۶۲

گذرچکی ہے۔ اثنا یوس راہب نے آدم سے لیکر قسطنطن تک کے واقعات لکھے یعقوب بن زکریا کرکی کی تاریخ کو اکثر تصنیفات تاریخی پر ترجیح دیجاتی ہے۔ ابوزکریا نصرانی جو فلسفہ داں اور مسعودی کا معاصر تہا اُسنے اپنی کتاب میں بادشاہان یونان و روم کے واقعات کے علاوہ حکما اور ارباب فن کے حالات اور اُنکے اخلاق و عادات لکھے[۱]

فلاسفہ او حکما کے متعلق یونانی زبان سے نہایت مفید ذخیرہ ہات آیا اور عربی میں منتقل ہوا اسی کا اثر ہے کہ یونانی حکما مثلاً افلاطون۔ بقراط۔ ارسطو۔ وغیرہ کا نام آج بچہ بچہ کی زبان پر ہے اور انکے مقولے اور کہاوتیں نقل محفل ہیں۔ فرفوریوس جو تیسری صدی عیسوی میں تہا اور جسکا ذکر فلسفہ کے بیان میں گذرچکا ہے۔ اسنے حکما و فلاسفہ کے حالات میں جو کتاب لکھی تہی اُسکا بجنسہ ترجمہ کیا گیا۔ چنانچہ اسکے حوالوں سے علامہ ابن ابی اصیبعہ کی کتاب مالامال ہے۔ جالینوس نے اپنی تصنیفات کی ایک فہرست لکھی تہی اور اُسمیں اپنے علمی حالات بہی اکثر لکھے تہے وہ بہی ترجمہ کی گئی[۲] جالینوس عام طبی تصنیفات میں بہی اکثر اپنے واقعات لکھ جاتا ہے اس سے بہی اسکے بہت سے حالات بہم پہنچے۔ بطلیموس نے ارسطو کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی تہی۔ اسکا بہی ترجمہ کیا گیا۔ غرض اس طرح یونانی حکما و اہل فن کے متعلق جو کچھ یونانی زبان میں موجود تہا۔ عربی زبان میں آگیا اور انکو ترتیب دیکر نہایت عمدہ تالیفات طیار ہوئیں۔ حنین بن اسحاق کی کتاب نوادر الفلاسفہ والحکما۔ اور مبشر بن فاتک کی کتاب مختار الحکم و محاسن الکلم اور ابن جلجل اندلسی کی کتاب اورجمال الدین قفطی او شہرزوری کی تاریخ الحکما۔ اور ابن ابی اصیبعہ کی طبقات الاطبا۔ یہ تمام کتابیں جنہیں یونانی اور مصری حکما کے حالات دفتر کے دفتر ملتے ہیں۔ دراصل یونانی ہی تصنیفات ہیں جنہوں نے اپنا قالب بدل لیا ہے۔

---

[۱] ان تمام کتابوں کا ذکر کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۱۵۴ و ۱۵۵ میں ہے۔ [۲] طبقات الاطبا صفحہ ۱۰۴ جلد اول۔

فن حرب میں یونان میں دو بڑے مصنف گذرے۔ الیانوس۔ پولوبیس۔ ان مصنفوں نے لڑائی کے تمام اُصول قلمبند کئے جس میں فوجوں کی تقسیم صفوں کی ترتیب۔ فوجی شقیں، قواعد وغیرہ نہایت تفصیل سے مندرج ہیں چنانچہ ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا۔ اصل ترجمہ تو مجکو نہیں ملسکا لیکن ان کتابوں سے اخذ کرکے عربی میں جو کتاب لکھی گئی وہ یورپ میں چھپ گئی ہے اور میرے مطالعہ میں ہے۔

مسلمانوں نے یونانی لٹریچر کے عمدہ اور ضروری حصہ پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ جو کچھ زبان میں موجود تھا سب کو لیا۔ یہاں تک کہ شعبدے اور نیرنگجات، قیافہ، وفال، اکسیر وکیمیا، طلسمات، وحاضرات، ان لغویات سے بھی بے پروائی نہ کی۔

ارسطو کا ایک شاگرد **قالش ثانس** Callisthenes نامی تھا اور اکثر سکندر کے ساتھ رہتا تھا یونان میں غالباً اول اُسی نے نیرنگجات، اور شعبدے ایجاد کیے اور انپر کتابیں لکھیں۔ چنانچہ اسکی کتاب عربی زبان میں ترجمہ کی گئی جسکا نام الجامع فی النیرنجات والخواص ہے[1]۔

اس فن میں ایک اور نہایت مشہور فاضل گذرا ہے جسکا نام **بلنیاس** Apollonius تھا یہ پہلی صدی عیسوی میں تھا اور حضرت عیسیٰ کی نبوت کا منکر تھا۔ لوگوں سے کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ نے جو معجزے دکھلائے میں بھی دکھا سکتا ہوں چنانچہ اسکے ثبوت میں شعبدوں کے کرشمے دکھاتا تھا۔ اسکی کتاب جسمیں اُن طلسمات کا بیان ہے جو خود اسنے جابجا قائم کیے تھے عربی زبان میں ترجمہ کیے گئے[2]۔

قیافہ اور فال کے متعلق جو کتابیں ترجمہ ہوئیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب الفراسۃ۔ کتاب زجر الروم۔ کتاب الخیلان مصنفہ سیلنس رومی۔ کتاب فیثاغورس فی القرعۃ

[1] فہرست صفحہ ۳۱۰ [2] فہرست صفحہ ۳۱۲

کتاب ترعۃ ذی القرنین۔ کتاب القرعۃ المنسوب الی الاسکندر بالسہام[۱]۔

خواب کی تعبیر کے متعلق حسب ذیل کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ کتاب ارطامیدورس۔ کتاب النوم والیقظۃ لفرفوریوس۔

کیمیا کی۔ بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں، اور افسوس یہ ہے کہ اُسنے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو مدتوں تک بوالہوسی کے دام میں پھنسائے رکھا اور آج بھی ہزاروں پڑھے لکھے اس مرض میں مبتلا ہیں۔ بہرحال اس فن کی جو کتابیں عربی زبان میں آئیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب دیقرس فی الصنعۃ۔ کتاب الاسکندر فی الحجر۔ کتاب دیقرس فی جواب بدلیوس۔ کتاب قلوبطرۃ۔ کتاب سقناس۔ کتاب دوسیموس۔ کتاب کرمانوس۔

علامہ ابن الندیم نے اور بہت سی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ اور یہ ممکن تھا کہ میں تلاش اور کوشش سے ان کتابوں اور انکے مصنفین کے صحیح نام دریافت کرتا۔ لیکن اس بیہودہ شغل میں اگلوں نے وقت ضائع کیا تو کیا۔ میں کیوں اپنی اوقات خراب کروں۔

فارس

فارس

مسلمانوں کو فارس کے علمی ذخیرے سے جسقدر واقفیت ہونے کے ذریعے تھے اور کسی زبان سے نہ تھے۔ فارسی نسلیں نہایت کثرت سے اسلام لائیں۔ عباسیوں کے دربار میں عموماً مجوسی بھرے ہوئے تھے جنمیں بہت سے مذہباً بھی مجوسی تھے، اور انکے ترجمہ اور تالیف کی خدمت متعلق تھی۔ سلاطین اسلام اکثر فارسی خاندان سے تھے۔ تاہم تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ فارسی زبان کا جو سرمایہ عربی زبان میں آیا اُسمیں منطق۔ فلسفہ۔ ہیئت۔ ہندسہ۔ کا پتہ نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ نہایت کدوکاوش سے کسی فارسی حکیم کا نام بھی نہیں معلوم ہوتا حالانکہ

---

[۱] فہرست صفحہ ۳۱۴۔

یونانی حکما شلاً ارسطو۔ افلاطون۔ بقراط۔ جالینوس۔ کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اسکی وجہ اسکے سوا اور نہیں ہوسکتی کہ مسلمانوں کے زمانہ سے پہلے فارس کا ذخیرہ اکثر برباد ہوچکا تھا۔ اور بالخصوص فلسفہ اور اسکے متعلقات بالکل ناپید ہوچکے تھے۔ اسکی تفصیل میں کسی قدر اپنے مضمون کتب خانہاے اسلام میں لکھ چکا ہوں۔ یہاں مزید اطمینان کے لیے حمزہ اصفہانی جو بہت بڑا نامور مورخ گذرا ہے اُسکی عبارت نقل کرتا ہوں ؎ فاما تواریخ من کان قبل الساسانیۃ فلم اشتغل بہا للآفات المعترضۃ فیہا وذلک ان الاسکندر لما استولی علی ارض بابل وقہر اہلہا حسدہم علی ما کان اجتمع لہم من العلوم اللتی لم تجتمع قط لامۃ من الامم مثلہا فاحرق من کتبہم ما نالتہ یدہ ثم قصد الی قتل الموابدۃ والہرابذۃ والعلماء والحکماء ومن کان یحفظ علیہم فی اثناء علومہم وتواریخہم حتی اتی علی عامتہم[۱]

غرض مسلمانوں نے جب ترجمہ کے کام پر توجہ کی تو فارسی زبان میں جو ذخیرہ موجود تھا وہ تاریخ۔ طب۔ ادب۔ فن حرب وغیرہ کا ذخیرہ تھا اور وہ بھی اخیر زمانہ یعنی اردشیر اور اُسکے بعد کی تصنیفات تھیں مسلمانوں کو سب سے زیادہ دلچسپی فن تاریخ سے تھی اور اسیلیے تاریخ کا جسقدر سرمایہ ل سکا عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔ فارسی کی تاریخیں دو قسم کی تھیں۔ عام۔ جسمیں تمام سلاطین کے حالات و واقعات تھے اور خاص۔ جسمیں کسی کسی خاص بادشاہ یا خاص ملک و شہر کا حال تھا چنانچہ دونوں قسم کی تاریخیں کثرت سے عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ عام تاریخوں میں سے جن کتابوں کے

[۱] تاریخ سنی ملوک لحمزۃ الاصفہانی مطبوعہ یورپ صفحہ ۲۲۔ اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ ساسانیوں سے پہلے زمانہ کی تاریخ پر میں نے توجہ نہیں کی کیونکہ اُسپر بہت آفتیں آئیں وہ یہ کہ جب سکندر نے بابل پر قبضہ پایا اور وہاں کے لوگوں کو دبالیا تو انکے علوم و فنون پر اسکو رشک ہوا چنانچہ اس نے ان کی جس قدر کتابیں پائیں سب جلادیں اور موبدوں اور علما و حکما کو قتل کرادیا۔

نام ہم معلوم کرسکے وہ حسب ذیل ہیں۔

خدای نامہ۔ یہ نہایت مفصل کتاب تھی جسمیں ابتداے سلطنت عجم سے لیکر اخیر زمانہ تک مفصل[51] حالات درج تھے۔ عبداللہ بن المقفع نے اسکا ترجمہ کیا اور اسکا نام تاریخ ملوک الفرس رکھا یہ اصل کتاب اسقدر مقبول اور متداول تھی کہ بہرام بن مردان شاہ جو دولت عباسیہ کے عہد کا مترجم ہی اُسنے لکھا ہے کہ میں نے بیس سے زیادہ مختلف نسخے اس کتاب کے فراہم کیے تھے[52]۔

آئین نامہ۔ یہ نہایت مفصل تاریخ تھی۔ اور اسکا ترجمہ بھی عبداللہ بن المقفع نے کیا۔[53] علامہ مسعودی نے لکھا ہے کہ یہ بہت بڑی کتاب ہو اور کئی ہزار صفحوں میں ہے۔ اسکا مکمل نسخہ بجز پارسی موبدون کے اور کسی کے پاس پایا نہیں جاتا[54]۔

کہن نامہ۔ یہ آئین نامہ کا ایک ٹکڑا ہے۔ اسمیں عہدہ داران و متوسلان سلطنت کے مراتب مذکور ہیں چنانچہ اسمیں چھ سو عہدوں اور اُنکے مراتب اور درجات کا ذکر ہے[55]۔

سیر ملوک الفرس۔ عبداللہ بن المقفع نے اسکا ترجمہ کیا۔ لیکن یہ نام اصل کتاب کا نہیں بلکہ ترجمہ کا ہے۔

سیر ملوک الفرس۔ مترجمہ محمد بن جہم البرمکی

سیر ملوک الفرس۔ مترجمہ زادویہ بن شاہویہ۔ الاصفہانی۔

سیر ملوک الفرس۔ مترجمہ محمد بن بہرام بن مطیار الاصفہانی۔

سیکسران۔ یہ بھی نہایت مفصل تاریخ ہے۔ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے۔ کہ

---

[51] خدای نامہ کے لیے دیکھو حمزہ اصفہانی کی کتاب صفحہ ۸ و ۱۹ و ۲۲ و ۲۴ و کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۸۔ [52] کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۸۔

[53] دیکھو کتاب التنبیہ والاشراف المسعودی مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۰۴۔ [54] کتاب التنبیہ صفحہ ۱۰۴۔

[55]۔ ان چاروں کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۸ میں ہے۔

اہل عجم اس کتاب کی نہایت عزت کرتے تھے۔ عبداللہ بن المقفع نے اسکا ترجمہ کیا۔ پہلوی زبان میں تھی۔ یہ تمام کتابیں شاہان فارس کے حالات و واقعات میں ہیں لیکن انکے اصلی نام معلوم نہیں ہوسکے۔

خاص خاص عہد یا خاص خاص اشخاص کی جو تاریخیں عربی زبان میں ترجمہ کی گئیں حسب ذیل ہیں

تاریخ دولت ساسانی۔ خاندان ساسان کی یہ نہایت مفصل تاریخ تھی۔ اسمیں عام حالات کے علاوہ ساسانیوں کے قوانین سلطنت۔ اور طریق انتظام نہایت تفصیل سے درج تھے۔ چنانچہ اسکا ذکر ہم تفصیل کے ساتھ ابتدا میں لکھ آئے ہیں۔ مؤرخ مسعودی نے اس کتاب کا نسخہ سنہ ۳۰۳ھ میں بمقام اصطخر دیکھا تھا۔

ایضاً۔ مترجمہ ہشام بن قاسم الاصفہانی۔

[1] اصلاح وادہ بہرام بن مردان شاہ جو شہر نیشاپور کا موبد تھا۔

رستم و اسفندیار نامہ۔ اسمیں رستم و اسفندیار کے معرکوں کی تفصیل ہے۔ جبلۃ بن سالم نے اس کا ترجمہ کیا۔

بہرام نامہ۔ مترجمہ جبلۃ بن سالم۔

کارنامہ۔ نوشیرواں کے حالات و واقعات ہیں۔

شہرزاد با پرویز۔

کارنامہ۔ اردشیر بن بابک۔ جو بہت بڑا مدبر بادشاہ گذرا ہے اسنے خود اپنے واقعات و حالات اس کتاب میں قلمبند کیے تھے۔[2]

کتاب التاج

بہرام و نرسی نامہ

---

[1] ان دو اخیر کتابوں کا ذکر تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۹ میں ہے۔ [2] مروج الذہب مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۶۲ جلد اول۔ ۱۲

کارنامہ۔ نوشیرواں کے حالات میں نوشیرواں نامہ[۱]

مزدک نامہ سیرت نامہ۔ مداہو دبن فرخ زاد کی تصنیف ہے

عام تاریخوں اور سوانح عمریوں کے علاوہ اس قسم کی تمام تحریروں اور دستاویزوں کا بھی ترجمہ کیا گیا جنسے واقعات تاریخی کا پتہ لگتا تہا۔ مثلاً نوشیرواں نے اپنے بیٹے ہرمز کو جو وصیت نامہ لکھا۔ اور خاندان کے لیے جو وصیت لکھی۔ اردشیر بابکان کا عہد نامہ شاپور کے نام۔ کسریٰ و مرزبان کا سوال و جواب۔ نوشیرواں کا خط سرداران فوج کے نام۔ نوشیرواں اور جوبہپ کی باہمی خط کتابت یہ اور قسم کی بہت سی تحریریں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔

باوجود اسکے کہ مسلمانوں نے فارس کی تاریخ کے ساتھ اسقدر اعتنا کیا تاہم یورپ نے انکی کوششوں کی جو داد دی وہ یہ ہے کہ ملکم صاحب نے جنہوں نے ایران کی تاریخ نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھی۔ تحریر فرماتے ہیں کہ تمام مورخوں نے جو صدر اسلام کے ہمعصر تہے لکھا ہے کہ پیغمبر کے اصحاب نے ایرانیوں کی پامردی اور دلیری سے طیش میں آکر فتح کے بعد جسقدر انکی مذہبی چیزیں پائیں برباد کردیں۔ شہر کے شہر جلا دیئے۔ آتشکدوں میں آگ لگادی۔ موبدوں اور دستوروں کو قتل کردیا۔ اور جسقدر کتابیں تہیں، مذہبی یا تاریخی تمام برباد کردیں۔ قریباً چار سو برس تک کسی نے ایران کی قدیم تاریخ کے مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں کی سب سے پہلے کوشش اس باب میں جو ہوئی وہ سلاطین سامانیہ کی طرف سے ہوئی اور وہ بہی اس وجہ سے کہ یہ خاندان، بہرام چوبیں کی نسل سے تہا اور انکو اپنے باپ دادا کا نام زندہ کرنا مقصود تہا"

ملکم صاحب نے یہ خیال بہی ظاہر کیا ہے کہ اول جو کتاب شاہان عجم کی تاریخ میں لکھی گئی وہ شاہنامہ ہے۔ یہی ملکم صاحب نے صحابہ اور قرن اول پر جو متواتر اتہام لگائے ہیں، اُنسے قطع نظر کرکے انکا

[۱] ان سات اخیر کتابوں کا ذکر کتاب الفہرست صفحہ ۳۰۵ میں ہے۔ ۱۲

یہ بیان کسقدر صحیح ہے کہ مسلمانوں نے چار سو برس تک ایران کی تاریخ پر توجہ نہیں کی!! ذلک
مبلغهم من العلم۔ غریب ملکم کو معلوم نہیں کہ ساسانیوں کے دور سے پہلے ایسے بہت سے
مسلمان مورخ گذرے ہیں جنہوں نے اپنی تمام عمر صرف ایران کی تاریخ کی تدوین و ترتیب پر صرف
کردی۔ انہیں سے ایک عمر کسروی تھا جسکا لقب اسی وجہ سے کسروی پڑ گیا تھا۔ خدائی نامہ جسکا ذکر ہم
اوپر لکھ آئے ہیں۔ اسکی نسبت موسی کسروی کا بیان ہے کہ میں نے اس کتاب کو بار بار پڑھا اور اسکی
تصحیح و تحقیق میں بہت کوشش کی لیکن اسکے جسقدر نسخے ہاتھ آئے سب مختلف اور متناقض تھے بالآخر
میں حسن بن علی الہمدانی سے مقام مراغہ میں ملا اور چونکہ وہ اس فن کا بہت بڑا ماہر تھا اس سے اس
کتاب کی تصحیح کرنی چاہی[۱]۔ اسکے بعد کسروی نے نہایت غور رسی سے جس طرح سنین اور تاریخ کی
تحقیق کی ہے اسکو مفصل لکھا ہے۔ مورخ مسعودی نے باوجود اسکے کہ عرب کی نسل سے ہے
ایک کتاب خاص بہادران ایران کے معرکوں پر لکھی اور خود کتاب التنبیہ والاشراف میں تصریح کی کہ
میں نے یہ کتاب ابو عبیدہ کے جواب میں لکھی جسنے بہادران عرب کے معرکے لکھے تھے۔ غریب ملکم کو
یہ بھی نہیں معلوم کہ علامہ طبری۔ مسعودی۔ ابو حنیفہ دینوری۔ ابن واضح کاتب عباسی۔ حمزہ اصفہانی
وغیرہم جنہوں نے ایران کی تاریخیں نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھیں سب کے سب ساسانی دور سے
پہلے تھے۔

شاہنامہ، عام تاریخ کی حیثیت سے تو درکنار، منظوم تاریخ ہونے کی حیثیت سے بھی نئی
تصنیف نہیں۔ سب سے پہلے جسنے شاہنامہ نظم میں لکھا وہ ابو علی محمد بن احمد البلخی شاعر تھا۔ لیکن اسنے
صرف شاعرانہ حیثیت سے یہ کتاب نہیں لکھی بلکہ ایران کی نہایت قدیم اور نایاب تاریخیں فراہم کی ہیں
چنانچہ اسنے خود تصریح کی ہے کہ اس کتاب کے واقعات اسنے سیر الملوک عبد اللہ بن المقفع۔ و سیر الملوک

[۱] تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۱۶ و ۱۷۔

محمد بن جہم البرمکی۔ وسیر الملوک ہشام بن القاسم۔ وسیر الملوک بہرام بن مروان شاہ و سیر الملوک بہرام بن مہران اصفہانی۔ سے لیے ہیں۔ اور بہرام موبدی کی تصنیفات سے اسکا مقابلہ کیا ہے[۵۱]؛

ملکم صاحب کی کوتاہ بینی تو بالکل تعصب پر مبنی ہے لیکن چونکہ ایران کے تاریخوں میں جو مسلمانوں نے لکھیں دور از کار قصے مثلاً سیمرغ۔ دیو سفید۔ مار ضحاک۔ ہفتخوان وغیرہ۔ اکثر پائے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ۔ یونانی مورخوں کی تحریروں سے اکثر جگہ مطابق نہیں۔ اسلیے ظاہر میں یہ قیاس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ایران کا قدیم تاریخی سرمایہ ہات نہیں آیا۔ لیکن درحقیقت یہ قیاس صحیح نہیں مسلمان ہمیشہ سے اس بات کے عادی ہیں کہ جو روایت انکو ہات آئے اُسکو بغیر کسی تصرف اور کاٹ چھانٹ کے بیان کردیں۔ ایران کی قدیم تاریخوں میں یہ تمام دور از کار قصے موجود تھے۔ اسلامی مورخوں نے انکو اُسی طرح نقل کر دیا، نہ اسلیے کہ وہ بھی وہم پرست اور اس قسم کی مزخرفات پر یقین رکھنے والے تھے۔ بلکہ اسلیے کہ نقل و روایت میں دیانت داری کا یہی مقتضا ہے کہ اپنی طرف سے کچھ تصرف نکیا جائے۔ مورخ یعقوبی نے اپنی تاریخ میں مار ضحاک و سلاطین کی درازی عمر وغیرہ کی نسبت صاف تصریح کر دی ہے کہ ”یہ ایرانیوں کی لغویات ہیں“ بیرونی نے آثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ ولہم فی التواریخ القسم الاول واعمار الملوک وافاعیلہم المشہورۃ عنہم ما یستنفر عن استماعہ القلوب وتمجہ الاذان ولا تقبلہ العقول[۵۲]۔

یونانی مورخوں سے اختلاف کی یہ کیفیت ہے کہ مسلمانوں نے جب ایران کی تاریخ لکھنے پر توجہ کی تو انکے سامنے دو مختلف ماخذ موجود تھے۔ خود ایرانی تصنیفات، اور یونانی مورخوں کی جستہ جستہ تحریریں، لیکن مسلمانوں نے صاحب البیت ادریٰ بما فیہا کے موجب، ایرانی ہی تصنیفات پر

---

[۵۱] دیکھو کتاب الآثار الباقیہ للبیرونی۔ مطبوعہ یورپ صفحہ ۹۹۔

[۵۲] کتاب مذکور مطبوعہ یورپ صفحہ ۱۰۰۔

اعتبار کیا۔ مورخ مسعودی نے کتاب التنبیہ والاشراف میں صاف لکھا ہے[1]:

ولم نذکر من ذلک الا ما ذکرته الفرس دون غیرهم من الامم کالاسرائیلین والیونانیین والروم اذ کان ما یذهبون الیه فی ذلک خلاف ما حکته الفرس وکانت الفرس احق ان یوخذ عنها۔

یعنی "میں نے اس باب میں صرف وہ بیان کیا ہے جو ایرانیوں نے لکھا ہے۔ نہ وہ جو اور قوموں مثلاً یہودیوں، یونانیوں، اور رومیوں نے لکھا ہے۔ کیونکہ ان قوموں کا بیان ایرانیوں سے مختلف ہے اور ایرانی ہی اسبات کے مستحق ہیں کہ انکی روایت اختیار کی جائے"۔

مذہبی تصنیفات کا ترجمہ

تاریخ کے علاوہ مذہبی کتابوں کا ایک بڑا سلسلہ تھا اور وہ جہاں تک مل سکا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

ایران میں سب سے پہلا بانی مذہب جسکا نام و نشان معلوم ہے زردشت تھا۔ اُسپر جو کتاب (انجیل اسکے) آسمان سے اتری اسکا نام اوستا تھا۔ یہ کتاب قدیم پہلوی زبان میں تھی۔ زردشت نے خود اسکا ترجمہ کیا اور اسکا نام پاژند رکھا۔ پھر موبدوں نے اس شرح کی شرح لکھی جسکا نام پاردہ تھا۔ مجوسی اس تمام سلسلہ کو آسمانی اور وحی الہی خیال کرتے تھے۔ شرح الشرح تو سکندر کے ہاتوں بالکل برباد ہوگئی۔ لیکن اوستا اور ژند و پاژند کا سلسلہ باوجود سکندر کی غارتگری کے جا بجا بچا رہگیا اور وہی مسلمانوں کے ہات آیا۔ اوستا میں کل ۲۱ سورتیں تہیں اور ہر سورۃ تقریباً چار چار سو صفحوں میں لکھی جاتی تھی۔ ان سورتوں میں سے ایک سورہ کا نام جتبرشت تھا جسمیں دنیا کے آغاز اور انجام کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ایک سورہ کا نام ہادوخت تھا جسمیں نصائح اور پند تھی۔ غرض یہ تمام سلسلہ مسلمانوں نے بہم پہنچایا اور نہایت احتیاط سے اسکو محفوظ رکھا۔ چنانچہ مورخ مسعودی نے تصریح کی ہے کہ چوتھی صدی کے آغاز تک یہ کامل نسخہ موجود تھا اور سیستان میں ایک شخص کو یہ کتاب تمام و کمال

[1] دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۱۰۵۔

حفظ یاد تھی۔ اگرچہ قرائن سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام کتابیں عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں لیکن اسقدر تو مصرح شہادتوں سے ثابت ہے کہ اَوِستا کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور مدتوں تک اسکے نسخے پائے جاتے تھے۔ حمزہ اصفہانی جو تیسی صدی ہجری میں تھا۔ اسنے اپنی کتاب تاریخ سنی الملوک میں جابجا اَوِستا کے عربی ترجمہ کے حوالے دیئے ہیں اور یہ ترجمہ خود اسکی نظر سے گذرا تھا۔ حمزہ اصفہانی نے جو تاریخ کبیر لکھی اُسمیں یہی تصریح کی ہے کہ میں نے اس کتاب کے واقعات کو اَوِستا سے مقابلہ کر کے صحیح کیا ہے[۱]۔

زردشت کے علاوہ اور بہت سے جو مدعیان نبوت یا بانیان مذہب پیدا ہوئے ان میں مرقیون بن دیصان۔ مزدک اور مانی زیادہ مشہور ہیں۔ مرقیون۔ تیٹس کے زمانہ میں تھا جو قیصران روم کے سلسلہ میں بارہواں قیصر گذرا ہے۔ ابن دیصان۔ مرقیون سے ۳۰ برس بعد پیدا ہوا۔ مانی۔ شاپور بن اردشیر کے زمانہ میں تھا۔ مزدک قباد کا ہمعصر تھا۔ مرقیون اس بات کا قائل تھا کہ تمام کائنات نور و ظلمت سے پیدا ہوئی ہے۔ خدا نے خود کائنات کو نہیں پیدا کیا کیونکہ کائنات بُرائی سے خالی نہیں اور خدا بُرائی کا خالق نہیں ہو سکتا۔ مرقیون نے عقائد وغیرہ کے متعلق ایک کتاب لکھی جسکا نام انجیل رکھا۔ یہ کتاب بعینہٖ عربی زبان میں ترجمہ کی گئی۔

ابن دیصان کا مذہب مرقیون کے قریب قریب ہے۔ بلکہ گویا مرقیون کے مذہب کی ایک شاخ ہے۔ اسنے جو کتابیں تصنیف کی تھیں اُنمیں سے کتب ذیل کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا۔

کتاب النور و الظلمۃ۔ کتاب روحانیۃ الحق۔ کتاب المتحرک والجماد۔

مانی نبوت کا مدعی تھا اور اپنے تئیں فارقلیط کا مصداق سمجھتا تھا۔ اسنے ایک انجیل تصنیف

---

[۱] اوستا و زند و پاژند کے متعلق دیکھو کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۹۱ و ۹۲ و مسعودی مطبوعہ یورپ جلد دوم صفحہ ۱۲۴ و تاریخ حمزہ اصفہانی صفحہ ۶۴ و الآثار الباقیۃ للبیرونی صفحہ ۱۰۵۔

کی تھی جو موجودہ انجیل سے بالکل الگ تھی۔ اسکے اُصول عقاید یہ تھے کہ نور وظلمت قدیم ہیں۔ احکام فقہی میں جانور کا ذبح کرنا۔ آگ یا پانی۔ نباتات۔ کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔ اسکی تصنیفات بکثرت ہیں جنمیں سات بطور اصل کے ہیں۔ انمیں ایک فارسی زبان اور چھ سریانی زبان میں ہیں۔ یعنے سفر الاسرار۔ سفر الجبابرۃ۔ فرائض السماعین۔ شاپورگان۔ سفر الاحیار۔ فرقماطیہ۔

شاپورگان۔ مذہبی کتاب ہونے کے ساتھ تاریخی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ علامہ ابوریحان بیرونی نے اپنی کتاب الآثار الباقیۃ میں جابجا اسکے حوالے دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ تاریخی واقعات کی متعلق اردشیر کے زمانہ کے بعد ایرانی تصنیفات میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے[۱]۔

مانی کی تصنیفات ایک مدت تک موجود رہیں۔ علامہ ابوریحان بیرونی نے ایک رسالہ میں جو الآثار الباقیۃ کے ساتھ چھپا ہے لکھا ہے کہ مجکو مانی کی تصنیفات کی بہت تلاش تھی چنانچہ ایک دوست کے ذریعہ سے کتب ذیل میسر آئیں۔

فرقماطیا۔ سفر الجبابرۃ۔ کنز الاحیا۔ فسخ الیقین۔ انجیل۔ شاپورگان۔ سفر الاسرار۔ ان کتابوں کے علاوہ مانی نے بہت سے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے تھے۔ اور ان تمام رسالوں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ ابن الندیم نے ان تمام رسالوں کے نام بتفصیل لکھے ہیں[۲]۔

مانی کی تصنیفات وتالیفات اس کثرت سے عربی میں متداول ہوئیں کہ مسلمانوں میں اسکی معتقدات وخیالات عام طور پر پھیل گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کی نسبت یہ گمان کیا گیا کہ وہ مانی کے پیرو ہوگئے۔ مسعودی کے حوالہ سے ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ ابن ابی العرجا، حماد عجرد، یحیی بن زیاد۔ مطیع بن ایاس نے مانی کی تائید میں کتابیں کتابیں لکھیں۔ ابن الندیم نے اور بہت سے

---

[۱] الآثار الباقیۃ صفحہ ۲۰۸۔ [۲] مانی ومرقیون وابن دیصان اور انکی تصنیفات ورسائل کا ذکر فہرست ابن الندیم وکتاب التنبیہ والاشراف والآثار الباقیۃ میں مفصلاً ومجملاً ہے ۱۲۔

مسلمان علما کے نام لکھے ہیں جو مانی کی پیروی میں بدنام تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ نری تہمت ہے مسلمانوں میں ہمیشہ آزاد خیالی۔ اور تعصب دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ جو لوگ آزاد خیال تھے وہ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے مسائل کی تحقیقات اور اسکا تذکرہ کرتے رہتے تھے۔ متعصبوں کے نزدیک غیر مذہب والوں کا نام لینا بھی کفر تھا۔ اسلیے جو آزاد خیال علما غیر مذہب کے مسائل کو کسی حیثیت سے بیان کرتے تھے متعصبوں کے نزدیک وہ اُنہی مذاہب کے پیرو کہلاتے تھے۔

ایران میں سب سے اخیر شخص مذہبی فرقہ کا بانی ہوا وہ مزدک تھا۔ یہ نوشیرواں کے باپ قباد کے زمانہ میں تھا اور قباد اسکا مقلد ہو گیا تھا۔ مزدک کا اصل مذہب قریب قریب وہی تھا جو آجکل یورپ میں رڈیکل اور سوشلیسٹ وغیرہ کا ہے یعنی ہر آدمی۔ دوسرے آدمی کے مال اور ناموس پر اختیار رکھتا ہے۔ اسی بنا پر مزدک کے مذہب میں زنا کچھ گناہ نہ تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ مزدک نے کوئی مستقل تصنیف کی تھی یا نہیں لیکن یہ ثابت ہے کہ اسکی مسلمات و معتقدات و احکام و مسائل جسقدر تھے عربی زبان میں آگئے تھے چنانچہ۔ علامہ بلخی نے اسپر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جسکا نام عیون المسائل والجوابات [1] ہے۔ مزدک کے حالات فارسی زبان میں اسلام سے پہلے قلمبند کیے گئے تھے۔ عبداللہ بن المقفع نے اسکا ترجمہ عربی زبان میں کیا [2]۔

فن ادب

تاریخی اور مذہبی تصنیفات کے بعد جو چیز مسلمانوں کو سب سے زیادہ مرغوب تھی وہ فن **ادب** تھا چنانچہ فارسی کے لٹریچر کا جسقدر سرمایہ ہاتھ آیا۔ عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں زیادہ دلچسپ اور لطیف کتاب ہزار افسانہ تھی جو عربی میں ترجمہ ہو کر **الف لیلہ** کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ کتاب اصل میں شاہان عجم کے شغلہ اور شب بیداری کے لیے تصنیف ہوئی تھی اسمیں ہزار راتیں اور دو سو سے کم قصے تھے۔ چنانچہ اسکا بعینہ ترجمہ کیا گیا۔ لیکن موجودہ الف لیلہ

---

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۳۴۲۔ [2] کتاب الفہرست صفحہ ۱۱۸۔

فارسی کا ترجمہ نہیں ہے۔ بلکہ غالباً اُس نسخہ سے مرتب کیا گیا ہے جو محمد بن عبدوس جہشیاری نے بہت سی فسانہ گویوں کو جمع کر کے خود ایک جدید کتاب طیار کی تھی اور جسمیں ۴۰۰ راتیں تھیں[۵۵]۔

الف لیلہ کے سوا فارسی کے اور بہت سے ناول اور افسانے عربی زبان میں ترجمہ کیے گئے، لیکن افسوس ہے کہ انکے نام عربی میں آکر کچھ ایسے بدل گیے ہیں کہ لفظ کی صحت نہیں ہو سکتی انمیں سے ابن الندیم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے حسب ذیل ہیں۔

کتاب بوسفاس۔ حمد خسروا۔ مرمن۔ خرافۃ و نزھہ۔ خرس و خرگوش۔ روزبہ۔ سگ زبانہ و شاہ زناں۔ نمرود نامہ[۵۶]۔

اس سلسلہ کے علاوہ، فن انشا کی اور بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ انمیں سب سے نادر اور عجیب کتاب یتیمہ تھی۔ اس کتاب کی خوبی اور عمدگی اسقدر مسلم تھی کہ ملاحدہ اسکو قرآن مجید کے مقابلہ میں پیش کرتے تھے (نعوذ باللہ) چنانچہ علامہ **باقلانی** کو اپنی کتاب اعجاز القرآن میں اسکا جواب دینا پڑا۔ یتیمہ کے مقابلہ کی دوسری کتاب۔ اردشیر کا عہد نامہ تھی چنانچہ اسکا ترجمہ بھی عربی میں موجود ہے۔ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ جن کتابوں کی خوبی پر تمام زمانہ کا اتفاق ہے وہ حسب ذیل ہیں **عہد اردشیر**۔ **کلیلہ دمنہ**۔ رسالہ عمارۃ بن حمزہ۔ ماہانیۃ یتیمہ۔ رسالہ حسن لاحمد بن یوسف الکاتب[۵۷]۔

آداب و اخلاق کی کتابیں بھی کثرت سے ترجمہ کی گئیں انمیں سے چند کے نام ذیل میں ہیں[۵۸]

نامہ فرخ زاد — بیٹے کی نصیحت کے لیے لکھی تھی۔

نامہ مہرادد جسیس — یہ دونوں موبد تھے اور بزرجمہر وزیر نوشیرواں کے لیے یہ کتاب لکھی تھی۔

---

۵۵ الف لیلہ کے متعلق پوری تفصیل کتاب الفہرست صفحہ ۳۰۴ میں ہے ۱۲ - ۵۶ کتاب الفہرست صفحہ ۳۰۵ -

۵۷ فہرست صفحہ ۱۲۶ -

بفردس۔

موبد موبدان کی کتاب   محاضرات اور اخلاق میں ہے

کتاب اردشیر فی التدبیر یہ کتاب اردشیر کے حکم سے تمام حکما کی کتابوں سے التقاط کر کے لکھی گئی تھی۔

کتاب بن مردبود[۱] ہرمز بن کسریٰ کے لیے تصنیف کی گئی تھی

توقیعات کسریٰ نوشیرواں کے فرامین اور احکام

آداب کبیر
آداب صغیر } یہ دونوں کتابیں آداب اخلاق میں ہیں اور عبداللہ بن المقفع نے انکا ترجمہ کیا۔

فن حرب اور تدابیر جنگ کے متعلق نہایت مفید کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ چنانچہ بعض کتابوں کے نام ذیل میں درج ہیں

فن حرب

کتاب آداب الحروب۔ اسمیں نہایت تفصیل سے لشکر آرائی۔ قلعوں اور شہروں کا محاصرہ۔ گشت کی فوج سرحد کی مضبوطی اس قسم کے امور کے متعلق ہر قسم کے قاعدے اور تدبیریں درج تہیں۔ یہ کتاب اردشیر کے لیے طیار کی گئی تھی۔

کتاب تعبیۃ الحروب
وآداب الاساورۃ۔ } اسمیں خاص لشکر آرائی اور سواروں کی قواعد کے طریقے درج تہے۔

کتاب الرمی تیراندازی کے فن میں تہی اور بہرام گور کی تالیف تہی

چوگان و گوی[۲] اسکا مضمون نام سے ظاہر ہے۔

ان فنوں کے سوا اور بہت سے مضامین کی کتابیں ترجمہ کی گئیں شلاً **بیطاری۔ شکار بازی**۔ قیافہ و شگون۔ وغیرہ وغیرہ چنانچہ ان مترجم کتابوں کے نام جابجا فہرست بن الندیم

[۱] ان کتابوں کا ذکر فہرست بن الندیم صفحہ ۳۱۵ و ۳۱۶ میں ہے [۲] ان کتابوں کے لیے دیکھو ابن الندیم صفحہ ۳۱۴ ۔

میں ملتے ہیں۔

کلدانی۔ نبطی۔ سُریانی

تمام مورخوں کا بیان ہے کہ دنیا میں سب سے اول تہذیب و تمدن کی ابتدا بابل، و نینوا، سے ہوئی اور یہ مقامات کسی زمانہ میں جاہ و دولت و حرفت وصنعت کی مرکز تھے۔ خسوف وکسوف کے دریافت کے قاعدے اول یہیں کے علما نے معلوم کیے۔ دھوپ گھڑی اول یہیں ایجاد ہوئی۔ یہاں کی زبان نے مختلف دوروں میں مختلف نام پائے یعنی ارامی پھر کلدانی پھر سُریانی۔ ارامی و کلدانی یکساں خط میں لکھی جاتی تھی۔

مسلمانوں نے قدامت کے لحاظ سے ان زبانوں کی طرف نہایت توجہ کی اور بڑی مدد اس بات سے ملی کہ مترجموں کے گروہ میں سے اکثر انہی ممالک کے رہنے والے تھے اور سُریانی زبان انکی علمی اور قومی زبان تھی۔ ان زبانوں میں اگرچہ کسی وقت بہت سے علوم و فنون موجود تھے لیکن مسلمانوں کے دَور تک اصلی علوم اکثر مٹ چکے تھے اور اخیر اخیر صرف نجوم، سحر، خواب کی تعبیر اور اس قسم کی باتوں پر مدار رہگیا تھا۔ غرض جو کچھ ذخیرہ ملسکا مہیا کیا گیا او عربی زبان میں منتقل ہوا۔ بابل میں ستاروں کے نام پر سات بڑی عظیم الشان ہیکل تعمیر کیے گئے تھے جنمیں سے بعض کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ یہ ہیکل بڑے بڑے علما کے اہتمام میں تھے اور وہ ان ہیکلوں سے رصد خانہ کا کام لیتے تھے چنانچہ عطارد کا ہیکل ہرمز کے اہتمام میں۔ مشتری کا ثینکلوس کے اہتمام میں۔ مریخ کا طینقروس کے اہتمام میں تھا۔ ہرقل اور قیطوا بھی انہی علما میں تھے۔ ثینکلوس ایک مشہور عالم یہاں کا تھا جسکی نسبت علامہ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ ضحاک کے وقت میں تھا۔[۱]

---

[۱] فہرست ابن الندیم صفحہ ۲۳۸۔

افسوس ہے کہ انگریزی کتابوں کی روسی ان ناموں کی تصحیح نہیں ہو سکتی۔ نوفل آفندی ذ اپنی کتاب سیاحۃ المعارف میں جو یورپین تصنیفات سے ماخوذ ہے لکھا ہے کہ بابل کے علما میں سے بیلوس ایک بڑا ہیئت داں تھا جو حضرت عیسی سے ۲۱۴۰ برس پہلے تھا۔ ممکن ہے کہ یہ تینکلو ہو جسکو ابن الندیم نے ضحاک کا معاصر لکھا ہے۔ بہرحال عرب کے مورخوں کی تحریر کے مطابق ان سات علما میں سے اکثروں کی تصنیفات بہم پہنچیں اور انکا ترجمہ کیا گیا تینکلوس کی کتاب عربی میں ترجمہ ہو کر کتاب الوجوہ والحدود کے نام سے موسوم ہوئی۔ قیطوار کی کتاب کا نام صناعۃ النجوم رکھا گیا۔ ہرمز کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا جنکے نام ابن الندیم نے تفصیل سے لکھے ہیں لیکن چونکہ وہ صرف جادو اور شعبدہ و کیمیا کے متعلق ہیں میں انکے نام قلم انداز کرتا ہوں۔

بابل کی تاریخیں جو ہیں کی زبان میں لکھی گئی تھیں انہیں سے اکثر کا ترجمہ ہوا چنانچہ ابن الندیم نے انکے عربی نام حسب ذیل لکھے ہیں۔ کتاب ملک بابل۔ کتاب نمرود۔ کتاب الملک الراکب کتاب الشیخ والفتی۔ کتاب اردشیر۔ کتاب لاہج۔ کتاب الحکیم الناسک۔

مانی کی سات مشہور تصنیفات میں سے چھ سریانی زبان میں تھیں اور ان سب کا ترجمہ ہوا چنانچہ۔ اسکا ذکر زبان فارسی کے ذیل میں اوپر گذر چکا۔ کلدانی زبان کا سب سے بڑا مشہور مترجم احمد بن علی تھا جو ابن وحشیہ کے نام سے مشہور ہے اور جو نسل کے لحاظ سے بھی کلدانی تھا۔ علم فلاحت کے متعلق اسنے بابل کی تصنیفات کا جو مجموعہ مرتب کیا وہ درحقیقت نہایت مفید تصنیف ہے اور آج بھی مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے۔ طب۔ دینیات۔ سحر۔ نجوم۔ وغیرہ کے متعلق اسنے کلدانی زبان کا بہت بڑا ذخیرہ عربی زبان میں منتقل کیا۔ انہیں سے ابن الندیم نے جن کتابوں کے نام لکھے ہیں حسب ذیل ہیں۔ کتاب طرد الشیاطین۔ کتاب السحر الکبیر۔ کتاب السحر الصغیر۔ کتاب الدوار

[۵۱] کتاب الفہرست صفحہ ۳۱۲ و ۳۵۳۔

علی مذہب النبط۔ کتاب مذاہب الکلدانیین فی الاصنام۔ کتاب الاشارۃ فی السحر۔ کتاب اسرار الکواکب۔ کتاب حیاطوثی الکلدانی۔ کتاب الحیواۃ والماۃ فی علاج الامراض لراہطا بن سموطان الکلدانی۔ کتاب الاصنام۔ کتاب القرابین۔ کتاب الطبیعۃ۔ کتاب الاسمار[1]۔

عبرانی

یہ زبان سمٹک زبان کی شاخ اور کلدانی کی بہن ہے۔ اس زبان میں اگرچہ فلسفہ وسائنس کا ذخیرہ نہیں تہا۔ لیکن توریت وزبور وانجیل کی اصلی زبان عبرانی ہے اور بہت سے صحف انبیا بھی اسی زبان میں ہیں۔ اس لحاظ سے اس زبان کے ساتھ بھی نہایت اعتنا کیا گیا۔ غالباً سب سے اول جسنے عبرانی کتابوں کا ترجمہ کیا وہ احمد بن عبداللہ بن سلام، **ہرون الرشید** کے دربار کا ملازم تہا۔ اس فاضل نے عہد عتیق اور عہد جدید کی تمام کتابوں کا ترجمہ کیا اور یہ التزام رکھا کہ جہاں تک ممکن ہو ہر لفظ کا ترجمہ کیا جاے، چنانچہ دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے صحف انبیا، توراۃ، انجیل اور کتب انبیا کا ترجمہ عبرانی، اور یونانی، وعیسائی، زبان سے کیا۔ اور ترجمہ میں عبارۃ کی خوبی اور آرایش سے بالکل قطع نظر کی تاکہ معنی میں کسی قسم کا فرق نہ آنے پائے[2]

توریت کا دوسرا ترجمہ حنین بن اسحاق نے کیا۔ یہ ترجمہ اس یونانی نسخہ سے کیا گیا تہا۔ جو مصر میں بطلیموس اسکندر کے زمانہ میں ۷۲ بڑے بڑے نامور پادریوں نے عبرانی زبان سے یونانی زبان میں کیا تہا۔ اور یہ نسخہ تمام نسخوں سے صحیح تر سمجھا جاتا تہا[3]۔

عہد عتیق اور جدید کے مجموعہ کا جسمیں ۴۴ کتابیں شامل ہیں، اور لوگوں نے بھی عربی زبان میں ترجمہ کیا جنمیں سے اکثر یہود تہے۔ چنانچہ انہیں سے مفصلہ ذیل علما کا نام **مسعودی** نے

---

[1] کتاب الفہرست صفحہ ۳۰۵ و ۳۱۲ ۔ [2] یہ تمام تفصیل کتاب الفہرست صفحہ ۲۲ و ۲۳ میں ہے۔

[3] کتاب التنبیہ والاشراف للمسعودی صفحہ ۱۱۲۔

کتاب التنبیہ والاشراف میں لکھا ہے۔

ابو کثیر یحییٰ بن زکریا الکاتب الطبرانی — ۳۲۰ھ میں وفات پائی۔

سعید بن یعقوب الفیومی شمعنی — بہت بڑا فاضل تہا بغداد کے وُزرا اور قضاۃ کے دربار میں اکثر حاضر ہوتا تہا اور اسرائیلوں کے مباحثات میں اسکے فیصلے ہمیشہ تسلیم کیے جاتے تہے ۳۳۱ھ کے بعد وفات پائی۔

داؤد قومسی — بیت المقدس میں رہا کرتا تہا ۳۳۴ھ میں وفات پائی۔

ابراہیم بغدادی[1] — یہ بہی چوتہی صدی میں تہا۔

قبطی

قبطی زبان سے مصر کی قدیم زبان مراد ہے۔ مصر میں اگرچہ آج کل عموماً عربی زبان شائع ہے لیکن اصل قبطی زبان معدوم نہیں ہوئی اور قبطیوں کی مذہبی کتابیں اب بہی اسی زبان میں لکہی جاتی ہیں[2]۔ البتہ خطوط میں بہت انقلابات ہوئے۔ نہایت ابتدائی زمانہ میں ہیروغلوفی خط جاری تہا جو اہرام وغیرہ پر کندہ ہے۔ اس خط میں حروف نہ تہے۔ صرف نقوش اور تصویریں تہیں جو بالذات یا بالعرض مطالب پر دلالت کرتی تہیں ۷۰۰ء قبل مسیح علیہ السلام ابجدی حروف ایجاد ہوے۔ مذہب عیسوی کا قدم آیا تو یونانی خط جاری ہوا اور تمام تالیفات و تصنیفات اسی زبان میں ہونے لگیں۔

قدیم زمانہ کی تصنیفات تو اسلام سے پہلے معدوم ہو چکی تہیں۔ لیکن زمانۂ مابعد کا بہت بڑا ذخیرہ موجود تہا جو زیادہ تر بلکہ قریباً کل یونانی زبان میں تہا کیونکہ اسکندریہ میں حضرت عیسیٰ ؑ سے ۲۸۸ برس پہلے فلسفہ کا جو مدرسہ قائم ہوا تہا وہ گویا یونان کی شاخ تہا اور اسکندریہ کے بڑی بڑی

[1] ان چاروں کے لیے دیکھو کتاب التنبیہ والاشراف صفحہ ۱۱۳ — [2] سیاحۃ المعارف صفحہ ۶۱ —

لکھا مثلاً۔ ارسترخس۔ ارخس۔ ابلونیوس۔ فرفوریوس وغیرہ جنکا ذکر اوپر گذر چکا سب دراصل یونانی تھے
اس عہد کی اکثر تصنیفات عربی زبان میں ترجمہ ہوئیں لیکن انکا ذکر یونان کے تذکرہ میں
گذر چکا۔ یہاں صرف قبطی زبان کے سرمایہ سے بحث ہے۔ اگرچہ ہم تفصیل سے یہ نہیں بتا سکتے کہ
اس زبان کی کیا کیا کتابیں ترجمہ ہوئیں لیکن اسمیں شبہ نہیں کہ اس زبان کے ہر قسم کے سرمائے
بہم پہنچانے میں نہایت کوششیں کی گئیں۔ لوگوں کو تعجب ہوگا لیکن مورخ **مسعودی** نے
بڑے وثوق کے ساتھ بیک واسطہ روایت کی ہے کہ حضرت ذوالنون مصری۔ کو مصر کی قدیم عمارتوں
کے کتبوں کے دریافت کرنے کا نہایت شوق تھا اور انہوں نے ہیروغلوفی خط کے نقوش اور
تصویروں کو بڑی کوشش سے پڑھا تھا۔ **مسعودی** کے خاص الفاظ جیسا کہ علامہ مقریزی نے
نقل کیے ہیں یہ ہیں[1]۔

واخبرنی غیر واحد من بلاد اخمیم من صعید مصر عن ابی الفیض ذی النون بن
ابراهیم المصری الاخمیمی الزاهد وکان حکیما وکانت له طریقة یاتیها ونحلة یعضدها۔ و
کان ممن یقرا علی اخبار هذه **البرابی**[2] وامتحن کثیرا مما صور فیها ورسم علیها من الکتابة
والصور۔ قال رایت فی بعض البرابی کتابا تدبرته فاذا هو۔۔ ورایت فی بعضها کتابا تدبرته
فاذا فیه یقدر المقدر والقضاء یضحک۔

ابوزید بلخی نے لکھا ہے کہ اہرام پر جو تحریریں ہیں نہیں سے ایک عبارت کا عربی میں ترجمہ
کیا گیا تو اسکا یہ مطلب تھا الخ[3]۔ مورخ مقریزی نے اپنی کتاب (جلد اول صفحہ ۱۱۶) میں ایک اور واقعہ
نہایت تفصیل سے لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہایت قدیم قبطی خط کے پڑھنے والے اسلام

---

[1] دیکھو مقریزی جلد اول صفحہ ۳۹۔ [2] برابی۔ بربا کی جمع ہے بربا مصر کے قدیم مقبروں اور اس قسم کی عمارتوں کو کہتے ہیں۔

[3] مقریزی جلد اول صفحہ ۱۱۵۔ ۱۲۔

کے زمانہ میں موجود تھے۔ اگر یہ روایتیں صحیح ہیں تو ہیرو غلوفی خط کے پڑھنے کا فخر یورپ سے چھینکر مسلمانوں کو ملنا چاہیے۔ ہیرو غلوفی خط کے متعلق کچھ شبہ ہو تو ہو لیکن زمانہ مابعد کی قبطی تصنیفات کا ترجمہ کیا جانا بالکل یقینی ہے۔ فرعون کے زمانہ کی مالگذاری اور اُسکے مصارف کی تعداد اور تفصیل جو مسلمان مورخوں نے لکھی ہے وہ درحقیقت ایک قبطی کتاب کا ترجمہ ہے۔ چنانچہ مورخ مقریزی نے اس کتاب کے ترجمہ کیئے جانے کی تصریح کی ہے[1]۔

سنسکرت

اوپر ہم لکھ آئے ہیں کہ سنسکرت کے ترجموں کی ابتدا خلیفہ منصور کے عہد سے ہوئی یعنی ہندوستان کا ایک نامور پنڈت منصور کے دربار میں آیا اور کتاب سدھانتا۔ نذر گذرانی جسکا ترجمہ دربار کے ایک عالم محمد بن ابراہیم فزاری نے کیا اسی زمانہ میں یحیی برمکی نے ایک شخص کو ہندوستان بھیجا کہ وہاں جو دوائیں پیدا ہوتی ہیں اُنکو تلاش کر کے لائے اور نیز ہندوستان والوں کے عقائد اور مذہب وغیرہ کی تفصیل لکھ کر لائے۔ چنانچہ اس رپورٹ کا ایک نسخہ علامہ ابن الندیم نے یعقوب کندی کے ہات کا لکھا ہوا دیکھا تھا جس کی تاریخ کتابت سنہ ۲۴۹ھ تھی[2]۔ علامہ مذکور نے لکھا ہے کہ خاندان برامکہ نے ہندوستان سے بہت سے پنڈت اور ویدک کے علما طلب کیئے افسوس کہ انکے نام تفصیل اور صحت کے ساتھ نہیں ملتے۔ جاحظ اپنی کتاب البیان والتبیین میں ایک جگہ ایک ضمنی تذکرہ میں لکھ گیا ہے[3] کہ "معمر کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں یحیی بن خالد نے ہندوستان کے حکیموں یعنی منکہ۔ بازیکر۔ قلبرقل۔ بسمد بار وغیرہ وغیرہ کو طلب کیا تھا میں نے بہلہ ہندی سے پوچھا کہ بلاغت کس کو کہتے ہیں الخ" اس عبارت سے پتہ لگتا ہے کہ بہت سے ہندو پنڈت اور طبیب بغداد میں آئے تھے لیکن افسوس ہے کہ انکی تفصیل نہیں ملتی

---

[1] مقریزی صفحہ ۵، جلد اول۔ [2] کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۵۔ [3] کتاب مذکور صفحہ ۱۴ مطبوعہ مصر ۱۲

برامکہ کے سوا، ہرون الرشید اور مامون الرشید کی قدر دانی نے ہندوستان کے اہل کمال کو بغداد کی طرف متوجہ کیا۔ ہرون الرشید ایک مرتبہ سخت بیمار ہوا اور پایہ تخت کے اطبا علاج سے عاجز آ گئے، اس زمانہ میں ہندوستان کے ایک پنڈت کی شہرت دُور دُور پھیلی ہوئی تھی۔ ابوعمر عجمی کی تحریک سے ہرون الرشید نے اسکو طلب کیا اور اسکے علاج سے خدا نے شفا دی۔ اس فاضل کا نام منکا تھا اور وہ طبابت کے علاوہ علوم عقلیہ کا بڑا ماہر تھا۔ بغداد میں رہکر اسنے فارسی زبان سیکھ لی اور سنسکرت کتابوں کے ترجمے کرائے[۵۱]

ہرون الرشید کے دربار کا ایک نامور پنڈت سالی تھا۔ جسکو عرب کے مصنف صالح لکھتے ہیں۔ اسی عہد میں ایک اور مشہور فاضل ہندو تھا جسنے سنسکرت کتابوں کے ترجمے کیئے اس کے باپ کا نام دہن تھا اور اہل عرب اسکو اسکے اصلی نام کے بجاے ہمیشہ ابن دہن یعنی دہن کا بیٹا لکھتے ہیں۔ برمکیوں نے بغداد میں جو ہسپتال بنایا تھا یہ اُسکا افسر تھا[۵۲]

معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سنسکرت اور بھاشا کی تعلیم اس حد تک وسیع ہو گئی تھی کہ مدت تک ایک گروہ اس قسم کا موجود رہا جو ان زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ ہرون الرشید نے ہندوستان میں جو علما مناظرہ کے لیے بھیجے تھے۔ ضرور ہے کہ سنسکرت داں ہوں گے۔ مورخ مسعودی ۳۰۳ھ میں کھنبات آیا تھا اور وہاں کے حالات سے واقفیت پیدا کی تھی وہ لکھتا ہے کہ یہاں کا راجہ مذہبی مناظروں کا بہت شائق ہے اور مسلمان اور دوسرے مذہب کے لوگ جو اس شہر میں آتے ہیں اُنسے بحث اور گفتگو کرتا رہتا ہے[۵۳]۔ یہ ظاہر ہے کہ مناظرہ بھاشا زبان میں ہوتا ہوگا، اور سنسکرت تصنیفات سے واقفیت کے بغیر مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔

---

۵۱ منکا کا مفصل تذکرہ طبقات الاطبا جلد دوم صفحہ ۳۳ میں ہے۔ ۱۲ ۵۲ کتاب الفہرست صفحہ ۲۴۵۔

۵۳ مسعودی مطبوعہ یورپ جلد اول صفحہ ۲۵۴۔

اس گروہ میں سب سے بڑا ماہر **ابوریحان بیرونی** تھا جسکا مختصر حال ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ اسکی سنسکرت دانی اس مرتبہ کی تھی کہ اسنے بعض عربی تصنیفات کو ہندوؤں کے لیے سنسکرت میں ترجمہ کیا سنسکرت علوم و فنون کے متعلق جو کتاب اسنے لکھی ہے اور جسکو جرمن کے مشہور پروفیسر زخاؤ نے اپنی تصحیح سے چھپوایا ہے ہمارے سامنے ہے۔ یہ کتاب درحقیقت سنسکرت علوم و فنون کا نہایت عمدہ خلاصہ ہے۔ مصنف نے سنسکرت کی بہت سی مستند اور قدیم تصنیفات سے ذخیرۂ معلومات مہیا کیا ہے۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ چونکہ ہندو اپنی کتابوں کے دینے میں بخل کرتے تھے اسیلئے مصنف نے بہت سی کتابوں کو زبانی پڑھا اور یاد کیا۔ اسنے خود لکھا[۵۱] ہے کہ مختلف پرانوں میں سے جو پران میں نے زبانی سیکھے وہ حسب ذیل ہیں۔

ادپران۔ مچھ پران۔ کورم پران۔ براہ پران۔ نرسنگھ پران۔ بایو پران۔ بامن پران۔ تند پران۔ اسکند پران۔ ادت پران۔ سوم پران۔ سانب پران۔ برہمانڈ پران۔ مارکنڈیو پران۔ تارکش پران بشن پران۔ برہم پران۔ ہیش پران۔

بیرونی کی کتاب کی جامعیت و وسعت معلومات کا اندازہ اُن ابواب کے عُنوان سے ہو سکتا ہے جو مصنف نے اختیار کیے ہیں۔ یہ کُل اسّی عنوان ہیں اور ہر عنوان پر تفصیلی بحث کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے سنسکرت کی مستند کتابوں سے لکھا ہے انہیں سے بعض عنوان ہم نمونہ کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

(۱) ہندوؤں کا اعتقاد خدا کی نسبت

(۲) موجودات عقلیہ و حسیہ کی نسبت اعتقاد

(۳) تناسخ کا مسئلہ

---

[۵۱] کتاب الہند صفحہ ۶۲۔

(۴) بید اور پُران اور دیگر مذہبی کتابیں۔

(۵) نحو اور عروض کی تصنیفات

(۶) دیگر علوم کے متعلق تصنیفات

(۷) ہیئت اور نجوم۔ اسکے متعلق بہت سے عنوان قائم کئے ہیں اور ہر ایک پر مفصل بحث کی ہے

(۸) حرام و حلال۔

(۹) قانون وراثت۔

اس نامور مصنف نے علاوہ اس کتاب کے سنسکرت کی متعدد کتابیں عربی میں ترجمہ کیں یا سنسکرت کی کتابوں سے اخذ کر کے لکھیں جنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سانیکا

پاتنجلی पातञ्जली

پلس سدھانتا

براہم سدھانتا ब्रह्म सिद्धान्त

برہ تسامیتا

لاجو مصنفہ براہمر वराहमिहिर

شدھانتا پر ایک کتاب جسکا نام جوامع الموجود بخواطر الہنود ہے۔ یہ کتاب ... صفحہ میں ہے

کھنڈ کھنڈکا۔ اس کتاب کا ترجمہ پہلے عربی میں ہوا تھا۔ جسکو عربی کتابوں میں ارکند لکھتے ہیں۔

کسوف پر ایک سالہ

ایک سالہ حساب پر۔ جسمیں بتایا ہے کہ سندہ اور ہندوستان میں صفروں کے شمار کا قاعدہ کیا ہے۔

ایک سالہ۔ جسمیں بیان کیا ہے کہ اعداد کے مدارج عربی میں باعتبار ہندی کے زیادہ صحیح ہیں۔ بقیہ بر عقب

کیے گئے ہیں ۱۵ صفحوں میں ہے۔

[12] راسیکا یعنی اربعہ متناسبہ پر ایک مضمون۔ ۱۵ صفحوں میں ہے۔

[13] اعداد کی ترتیب کے متعلق ایک رسالہ۔

[14] برہما سدھانتا میں حساب کا جو طریقہ ہے اسکا ترجمہ۔ ۴۰ صفحوں میں ہے۔

[15] موجودہ زمانہ کا تعین باعتبار ہندی تاریخ و سنہ کے۔ ۱۰۰ صفحوں میں ہے۔

ایک رسالہ جسمیں یہ تعین بتایا ہے کہ کون کون ثوابت صرف منازل قمر کے متعلق ہیں۔

اُن سوالات کے جوابات جو ہند و ہیئت دانوں نے اُس سے پوچھے تھے۔ ۱۲۰ صفحوں میں ہے۔

اُن سوالوں کے جواب جو کشمیر سے اُسکے پاس آئے۔

طول عمر کے شمار کا ہندی طریقہ۔

लघुजातक لاگھوجتیاکم۔ مصنفہ وراہ مہر۔ کا ترجمہ جو ایک چھوٹی سی کتاب ولادت کے متعلق ہے۔

بامیان کی دو بتوں کی کہانی۔

نیلوفر کا قصہ جسمیں دیبتی اور بربھاکر کا بیان ہے۔

کلپہ یا یہ۔ کا ترجمہ جو ایک رسالہ ہے متعلق عوارض مکروہ کے۔

واسودیو۔ वासुदेव کے دوبارہ ظہور پر ایک مضمون۔

ایک کتاب کا ترجمہ جو تمام محسوسات اور مدرکات پر مشتمل ہے

مساوات کی تنصیف کی وجہ کے متعلق ایک رسالہ۔ موافق رائے برہمہ سدھانتا۔

سلہ بیرونی کی کتاب الآثار الباقیہ جو یورپ میں چھاپی گئی ہے اسکے آخر میں خود بیرونی کی لکھی ہوئی ایک فہرست شامل ہے جسمیں اسنے اپنے تمام تصنیفات کی تفصیل لکھی ہے۔ کتاب الہند میں بھی جا بجا اپنی تصنیفات اور ترجموں کا ذکر کیا ہے۔ میں نے اسی مقام پر جن ترجموں کی فہرست دی ہے۔ انہی دونوں کتابوں سے ماخوذ ہے ۔۱۲

اخیر اخیر میں اکبر شاہ کی بدولت سنسکرت کی تصنیفات نے زیادہ تر مسلمانوں میں رواج پایا۔ اکبر کو ہندوؤں کی طرف جو میلان تہا وہ عام طور سے مشہور ہے۔ اُسنے اپنے دربار میں بڑے بڑے قابل اور نامور پنڈتوں کو جمع کیا تہا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری۔ میں جہاں دانش اندوزان دولت کی فہرست دی ہے ہندو علما میں سے حسب ذیل نام شمار کئے ہیں۔

مہادیو۔ بہیم ناتھ۔ بابابلاس۔ نرائن۔ سیوجی۔ مادہو۔ رام بہدر۔ سری بہٹ۔ مادہو سرستی جدروپ۔ بشن ناتھ۔ مدسودن۔ رام کشن۔ نارائن اسرم۔ بلبہدر مصر۔ ہرجی سور۔ مابدیو مصر۔ دامودر بہٹ۔ باہن بہٹ۔ رام تیرتھ۔ بدہ نواس۔ نرسنگ۔ گوری ناتھ۔ برم اندر۔ گوپی ناتھ۔ بجی سین سور۔ کشن پنڈت۔ نہال چند۔ بہٹاچارج۔ کاشی ناتھ۔

اکبر نے اپنے اہتمام سے بہت سی کتابوں کے ترجمے کرائے۔ دیوی برہمن اور عبدالقادر بدایونی۔ و شیخ سلطان تہانیسری و نقیب خاں کی شرکت سے مہابہارت کا فارسی میں ترجمہ ہوا۔ اکبر نے اس ترجمہ کا نام رزم نامہ رکہا اور تمام معرکوں کی تصویریں بنواکر اسمیں شامل کیں۔ مذکورۂ بالا فضلا نے رامائن کا بہی ترجمہ کیا اور اسمیں بہی تصویریں بنوائی گئیں۔ اتہربن بید جو تہا بید ہے اسکا ترجمہ حاجی ابراہیم سرہندی نے کیا اور اس ترجمہ کا قلمی نسخہ ہمارے کالج کے کتبخانہ میں موجود ہے۔ لیلاوتی جو فن حساب کی مشہور کتاب ہے اسکا ترجمہ فیضی نے کیا تاجک جو علم نجوم میں ایک معتبر تصنیف ہے مکمل خاں گجراتی نے اسکو فارسی قالب پہنایا۔ کنہیا جی کے حالات میں ہربنس ایک کتاب ہے۔ مولانا شیری نے اسکا ترجمہ کیا۔ نل اور دمن کا قصہ جو ایک پُر درد ناول ہے فیضی نے اسکو مثنوی کا لباس پہنایا۔[1]

اکبر نے سنسکرت کے سرمایہ میں بہی اضافہ کیا یعنی عربی و فارسی کی کتابیں سنسکرت میں

[1] ابوالفضل نے ان تمام واقعات کو آئین اکبری میں آئین تصویر خانہ کے ذیل میں لکہا ہے ۱۲

ترجمہ کرائیں چنانچہ بیج میزانی کا ترجمہ سنسکرت میں کیا گیا جسکے ترجمہ میں فتح اللہ شیرازی۔ ابوالفضل
کشن جوتشی۔ گنگا دھر۔ مہیش۔ مہانند۔ یہ سب فضلا شریک تھے۔

ہر قسم کے علوم و فنون کے متعلق سنسکرت کی تصنیفات جو فارسی اور عربی میں ترجمہ ہوئیں
انکا اگر استقصا کیا جائے تو ایک مستقل رسالہ لکھنا پڑیگا اور شاید میں اس محنت کو گوارا کرتا لیکن بڑی
وقت یہ ہے کہ عربی لب و لہجہ نے ناموں میں اسقدر تغیر پیدا کر دیا ہے کہ اکثر کتابوں اور مصنفوں
کے صحیح نام دریافت نہیں ہو سکتے۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں لکھا ہے کہ
کنکہ ہندوستان کا سب سے بڑا نامور طبیب و حکیم تہا اور اسکی حسب ذیل تصنیفات ہیں۔
(یعنی جو عربی میں ترجمہ کی گئیں)۔ کتاب النمودار فی الاعمار۔ اسرار الموالید۔ القرانات الکبیر۔ القرانات
الصغیر۔ کناش۔ کتاب فی التوہم۔ کتاب فی احداث العالم والدور فی القران۔ کنکہ کی جن کتابوں کا
نام ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے بے شبہہ عربی میں موجود ہیں لیکن ہمکو خود کنکہ کا پتہ نہیں چلتا
کہ اسکا اصلی نام سنسکرت تلفظ میں کیا ہے۔

علامہ مذکور نے ہندوستان کے اور حکما کے نام لکھے ہیں یعنی باکھر۔ راجہ۔ سکھہ۔ داہر۔ رنگل
جبہر۔ اندی۔ جاری۔ اور لکھا ہے کہ ان حکما کی اکثر تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ لیکن ہم ان
ناموں کی صحت نہیں کر سکتے

چरक طبی تصنیفات میں صحیح لفظ کے ساتھ ہمکو صرف دو تصنیفوں کا پتہ لگتا ہے ایک
چرکا کی کتاب جو آج سے پانچہزار برس پہلے نہایت مشہور طبیب تہا اور جسکو ہندو بہت بڑا رشی مانتے
تہے۔ یہ کتاب پہلے فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ پہر عبداللہ بن علی نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا۔
دوسری **ششرت** सुश्रुत کی کتاب جو دس بابوں میں ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ یحیٰی بن خالد
کے حکم سے کیا گیا۔

ناموں کی صحت سے مایوس ہو کر ہم ایک اجمالی نقشہ مورخین عرب کی تصریحات کے موافق اس موقع پر درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ہر علم و ہر فن کے متعلق سنسکرت کی کون کون سی تصنیفات عربی میں ترجمہ کی گئیں[1]۔ انمیں بیرونی وغیرہ کے وہ ترجمے داخل نہیں جنکا ذکر اوپر گذر چکا

نام کتاب	کیفیت
بدان	اسمیں چار سو چار بیماریوں کا بیان ہے
شندہشان	ابن دہن نے اسکا ترجمہ کیا۔
فیما اختلف فیہ الہند والروم	یونانی اور ہندوستانی طب میں جو اختلافات ہیں اسکا بیان۔
تفسیر اسماء العقاقیر	دواؤں کا نام۔ اسکا ترجمہ منکہ نے اسحاق بن سلیمان کے لیے کیا تھا۔
رای کی کتاب	سانپوں کے اقسام اور انکے زہر کا بیان
استانکر کی کتاب	ابن دہن نے اسکا ترجمہ کیا
حاملہ عورتوں کا علاج	—
توقشتل کی کتاب	اسمیں سو بیماریوں اور سو علاجوں کا بیان ہی
روسا کی کتاب	عورتوں کے علاج میں۔
کتاب السکر	
کتاب التوہم والامراض	ناکشتل کی تصنیف ہی
کتاب السموم	شاناق کی تصنیف ہی اور زہروں کا بیان ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ اول فارسی میں ابوحاتم بلخی نے منکہ کی مدد سے کیا۔ پھر مامون کے حکم سے عباس بن سعید نے کیا۔

[1] یہ فہرست انتخاب کتب ذیل سے ماخوذ ہے۔ طبقات الاطبا جلد دوم صفحہ ۳۲ و ۳۳ و کتاب الفہرست صفحہ ۳۰۳ و ۳۰۵ و ۲۷۱ و تاریخ یعقوبی جلد اول صفحہ ۱۰۵۔

نام کتاب	کیفیت
کتاب البیطرۃ	جانوروں کا علاج۔
کتاب فی النجوم	شاناق ہندی کی تصنیف ہے۔
کتاب الموالید	جودر کی تصنیف ہے۔
توفا	منطق میں ہے۔
ما تفاوت فیہ فلاسفۃ الہند والروم	یونانی اور ہندوستانی فلسفہ کے اختلافات
سندباد	سندباد کا قصہ جو الف لیلہ میں شامل ہے درحصل سنسکرت سے ماخوذ ہے۔
بوداسف بلوہر	

ان کتابوں کے علاوہ ابن الندیم نے اور بہت سی کتابوں کے نام لکھے ہیں مثلاً کتاب البلہ۔ کتاب ادب الہند والصین۔ کتاب دیک الہندی۔ کتاب سادیرم۔ کتاب ملک الہند۔ کتاب الاشربۃ۔ کتاب بیدپا وغیرہ وغیرہ لیکن مبہم اور غیر صحیح اللفظ نام لکھتے لکھتے میں عاجز آگیا ہوں۔

اسلامی

مدارس و دار العلوم

اسلام میں باقاعدہ تعلّم و تعلیم کا آغاز اگرچہ ۲۳ھ میں ہوا اور اول ہی کی دو تین صدیوں میں جس درجہ کے سیکڑوں ہزاروں مجتہد۔ فقیہہ۔ ادیب۔ شاعر۔ فلاسفر۔ موّرخ۔ پیدا ہو گئے زمانہ کو نوسو برس کی وسیع مدت میں بھی اُس پایہ کے لوگ نصیب نہیں ہوے لیکن تعجب ہو کہ تاریخ کے صفحوں میں چوتھی صدی کے اخیر تک بھی کسی کالج یا اسکول کا نشان نہیں ملتا۔ مسجدوں کی صحن۔ خانقاہوں کے حجرے۔ علما کے معمولی مکانات۔ یہی اُسوقت کے مدرسے یا دار العلوم تھے۔

چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہو کہ "مامون الرشید کے زمانہ میں عمدہ عمدہ مدرسے بغداد۔ بصرہ۔ کوفہ۔ بخارا۔ میں قائم ہوئے[1]"۔ اس سے بھی زیادہ واضح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی شہادت ہے کہ "**مامون** نے اپنی ولیعہدی کے زمانہ میں خراسان میں ایک کالج بنوایا جسمیں مختلف ملکوں سے نہایت لائق لائق استاد بلا کر مقرر کئے۔ اور میسوع ایک بڑے فاضل کو جو دمشق کا رہنے والا اور مذہباً عیسائی تھا۔ کالج کا پرنسپل مقرر کیا[2]"۔ اگر یہ روایتیں صحیح ہوں تو مدرسوں کی ابتدائی تاریخ تصنیفات کے عہد سے قریب ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمکو معلوم ہے کہ ایشیا کا وسیع النظر مورخ ان شہادتوں کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھیگا۔ اور یہ کہکر ٹال دیگا کہ اپنے گھر کا حال ہم تم سے زیادہ جانتے ہیں۔

عام خیال تو یہ ہے اور تعجب ہو کہ علامہ ابن خلکان بھی اس سے متفق ہیں کہ "اسلامی دنیا میں اول جسنے مدرسوں کی بنیاد ڈالی وہ دولت سلجوقیہ کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا۔" اولیت

[1] کتاب مذکور۔ ذکر عرب۔ ۱۲ [2] کتاب مذکور حالات مامون الرشید۔ ۱۲

کی تعیین تو ہم نہیں کرسکتے۔ مگر یہ بتا سکتے ہیں کہ نظام الملک سے پہلے علمی عمارتوں کے آثار موجود تھے۔ سنہ ۳۹۵ھ میں حاکم مصر نے مصر میں ایک بڑا مدرسہ بنوایا۔ بہت سی کتابیں اسپر وقف کیں اور فقہا و محدثین درس و تدریس کے لیے مقرر کیے۔[1]

سلطان محمود غزنوی نے بھی ہندوستان کی بے انتہا دولت کا ایک حصہ اس عمدہ کام میں صرف کیا۔ متھرا کی فتح سے واپس جاکر قریباً سنہ ۴۱۰ھ میں خاص دارالسلطنت غزنین میں ایک نہایت عالیشان مدرسہ بنوایا۔ ایک کتبخانہ بھی اسمیں شامل تھا جس میں مختلف زبانوں کی کتابیں نہایت کثرت سے جمع کی گئی تھیں۔ مدرسے کے مصارف کے لیے بہت سے دیہات اور مواضع وقف کیے تھے۔ محمد قاسم فرشتہ کا بیان ہے کہ "اس عمدہ نظیر کی تقلید تمام ارکان دولت اور اُمرا نے بھی کی اور تھوڑے ہی دنوں میں غزنین علمی یادگاروں سے معمور ہوگیا"[2] دارالسلام بغداد اس فخر کے لیے ہنوز نظام الملک کا انتظار کررہا تھا لیکن نیشاپور میں بڑے بڑے کالج و اسکول قائم ہوچکے تھے۔ سلطان محمود کے بھائی امیر نصر نے ایک مدرسہ بنوایا۔ جو سعیدیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ مدرسہ بیہقیہ کے مدرس اعظم ابوالقاسم اسکاف اسفرائنی تھے۔ امام الحرمین نے جو امام غزالی کے اُستاد ہیں اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ استاد ابوبکر فورک کو لوگوں نے خطوط بھیجکر بلایا اور جب وہ تشریف لائے تو خاص اُنکے درس کے لیے ایک مدرسہ تعمیر ہوا جس کی نسبت کہا جاسکتا ہے کہ تاریخ اسلام میں اگر کوئی مدرسہ عام قومی چندہ سے بنا تو شاید یہی تھا۔ استاد ابوبکر نے سنہ ۴۰۶ ہجری میں وفات پائی۔ انکی تصنیفات کا اندازہ سو کے قریب کیا گیا ہے۔ اسیطرح ایک اور مشہور مدرسہ علامہ ابواسحق اسفرائنی المتوفی سنہ ۴۱۸ھ کے لیے قائم ہوا۔[3] حکیم ناصر خسرو سفر کرتا ہوا

---

[1] حسن المحاضرۃ علامہ سیوطی۔ ذکر حوادث غریبہ مصر سنہ ۳۹۵ھ۔ و تاریخ کامل واقعات سنہ ۳۹۵ھ۔ ۱۲ [2] تاریخ فرشتہ فتح متھرا۔ ۱۲

[3] اس مدرسہ اور مدرسہ بیہقیہ۔ و مدرسہ سعیدیہ کے لیے دیکھو حسن المحاضرہ علامہ سیوطی ذکر "امہات مدارس"۔ باقی مدارس کے حالات ابن خلکان میں [illegible]

سنہ ۴۳۷ھ میں جب نیشاپور پہنچا تو اسنے ایک مدرسہ دیکھا جو طغرل بیگ سلجوقی کے حکم سے تعمیر ہو رہا تھا[1] ایک اور مدرسہ تھا جو ابو سعد اسمٰعیل استر آبادی کی طرف منسوب ہے۔

اور شاید سب سے اخیر وہ مدرسہ تھا جو نظام الملک کی علمی فیاضی کا پہلا دیباچہ تھا۔ یہ مدرسہ بھی **نظامیہ** کے نام سے مشہور تھا لیکن جب بغداد کا مشہور دار العلم قائم ہوا تو اسکی علمی شہرت دب گئی اور اب اگر اسکو نظامیہ کہتے ہیں تو ساتھ ہی نیشاپور کی قید لگانی پڑتی ہے۔ تاہم اسکا یہ فخر کوئی نہیں گھٹا سکتا کہ امام غزالی کے اُستاد علامہ ابو المعالی امام الحرمین اسکے مدرس اعظم تھے۔ اور امام غزالی سے فخر روزگار اسی مدرسکے ایک مستعد طالب العلم[2] تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظامیہ کی عزت کچھ اسوجہ سے نہیں ہے کہ وہ دنیا میں سب سے پہلا مدرسہ تھا بلکہ اسلیے ہے کہ اُسکی عالمگیر شہرت نے تمام پچھلی یادگاروں کو اس طرح دلوں سے بھلا دیا کہ گویا اُس سے پہلے کوئی دار العلم بنا ہی نہ تھا۔ خود بغداد میں بھی تو اس سے کچھ پہلے الپ ارسلان سلجوقی کا ایک مدرسہ موجود تھا جو زر خطیر کے صرف سے طیار ہوا تھا مگر آج کتنے آدمی ہیں جو اُسکا نام بھی بتا سکیں۔

عرب کے سوا اسلامی ممالک میں جتنے خاندان فرمانروا ہوئے اُن سب میں پُرعظمت اور قوی تر آل سلجوق تھے۔ الپ ارسلان و ملک شاہ جنکی شہرت نے یورپ و ایشیا دونوں پر برابر قبضہ کیا ہی اسی خاندان کے یادگار تھے اور نظام الملک طوسی جسکے مبارک ہاتوں نے نظامیہ بغداد کی بنیاد ڈالی انہی دو کے دربار میں وزیر اعظم تھا[3] وہ صرف وزیر نہ تھا بلکہ سپید و سیاہ کا مالک تھا

---

[1] سفرنامہ ناصر خسرو مطبوعہ دہلی صفحہ ۲۴۳-۱۲ [2] دیکھو ابن خلکان ترجمہ امام الحرمین و امام غزالی-۱۲

[3] ملک شاہ کی سلطنت کاشغر سے بیت المقدس تک طول میں اور قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک عرض میں پہیلی ہوئی تہی اسکے عہد میں گویا وہ تمام ممالک اسلامی کا مالک تہا۔ سنہ ۴۰۸ھ میں پیدا ہوا اور سنہ ۴۸۵ھ میں وفات پائی۔ نظام الملک نے بیس برس تک اسکے دربار میں وزارت کی۔ (ابن خلکان ترجمہ ملک شاہ و نظام الملک)-۱۲

اُسنے چھ لاکھ دینار کی رقم خاص اس فیاضانہ کام کے لیے خزانہ شاہی سے مقرر کی تہی۔ اور تمام علداری میں مکتب اور مدرسے قائم کیے تہے۔ خاص اپنی کل جاگیرات میں سے بہی دسواں حصہ مدرسوں کے لیے وقف کردیا تھا[لہ]۔ لیکن سب سے بڑا کام جو اُسکے ہاتوں سے پورا ہوا وہ نظامیہ کی تعمیر تہی۔ گبن صاحب اُسکی نسبت لکھتے ہیں کہ "ایک سلطان کے وزیر نے بغداد میں مدرسہ قائم کرنے کے لیے دو لاکھ دینار[لہ] وقف کیے اور پندرہ ہزار دینار سالانہ اُسکے صرف کے لیے مقرر کیے۔ نتائج علمی سے چھ ہزار ہر درجہ کے طلبا مختلف وقتوں میں بہرہ اندوز ہوئے انمیں اُمرا کے لڑکے بہی تھے اور اہل حرفہ کے بہی۔ غریب طالب العلموں کے لیے کافی آمدنی مقرر تھی اور مُدرّسوں اور محققوں کی تنخواہیں بیش قرار تھیں"

۴۵۷ھ میں اُسکی تعمیر شروع ہوئی اور ۱۰ ذیقعدہ روز شنبہ ۴۵۹ھ کو بڑی شان و شوکت سے کھولا گیا۔ اگر مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ "رسم افتتاح کے وقت سارا بغداد اُمنڈ آیا تھا اور دار الخلافہ کی کل عظمت اور قوت نظامیہ کے ہال میں مجتمع تہی" تو قوم کے علمی جوش اور سلسلہ عمارت کی وسعت کا بہی ہم صحیح اندازہ کرسکتے ہیں۔ علامہ ابو اسحاق شیرازی جو ان ممالک میں اُستاد کل تسلیم کیے جاتے تھے مدرس اعظم مقرر ہوئے لیکن اُنہوں نے ایک شبہہ کی بنا پر اس عہدہ کو ناپسند کیا۔ اسلیے سر دست ابو نصر مصنف شامل کو یہ خدمت سپرد ہوئی۔ اور بیس دن کے بعد علامہ ابو اسحق بڑے اصرار سے اس منصب کے قبول کرنے پر راضی کیے گئے۔ نظامیہ کی عمر میں خدا نے بڑی برکت دی اور جب تک بغداد کی حکومت قائم رہی اُس کی فیاضیاں بہی دور دراز ملکوں تک اپنا اثر پہنچاتی رہیں۔ ہمارے مخدوم سعدی شیرازی اُسکے اخیر

لہ آثار البلاد علامہ قزوینی۔ ذکر شہر طوس۔ و روضتین فی اخبار الدولتین۔ ۱۲

لہ دینار کم از کم پانچ روپیہ کا ہوتا ہے۔ اگر اسی شرح سے حساب لگائیں تو بہی دس لاکھ روپئے ہوتے ہیں۔ ۱۲

زمانہ کے طالب العلم ہیں[۵۱]۔ امام غزالی۔ ابن الخطیب تبریزی شارح حماسہ۔ ابوالحسن فصیحی شاگرد امام عبدالقاہر جیلانی وغیرہ۔ مدرس عظم۔ اور امام احمد غزالی۔ ابوالمعالی قطب الدین شافعی۔ کیا ہراسی وغیرہ وقتاً فوقتاً اُسمیں نائب مدرس رہ چکے ہیں۔ ہر زمانہ میں علما کے لیئے نظامیہ کی پروفیسری سے بڑھکر کوئی بات اعزاز کی نہیں ہوسکتی تھی اور دو سو برس کی مدت میں کوئی ایسا شخص اس منصب پر نہیں مقرر ہوا جو اپنے زمانہ میں یکتای فن ویگانۂ دہر نہ سمجھا جاتا ہو۔ نظامیہ کے احاطہ میں ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جو خود نظام الملک کے عہد میں طیار ہوا تھا۔ علامہ ابوزکریا تبریزی جو ایک مشہور مصنف عالم تھے کتب خانہ کے منتظم تھے۔ (آثار البلاد قزوینی ذکر شہر تبریز)۔

۵۸۹ھ میں ناصر لدین اللہ خلیفۂ عباسی کے حکم سے ایک اور کتب خانہ اُسکے احاطہ میں تعمیر ہوا اور ہزاروں نایاب کتابیں شاہی کتب خانہ سے اُسکے لیے عنایت ہوئیں[۵۲]۔ نظامیہ کی مخصوص فیاضیوں میں یہ بات بھی شمار کی گئی ہے کہ اُسنے طلبا کے لیے وظیفے اور تنخواہیں مقرر کیں جسکا اس سے پہلے شاید کبھی رواج نہیں تھا[۵۳]۔ نظام الملک نے عام مدرسوں کے علاوہ نیشاپور۔ ہرات۔ موصل۔ اصفہان میں جو بڑے بڑے کالج قائم کئے تھے وہ بھی نظامیہ کہلاتے تھے۔ اور مدت تک نہایت مشہور فائق علما اُنکے پروفیسر مقرر ہوتے رہے مثلاً نظامیہ ہرات کے مدرس ابوسعد محمد بن یحیی شاگرد امام غزالی تھے۔ نظامیہ موصل میں ابوحامد محی الدین المتوفی ۵۴۴ھ نے درس دیا۔ ارجانی المتوفی ۵۴۴ھ نے نظامیہ اصفہان میں تحصیل کی۔

---

۵۱ نظامیہ کے یہ حالات کامل ابن الاثیر واقعات ۴۵۷ھ و ۴۵۹ھ و اعلام تاریخ مکہ مطبوعہ جرمن ۱۸۵۷ء صفحہ ۱۷۵۔ و تاریخ الخلفا سیوطی حالات ۴۵۹ھ و تاریخ ابن خلکان ترجمۂ ابواسحق شیرازی و ابونصر صباغ و گبن صاحب کی رومن امپائر حصہ مسلمانان آغاز دولت عباسیہ۔ و حسن المحاضرۃ علامہ طوسی ذکر مدارس مصر میں اجمالاً و تفصیلاً مل سکتی ہیں۔ ۱۲

۵۲ کامل ابن الاثیر واقعات ۵۸۹ھ۔ ۱۲ ۵۳ حسن المحاضرۃ بحوالہ طبقات سبکی۔ فصل امہات مدارس۔ ۱۲

لیکن نظامیہ بغداد گویا یونیورسٹی تھی اور یہ تمام کالج اُسکی شاخیں تھیں۔

نظام الملک نے جو صرف کثیر مدارس وغیرہ کے لیے شاہی خزانہ سے مقرر کیا تھا اُسپر ملک شاہ کو بھی خیال ہوا اور اُسنے نظام الملک کو بلاکر اپنے معمولی طریقہ کے موافق کہا کہ "پیارے باپ اسقدر زر کثیر سے تو ایک فوج مرتب ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں پر آپ یہ فیاضیاں کر رہے ہیں اُنسے ایسا بڑا کام کیا نکلسکتا ہے۔" نظام الملک نے کہا "جان پدر۔ میں تو بوڑھا ہوں لیکن تم جو ایک نوجوان ترک ہو۔ اگر بازار میں بیچنے کے لیے کھڑے کیے جاؤ تو اُمید نہیں کہ تیس دینار سے زیادہ تمہاری قیمت اُٹھے۔ اسپر خدا نے تمکو اتنا بڑا ملک عنایت کیا۔ اسکا اتنا شکر یہ بھی تم ادا نہیں کر سکتے تمہاری فوج کے تیر چند قدم پر کام دے سکتے ہیں۔ لیکن میں جو فوج طیار کر رہا ہوں اُسکی دعاؤں کے تیر آسمان کی سپر سے بھی نہیں رُک سکتے۔" ملک شاہ بیساختہ بول اُٹھا کہ "مرحبا۔ پیارے باپ ایسی فوجیں جسقدر ممکن ہوں اور طیار کرنی چاہئیں[۱]۔"

مسلمانوں کی علمی تاریخ میں یہ بات بھی نہایت عجیب اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب ماوراء النہر کے علما کو نظامیہ کے قائم ہونے کے تمام حالات سے اطلاع ہوئی تو سب نے ایک مجلس ماتم منعقد کی اور اس بات پر روئے کہ "اب علم، علم کے لیے نہیں بلکہ جاہ و ثروت حاصل کرنے کے لیے سیکھا جائیگا۔" اس روایت سے آیندہ ہمکو ایک رائے قائم کرنے میں مدد ملیگی۔ نظامیہ نے اپنے اثر سے ایک عجیب گرمجوشی تمام ملک میں پیدا کر دی۔ وہ پانچویں صدی میں قائم ہوا۔ اور چھٹی صدی تک اسلامی دنیا کا کوئی گوشہ (بجز اسپین کے) علمی عمارتوں سے خالی نہ رہا۔ خراسان کے بڑے بڑے صوبے مثلاً مرو۔ نیشاپور۔ ہرات۔ بلخ۔ اور ایران کے علاقے، گو پہلے سے علم و فضل کے مرکز تھے۔ مگر نظامیہ کے اثر نے اور بھی مالا مال کر دیا۔ یاقوت حموی قریباً چھٹی صدی میں جب مرو

[۱] اعلام تاریخ مکہ ذکر مدرسہ نظامیہ۔۱۲

پہنچا تو وہاں بہت سے مدرسے اور کتب خانے موجود پائے۔ جن مدرسوں کے متعلق بڑے بڑے کتب خانے تھے اُنکے یہ نام ہیں۔ مستوفیہ۔ شرف الملک ابو سعد محمد بن منصور المتوفی ۴۹۴ھ کا قائم کیا ہوا۔ عمیدیہ۔ خاتونیہ۔ اسمیں چند کتب خانے تھے۔ نظامیہ نظام الملک حسن بن اسحٰق کا قائم کیا ہوا۔

یاقوت حموی۔ معجم البلدان[1] جیسی عجیب او جامع کتاب انہی کتب خانوں کی مدد سے لکھ سکا[2]۔
خاص شہر نیشاپور کے کثرت مدارس کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ۵۵۶ھ میں جب اندرونی فسادات نے اُسکو غارت کیا تو عام عمارتوں کے ساتھ ۲۵ حنفیہ اور شافعیہ مدرسے بھی برباد ہوئے انکے علاوہ بارہ کتب خانے بھی جل گئے یا لوٹ لیے گئے۔ نیرو میں صرف علامہ حسین بن احمد ابو الفضل المتوفی ۵۹۱ھ کے اہتمام میں بارہ مدرسے تھے جسمیں بارہ سو طلبا تعلیم پاتے تھے[3]۔
خوارزم کا بڑا کالج امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ کی پروفیسری سے ممتاز تھا۔ مسٹر شارڈن سیّاح فرانس جنہوں نے دولت صفویہ کے زمانہ میں ایران کے اکثر مقامات کی سیر کی اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ "سلیمان صفوی کے عہد میں خاص شہر اصفہان میں اڑتالیس مدرسے موجود تھے" (مرآت البلدان ناصری۔ جلد اول صفحہ ۸۵ مطبوعہ ایران)

خود بغداد میں نظامیہ کے ہوتے تیس بڑے بڑے کالج موجود تھے جنکے بلند ایوانات اور وسعت عمارت کی نسبت علامہ ابن جبیر کا بیان ہے کہ ہر ایک بجائے خود ایک مستقل شہر

---

[1] یہ عربی زبان میں ایک جغرافیہ کی کتاب ہے جو کم و بیش چار ہزار صفحوں میں ہے اور اس جامعیت سے لکھی گئی ہے کہ عقل حیران ہوتی ہے۔ یورپ میں چھاپی گئی ہے۔ ۱۲

[2] دیکھو معجم البلدان حالات مرو۔

[3] حسن المحاضرۃ جلد اول صفحہ ۲۶۴۔ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ۔

معلوم ہوتا ہے۔[۵]" علامہ موصوف نے ۵۸۰ھ میں بغداد کو دیکھا تھا۔ بغداد کے بعض مدرسوں کا ہم ایک مختصر سا نقشہ فہرست کے طور پر درج کرتے ہیں۔

کیفیت	بانی	مدرسہ
غالباً ۴۸۲ھ میں تعمیر ہوا۔ امام ابوبکر شاشی مدرس اعظم مقرر ہوئے۔ (کامل ابن الاثیر واقعات ۴۸۲ھ)	تاج الملک مستوفی السلطان	مدرسۂ تاجیہ
یہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا مستوفی تھا ۴۹۴ھ میں وفات پائی۔ یہ مدرسہ باب الطاق کے پاس تھا (کامل واقعات ۴۹۴ھ)	شرف الملک ابو سعد محمد بن منصور	مدرسہ مستوفیہ
صاحب المخزن تھا۔ یہ مدرسہ ۵۳۵ھ میں طیار ہوا۔ رسم افتتاح میں بغداد کے تمام اعیان شریک تھے۔ (کامل واقعات ۵۳۵ھ)	کمال الدین ابو الفتوح	مدرسۂ کمالیہ
۵۴۴ھ میں خلیفہ المقتفی بامر اللہ کے دربار میں منصب وزارت پر ممتاز ہوا۔ (ابن خلکان حالات وزیر مذکور)	ابو المظفر عون الدین	مدرسۂ ابو المظفر
خلیفہ المقتفی کا مقرب تھا۔ یہ مدرسہ شافعیوں کے لیے خاص تھا دجلہ کے کنارہ پر اسکی عمارت تھی ثقۃ الدولہ نے ۵۴۹ھ میں وفات کی (ابن خلکان ترجمہ شہدہ فخر النساء)۔	علی بن محمد معروف بہ ثقۃ الدولہ	مدرسۂ ثقۃ الدولہ
نظامیہ کے متصل ہے۔ ابو منصور محمد ہروی جنکی عظمت و شان انکے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتی ہے۔ قریباً ۵۶۷ھ میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ مدرسۂ نظامیہ میں بھی وعظ کہا کرتے تھے۔		مدرسہ بہائیہ

[۵] سفرنامہ علامہ ابن جبیر حالات بغداد جرمن میں بمقام لندن ۱۸۵۲ء چھاپا گیا ہے۔ ۱۲

مدرسہ	بانی	کیفیت
		نظامیہ کی پروفیسری کے لیے بھی اُمیدوار کیے گئے تھے۔ (ابن خلکان۔ حالات ابو منصور مذکور)
مدرسہ فخریہ	فخر الدولہ	انکا باپ وزیر تھا۔ فخر الدولہ نے ۴۸۳ھ میں وفات پائی۔ (کامل ابن الاثیر واقعات ۴۸۳ھ)
مدرسہ والدہ ناصر لدین اللہ	خلیفہ ناصر لدین اللہ کی والدہ	
مستنصریہ	خلیفہ المستنصر باللہ	اس مدرسہ کا کسیقدر تفصیلی حال ہم لکھتے ہیں۔ ان مدرسوں کے علاوہ بغداد میں **مشہد ابی حنیفہ۔ وقیصہ۔ زیرکیہ۔ معینیہ۔ عنابیہ۔ مدرسہ قدیمہ۔ عبابیسہ۔** شہرت عام رکھتے تھے۔ طبقات الحنفیہ وغیرہ میں اُنکے مدرسین وغیرہ کے حالات مل سکتے ہیں۔ بغداد کے اکثر مدرسے بغداد کے تباہ ہونے کے بعد بھی قائم رہے۔"

دولت عباسیہ کی تاریخ میں یہ بات بڑے الزام کے قابل تھی کہ ان تمام علمی عمارتوں میں سے ایک بھی کسی عباسی خلیفہ کے نام سے نہ تھی۔ اور دار الخلافہ بغداد اس خاص حیثیت سے بالکل دوسری نسلوں کا ممنون تھا۔ خلیفہ المستنصر باللہ نے جو رجب ۶۲۳ھ میں تخت نشین ہوا اس الزام کو اُٹھانا چاہا۔ اتنی مدت کی غلطی کا کفارہ بھی اُسی مقدار سے ہونا چاہیئے تھا۔ اور الفضل یہ ہے کہ ایسا ہی ہوا۔ باتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ جس عظمت وشان کا یہ مدرسہ بنا اُسکی نظیر سے گذشتہ اور موجودہ دونوں زمانے خالی ہیں۔ ۶۲۵ھ میں دجلہ کے کنارے اُسکی بنیاد کا

مبارک پتھر رکھا گیا۔ اور چھ برس کی مدت میں سلسلۂ عمارت پورا طیار ہوا۔ عمارت کا ایک حصہ
جسمیں وہ حجلہ ہیں تھا (مستنصریہ کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ ناصر الدین بادشاہ حال ایران نے
سفرنامۂ ایشیا میں اُسکی گذشتہ شوکت یاد دلانے والی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ذکر کیا ہے) اسی
سنہ میں ماہ رجب جمعرات کے دن اُسکی رسم افتتاح بڑی شوکت و شان سے ادا ہوئی جسمیں
بغداد کے تمام اعیان و افسران فوج و علما و مدرسین و قضاۃ و اہل منصب شریک تھے۔
مستنصر نے تمام اعیان و امرا کو خلعتیں عنایت کیں۔ اور موید الدین علقمی کی جسکے اہتمام
میں عمارت طیار ہوئی تھی جاگیر مضاعف کر دی۔ مذاہب اربعہ کے فقہا۔ اور شیخ الحدیث
شیخ النحو۔ شیخ الفرائض۔ شیخ الطب۔ درس کے لیے مقرر ہوئے۔ ایک سو ساٹھ اونٹ پر لاد کر
عمدہ عمدہ کتابیں کتب خانہ شاہی سے اُسکے استعمال کے لیے آئیں۔ مدرسہ ہی کے احاطہ
میں ایک ہسپتال اور مزملہ بھی تھا (جس سے گرمیوں میں پانی ٹھنڈا کرتے ہیں)۔ دو سو
اڑتالیس مستعد طلبا مدرسہ کھلنے کے ساتھ بورڈنگ میں داخل ہوئے جنکو۔ مکان و فرش۔
خوراک۔ روغن۔ کاغذ قلم وغیرہ مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا۔ اُنکے دسترخوان پر معمولی کھانے
کے علاوہ شیرینی اور میوے بھی چنے جاتے تھے۔ ان سب کے علاوہ ایک اشرفی ماہوار الگ
وظیفہ کے طور پر مقرر تھی۔ سیکڑوں دیہات اور مواضع مدرسہ کے سالانہ مصارف کے لیے
وقف تھے جنکی مجموعی آمدنی ستر ہزار مثقال سونا یعنی آج کل کے حساب سے قریباً ساڑھے چار
لاکھ سالانہ تھی[1]۔ (علامہ ذہبی نے تاریخ دول الاسلام میں ان مواضع کی پوری فہرست دی ہے)

[1] دیکھو تاریخ الخلفا سیوطی۔ حالات مستنصر باللہ و اعلام تاریخ مکہ صفحہ ۱۷۴۔ مرآت البلدان ناصری مطبوعہ ایران جلد اول صفحہ ۲۴۴۔ و دول الاسلام علامہ ذہبی و جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ ترجمہ عمر بن محمد بن الحسین بن ابی عمر بن محمد ابو حفص فرغانی مدرس اول مستنصریہ۔ جواہر مضیہ میں مدرسین شافعیہ و مالکیہ و حنبلیہ کے بھی نام لکھے ہیں۔ ۱۲

حنفیوں کے مدرس اعظم شیخ عمر ملقب برشید الدین فرغانی تھے۔ جو۔ فقہ۔ اُصول۔ حکمت۔ کلام۔ میں بڑے ماہر گنے جاتے تھے۔ پہلے سنجار کے مدرسہ میں مدرس تھے پھر مستنصر باللہ نے فرمان بھیجکر بلالیا تھا[151]۔ مدرسہ کے دروازہ پر ایک ایوان تھا جسمیں ایک نہایت عجیب اور بیش قیمت گھڑی رکھی تھی[152]۔ جسکو علی بن تغلب بن ابی الضیا بعلبکی ایک مشہور ہیئت داں و منجم نے طیار کیا تھا[153] جو بعد کو الساعتی یعنی گھڑی ساز کے نام سے مشہور ہوا۔ عبدالرزاق ابن الغوطی جو محقق طوسی کا شاگرد رشید تھا اور دس برس تک مراغہ کی رصدگاہ میں محقق صاحب کے ساتھ خزانہ الرصد کا مہتمم رہ چکا تھا۔ واقعۂ تتار کے بعد کتب خانہ کا افسر مقرر ہوا۔ جہاں رہ کر اُسنے تاریخ کی ایک کتاب ۵۰ جلدوں میں لکھی[154]۔

چھٹی صدی میں جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں ممالک اسلامیہ کا کوئی حصہ علمی یادگاروں

---

[151] آثار البلاد قزوینی ذکر فرغانہ۔۱۲

[152] شاید یہ دوسری گھڑی ہے جو دولت عباسیہ کے عہد میں تیار ہوئی اس سے بہت پہلے ہرون الرشید نے جو گھڑی شاہ فرانس کو بھیجی تھی۔ یورپ میں وہ تعجب کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ فرانس کے مورخوں کا بیان ہے کہ ہمارے ملک میں پہلے وہ گھڑی ظاہر ہوئی جو ہرون الرشید نے ۸۰۰ء میں شارلمین بادشاہ فرانس کو تحفہ کے طور پر بھیجی تھی۔ یہ گھڑی ایسی عجیب و غریب تھی کہ تمام دربار فرانس حیرت میں رہ گیا۔ اس گھڑی میں بارہ دروازے تھے جب گھنٹہ پورا ہوتا تھا تو ایک دروازہ خود بخود کھلجاتا تھا اور ایک مونگری جو تانبے کی بنی ہوئی تھی جرس پر پڑتی تھی۔ یہ دروازے کھلے رہتے تھے اور جب ایک دورہ پورا ہوجاتا تھا تو دروازوں سے بارہ سوار نکلتے تھے اور گھڑی کی پیشانی پر چکر لگاتے تھے" (دیکھو کشف القناع عن فنون اوربا مطبوعہ جوائب ۱۲۹۹ھ صفحہ ۲۱۸ و ۲۱۹) ایک انگریزی تصنیف میں بھی قریب قریب یہی تفصیل مذکور ہے۔۱۲

[153] دیکھو جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ ترجمہ احمد بن علی بن تغلب بن ابی الضیا المذکور۔ کسی قدر اس گھڑی کے حالات آثار البلاد علامہ قزوینی میں بذیل عجائبات بغداد ملینگے۔ [154] دیکھو تتمہ ابن خلکان تذکرہ ابن الغوطی۔۱۲

خالی رہا۔ عرب اور مصر بھی جہاں اب تک اس قسم کی ایک عمارت بھی موجود نہ تھی۔ اس صدی میں
کالج اور اسکولوں سے معمور ہوگئے۔ مصر میں خلیفہ عبیدی حاکم بامر اللہ نے سنہ ۳۹۵ھ میں جو دار العلم
قائم کیا تھا۔ سنہ ۴۰۳ھ میں خود اسکو برباد کردیا اور اُسوقت سے پھر کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی
چھٹی صدی میں دو خاندان نوریہ۔ وصلاحیہ اسلامی عظمت وشوکت کے اصلی مرکز تھے۔ نورالدین
محمود زنگی المتوفی سنہ ۵۶۹ھ جو شوال سنہ ۵۴۱ھ میں تخت نشین ہوا۔ دولت نوریہ کا بانی اور مصر و
شام کا مستقل فرمانروا تھا اُسنے قریباً پچاس شہر اور قلعے یورپ کے پنجۂ غصب سے واپس لیئے تھے
صلاح الدین متوفی سنہ ۵۸۹ھ نے نورالدین ہی کے دامن فیض میں تربیت پائی تھی لیکن کروسیڈ
کی لڑائیوں اور خصوصاً بیت المقدس کی فتح نے اُسکو اپنے آقا سے بھی زیادہ شہرت اور
عزت دی۔ یہ دونوں خاندان صرف اسی بات میں نام آور نہ تھے کہ انھوں نے مسلمانوں کی
بھولی ہوئی عظمت ایکبار اور یورپ کو یاد دلادی۔ بلکہ اس بات میں بھی کہ اُنکی وجہ سے ممالک
مصر وشام میں علم کا آوازہ نہایت بلند ہوگیا۔

نورالدین نے حلب۔ حماۃ۔ حمص۔ بعلبک۔ منبج۔ رحبہ میں بڑے بڑے مدرسے قائم کیے۔
خاص دمشق میں جو اُسکا پایۂ تخت تھا ایک ایسا عظیم الشان مدرسہ بنایا کہ مدت تک بے نظیر
خیال کیا جاتا تھا۔ یہ فخر بھی خاص نورالدین کی قسمت میں تھا کہ تمام دنیا میں جو پہلا دار الحدیث
قائم ہوا اُسکے نام سے ہوا ورنہ اس سے پہلے خاص علم حدیث کے درس کے لیے کوئی مدرسہ
نہیں تعمیر ہوا تھا[1]۔ علامہ ابن جبیر نے سنہ ۵۸۰ھ میں جب دمشق کو دیکھا تو خاص شہر میں ۲۰ کالج
تھے۔ عام حکم تھا کہ جو شخص کوئی مدرسہ قائم کرے اُسکو تمام مصارف خزانہ شاہی سے ملیں گے۔
مغربی طلبا کے لیے خاصۃً سات باغ اور کچھ زمین وقف تھی جسکی سالانہ آمدنی پانسو اشرفیاں تھیں

---

[1] ابن خلکان ترجمہ نورالدین وحسن المحاضرۃ ذکر مدرسہ کاملیہ ۱۲

جو اللہ کے قرآن ختم نہیں کر سکتے تھے انکو صرف سورہ کوثر سے اخیر تک پڑھایا جاتا تھا۔ انہیں سی پانسو لڑکوں کا وظیفہ خزانہ شاہی سے مقرر تھا۔[1] نورالدین نے خاص اپنے ذاتی مال سے مدارس اور مکاتیب وغیرہ پر جو جاگیریں وقف کی تھیں اور جو اسکی وفات کے بعد بھی سیکڑوں برس تک قائم رہیں انکی آمدنی نو ہزار صوریہ اشرفیاں تھیں۔[2]

اسی طرح سلطان صلاح الدین نے اسکندریہ۔ قاہرہ۔ بیت المقدس۔ دمشق وغیرہ میں مدرسے قائم کیے اور بے انتہا آمدنی اُنپر وقف کی۔[3] علامہ ابن جبیر لکھتے ہیں کہ اسکندریہ کے بورڈنگ میں اذن عام تھا کہ جو شخص کہیں سے لطلب علم آئے اُسکو مکان۔ خوراک۔ حمام۔ ہسپتال۔ سب کچھ مہیا ملیگا۔"[4] صلاح الدین کے عہد میں علما کی جو تنخواہیں مقرر تھیں انکی تعداد **تین لاکھ دینار** سالانہ تھی۔ جسکے آج کل کے حساب سے کم از کم پندرہ لاکھ روپیے ہوتے ہیں (روضتین فی اخبار الدولتین جلد ثانی صفحہ ۱۴۸۔ مطبوعہ مصر)۔

صلاح الدین کے عہد میں علما کی تنخواہیں"

صلاح الدین کا تمام خاندان اس قسم کی فیاضیوں میں نامور تھا۔ عموماً امراء اور اعیان دولت بلکہ خواتین میں بھی یہ جوش پھیل گیا تھا۔ اور یہ بات نہایت ذلت کی سمجھی جاتی تھی کہ کوئی دولتمند شخص مرے اور دنیا میں علمی یادگار نہ چھوڑ جائے

سلطان صلاح الدین کا نامور فرزند الملک الظاہر ابوالفتح غازی جس زمانہ میں حلب کا فرمانروا تھا قاضی ابوالمحاسن بہاء الدین شافعی جو مدرسہ نظامیہ میں نائب رہ چکے تھے اور

[1] یہ تمام حالات سفرنامہ علامہ ابن جبیر دمشق کے ذکر میں ملینگے۔

[2] روضتین فی اخبار الدولتین مطبوعہ مصر ۱۲۸۸ھ جلد اول صفحہ ۱۰۔ روضتین کے مصنف نے ایک عہدہ دار سے جو ان جاگیروں سے تعلق رکھتا تھا ۶۰۰ھ میں یہ تعداد تحقیق کی تھی۔

[3] ابن خلکان ترجمۂ صلاح الدین۔ [4] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۴۲۔

نہایت مشہور فاضل تھے سنہ ۵۹۱ھ میں اُنکی خدمت میں باریاب ہوئے۔ حلب میں اگرچہ اُسوقت بھی چند مدرسے موجود تھے[۵۱] لیکن قاضی صاحب نے اُنکو کافی نہیں سمجھا اور الملک الظاہر سے کہکر بہت سی جاگیریں خاص ان مصارف کے لیے مقرر کرائیں۔ خود بھی دو مدرسے۔ شافعیہ و دار الحدیث قائم کیئے۔ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اُسوقت سے حلب کی علمی شہرت نہایت عام ہوگئی۔ اور دور دراز ملکوں سے اہل علم نے وہاں آنا شروع کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں حلب بھی دمشق و مصر کی طرح علوم و فنون کا مرکز بنگیا۔[۵۲]

اس زمانہ میں مصر۔ قاہرہ۔ دمشق۔ حلب۔ اربل کے تمام علاقوں میں جو بے انتہا مدارس قائم ہوگئے اُنکو کون شمار کرسکتا ہے۔ اگر کوئی شخص چاہے تو جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ و حسن المحاضرہ فی تاریخ مصر و قاہرہ۔ و فوات الوفیات و ابن خلکان وغیرہ سے ایک بڑی فہرست طیار کرسکتا ہے۔ لیکن ہم اس موقع پر صرف اُن بڑے بڑے مدرسوں کا ایک نقشہ دیتے ہیں جو خاصتہً صلاحیہ و نوریہ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض مدرسین کے نام بھی ہم لکھیں گے جس سے معلوم ہوگا کہ جو علما اس زمانہ میں علم و فضل کے نامی تھے اکثر انہی مدرسوں کے منصب درس پر ممتاز تھے۔

---

[۵۱] ۵۸۰ھ میں جب علامہ ابن جبیر نے حلب کو دیکھا تو وہاں چند مدرسے موجود تھے جنمیں سے ایک مدرسہ نہایت عالیشان اور عمارت کی خوبی میں وہاں کی مشہور جامع مسجد کا ہمسر تھا اُسکے بورڈنگ اور عام مکانات پر انگور کی بیلیں چڑھا دی تھیں اور طالب علم اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے انگور کہا سکتے تھے۔ (سفرنامہ ابن جبیر ذکر حلب) ۱۲ –

[۵۲] ابن خلکان ترجمۂ قاضی صاحب موصوف ۱۲ –

دولت صلاحیہ

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
شافعیہ (یا) صلاحیہ	صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ	مصر	علامہ نجم الدین خبوشانی بشاہرہ ۴۰ دینار، مدرس اعظم اور مہتمم مقرر ہوئے اور دس مدرس اُنکے ماتحت تھے تقی الدین۔ دقیق العید۔ سراج بلقینی۔ حافظ ابن حجر۔ بہاء الدین قاضی القضاۃ وغیرہ وقتاً فوقتاً اسمیں مدرس مقرر ہوئے۔ نہایت کثیر آمدنی اُسپر وقف تھی، علامہ ابن جبیر لکھتے ہیں کہ اُسکی سلسلۂ عمارت پر ایک مستقل آبادی کا گمان ہوتا ہے۔
شافعیہ	"	"	شاید مصر میں صلاح الدین نے پہلا مدرسہ ۵۶۶ھ میں یہی قایم کیا (روضتین۔ جلد اول۔ صفحہ ۱۹۱)۔
مالکیہ (یا) قمحیہ	"	"	محرم ۵۶۶ھ میں قائم ہوا۔ قریباً ۸۴ھ میں علامہ ابن خلدون نے بھی اسمیں درس دیا۔ (تاریخ ابن خلدون حالات مصنف و العبر فی اخبار الدولتین)۔
زین التجار (یا) شریفیہ	"	"	عماد الدین عباسی۔ سراج الدین بلقینی (اُستاد جلال الدین سیوطی) تقی الدین قاضی القضاۃ وغیرہم اُسمیں درس دیتے تھے۔
مشہد	"	قاہرہ	یہ مدرسہ صلاح الدین کے نام سے مشہور نہیں ہے (ابن خلکان حالات صلاح الدین)۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
سوفیہ	صلاح الدین	قاہرہ	حنفیوں کے لیے خاص تہا۔
صلاحیہ	"	بیت المقدس	اسکے مدرسین کی تنخواہیں بیش قرار تھیں۔ (ابن الجلیل تاریخ بیت المقدس)
صلاحیہ	"	دمشق	
افضلیۃ	الملک الافضل بن صلاح الدین	بیت المقدس	مالکیہ کے لیے خاص تہا۔
ظاہریۃ	الملک الظاہر بن صلاح الدین	حلب	ابو الحسن سیاح مدرس اعظم تھے۔
عزیزیہ	الملک العزیز بن صلاح الدین	دمشق	نہایت مشہور اور عظیم الشان مدرسہ تہا۔ علامہ سیف الدین آمدی المتوفی ۶۳۱ھ مدرس اعظم تھے۔
اسدیہ	اسد الدین شیرکوہ عم صلاح الدین		علامہ ابن الصلاح کے والد مدرس اعظم تھے۔
ستیہ (یا) زمردیہ	زمرد ہمشیرہ صلاح الدین	دمشق	زمرد اور اُسکے شوہر اور بہائی کی قبریں اسی مدرسہ میں ہیں۔
منازل العز (یا) تقویہ	الملک المظفر تقی الدین المتوفی ۵۸۷ھ برادرزادہ صلاح الدین	مصر	جزیرۃ روضتہ۔ کاکل خراج۔ وحمام الذہب کی آمدنی اس پر وقف تھی۔ (روضتین جلد اول صفحہ ۱۹۱) شافعیوں کے لیے خاص تہا۔ ۵۶۶ھ میں قائم ہوا تہا۔
مالکیہ	"	"	مالکیوں کے لیے خاص تہا۔

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
تقویہ	مذکورۂ صدر	رہا	
عذراویۃ	عذرا، صلاح الدین کی بھتیجی تھی۔	دمشق	
دارالحدیث	الملک الاشرف برادرزادہ صلاح الدین	"	علامہ ابن الصلاح المتوفی سنہ ۶۴۳ھ مدرس اعظم تھے۔ علامہ ابن خلکان نے ایک برس تک انکی خدمت میں تحصیل علم کی۔
معظمیہ	الملک المعظم برادر زادہ صلاح الدین	"	الملک المعظم اور انکے اکثر عزیز اسی مدرسہ میں مدفون ہیں۔ ملک المعظم تصنیف اور فن ادب و فقہ میں نامور تھا۔ اُسنے عام حکم دیا تھا کہ جسکو زمخشری کی مفصل زبانی یاد ہو سو اشرفیاں اُسکو انعام دیجاویں۔ اس تقریب سے اکثروں نے یہ مفید کتاب حفظ کرلی تھی۔
"	"	بیت المقدس	اس مدرسہ پر بہت سی دکانات و مواضع وقف تھے سنہ ۶۱۰ھ میں قائم ہوا۔
دارالحدیث الکاملیۃ	الملک الکامل برادرزادہ صلاح الدین المتوفی سنہ ۶۳۵ھ	قاہرہ	یہ دوسرا دارالحدیث ہے جو ممالک اسلامی میں دارالحدیث نوریہ کے بعد قائم ہوا۔ حافظ ابن دحیہ۔ زکی الدین منذری قطب قسطلانی۔ ابن دقیق العید۔ ابن سید الناس۔ حافظ زین الدین عراقی استاد حافظ ابن حجر۔ وقتاً فوقتاً اسکے مدرس مقرر ہوئے۔ یہ سب علما اپنے زمانہ میں بے مثل

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
صالحیہ	الملک الصالح نجم الدین ایوب بن الملک الکامل	قاہرہ	یہ مدرسہ چار مدرسوں پر مشتمل تھا۔ مقریزی کا بیان ہے کہ وہ قاہرہ کے نامور اور عظیم الشان مدرسوں میں گنا جاتا ہے جب وہ کھولا گیا تو شعراء نے قصائد و قطعے لکھے۔ حسن المحاضرہ میں چند اشعار نقل بھی کیے ہیں ۶۳۹ھ میں قائم ہوا۔
معینیہ	معین الدین خسر سلطان صلاح الدین	دمشق	
شبلیہ	شبل الدولہ	"	نہایت مشہور مدرسہ ہے شبل الدولہ۔ زمرد خاتون (ہمشیرہ صلاح الدین) کا غلام تھا۔
عزیہ	عز الدین ایبک	"	عز الدین۔ الملک المعظم کا غلام اور صرخد کا حاکم تھا۔ یہ مدرسہ میدان اخضر میں واقع ہے
شہابیہ	شہاب الدین طغرل	حلب	الملک العزیز اسی مدرسہ میں مدفون ہے۔
مجیریہ	مجیر الدین	قاہرہ	مجیر الدین مشہور عالم اور سلطان صلاح الدین کا وزیر تھا۔ یہ مدرسہ درب ملوخیہ کے پاس ہے۔ محرم ۵۸۰ھ میں قائم ہوا۔
بہائیہ	ابو المحاسن یوسف بہاء الدین	حلب	علامہ ابن خلکان اسی مدرسہ کے بورڈنگ میں مدت تک رہے ہیں اور علوم کی تحصیل کی ہے۔
دار الحدیث	"	"	
فاضلیہ	قاضی فاضل المتوفی ۵۹۶ھ	قاہرہ	قاہرہ کا مشہور مدرسہ ہے۔ قاضی فاضل سلطان صلاح الدین کے

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
			دربار کا منشی اور نہایت نامور شخص تھا۔
فلکیہ	فلک الدین اور الملک العادل		
خاندان نوریہ			
نوریہ حنفیہ	نور الدین محمود زنگی المتوفی ۵۶۹ھ	دمشق	نور الدین کی تربت اسی مدرسہ میں ہے۔ عرقلہ ایک شاعر نے اسی مدرسہ کی شان میں لکھا ہے۔ دمشق فی المداین بیت ملک ۔ وہذی فی المدارس بیت ملک (روضتین)
دار الحدیث نوریہ	″	″	ممالک اسلامی میں حدیث کے درس کے لیے پہلا مدرسہ یہی تعمیر ہوا۔
نوریہ شافعیہ	″	″	یہ مدرسہ خاص شافعیوں کے لیے بڑی عظمت و شان سے تعمیر ہونا شروع ہوا مگر طیار ہونے سے پہلے نور الدین نے وفات کی۔ پھر الملک العادل برادر صلاح الدین کے اہتمام سے اتمام کو پہنچا۔ حافظ ابو شامہ لکھتے ہیں کہ تمام مدارس میں اسکا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ حافظ مذکور نے کتاب الروضتین اسی مدرسہ میں رہکر لکھی ہے۔
نوریہ	″	حلب	قطب الدین شافعی جو مدرسہ نظامیہ بغداد میں نائب مدرس رہ چکے تھے اس مدرسہ کے مدرس اعظم مقرر ہوئے۔ (ابن خلکان۔ ترجمہ قطب الدین)۔
عمادیہ	″	″	نور الدین نے ۵۶۷ھ میں عماد کاتب کو اسکا مہتمم اور

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
			افسر مقرر کیا۔ اسوجہ سے یہ مدرسہ اُنہی کے نام سے مشہور ہوگیا سنہ ۵۶۹ھ میں نورالدین نے عماد کاتب کی پاس مدرسہ کے دروازہ پر مینا کاری اور سنہرے کام بنوانے کے لیے یاقوت جواہرات اور سونا بھجوایا۔ (روضتین)
عزیّۃ	عزالدین نبیرہ نورالدین المتوفی سنہ ۵۸۹ھ	موصل	یہ مدرسہ ایوان شاہی کے مقابل واقع ہے۔ شافعیہ وحنفیہ دونوں فرقوں کے لیے تھا۔ عمدہ اور مشہور مدرسہ ہے عزالدین کی قبر بھی اسی کے احاطہ میں ہے۔ (ابن خلکان وروضتین)۔
سیفیہ عتیقیۃ	سیف الدین غازی برادر نورالدین المتوفی سنہ ۵۴۴ھ	؍؍	عالیشان اور مشہور مدرسہ ہے سیف الدین اسی کی احاطہ میں مدفون تھے۔ حنفیہ وشافعیہ کے لیے تھا۔
ارسلانیۃ	ارسلان نورالدین شاہ ابن عزالدین مذکور		علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ حسن وخوبی میں یہ مدرسہ لاجواب کہا جاسکتا ہے۔
مدرسہ الملک القاہر	الملک القاہر ابن نورالدین ارسلان شاہ المتوفی سنہ ۶۱۵ھ		
مدرسہ ابوسعد	ابوسعد شرف الدین المتوفی سنہ ۵۸۵ھ	دمشق	نورالدین نے مساجد کی اوقاف کا انتظام انکے متعلق کیا تھا۔ اور اُنکے ایما سے بہت سے مدرسے بنوائے۔"

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
قایمازیہ	ابومنصور قائماز	موصل	ابومنصور سیف الدین غازی کی طرف سے موصل کا حاکم تھا۔ علامہ ابن اثیر مصنف شل السائر اسی کے دربار میں منشی تھے ۵۷۵ھ میں قائم ہوا۔
,,	,,	اربل	اس مدرسہ پر بہت سے مواضع وقف تھے۔
زینبیہ	زین الدین علی المتوفی ۵۶۳ھ	,,	ابومنصور قائماز انہی کا آزاد کردہ غلام تھا۔ زین الدین نے موصل اور بغداد میں بھی مدرسے بنوائے تھے۔ (روضتین)
مجاہدیہ	امیر مجاہد الدین المتوفی ۵۵۵ھ	دمشق	مجاہد الدین امراے نور الدین میں ایک نامور شخص تھا۔ یہ مدرسہ باب الفرادیس کے پاس ہے۔ (روضتین)
,,	,,	,,	یہ مدرسہ نور الدین کے مدرسہ کے پہلو میں ہے۔ (روضتین)

ان مدرسوں کے علاوہ اس زمانہ میں اور بہت سے نامور مدرسے شام و مصر میں موجود تھے۔ جنکا تذکرہ اکثر طبقات اور تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ دمشق میں رواحیہ۔ صادریہ۔ ریحانیہ۔ امینیہ حلب میں۔ حلاویہ۔ قلیجیہ۔ طرخانیہ۔ اربل میں۔ مظفریہ۔ مدرستہ القلعۃ۔ ایسے مشہور مدرسے تھے جنکی شہرت عام کی وجہ سے مورخین اُنکے تذکرہ میں صرف نام پر اکتفا کر جاتے ہیں۔

یہ مختصر فہرست جو ہم نے نمونہ کے طور پر پیش کی ہے۔ ابن خلکان۔ حسن المحاضرۃ علامہ سیوطی۔ روضتین فی اخبار الدولتین۔ جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ۔ والانس الجلیل فی تاریخ القدس والخلیل۔ وذیل ابن خلکان۔ سے ماخوذ ہے۔ لیکن یہ حالات ایسے متفرق موقعوں پر مذکور ہیں کہ خاص خاص حوالے نہیں دیئے جا سکتے تھے۔

خاندان صلاحیہ کا سلسلہ ۶۵۲ھ میں منقطع ہوگیا اور ۹۲۳ھ تک مصر و عرب کی قسمت

اتراک و چراکسہ کے ہات میں رہی۔ اتراک سے ۷۸۴ھ تک حکومت کی پھر چراکسہ قابض ہوئے۔ یہ دونوں خاندان زرخرید غلام تھے جو ترقی کر کے منصب حکومت تک پہنچے تھے۔ ان خاندانوں میں بھی حکومت خاندان کے سلسلہ سے نہیں چلتی تھی۔ ترک اور چرکس غلام جو فوج میں بھرتی ہونے کیلیے ہمیشہ خریدے جاتے تھے انہیں سے اقبال نے جسکا ساتھ دیا تخت نشین ہوگیا انہیں سے بعضے بڑے جاہ و اقتدار کے حکمراں ہوئے اور علم و فن کی نہایت قدردانی کی۔

اس عہد میں مدرسوں کو اور بھی ترقی ہوئی جسکے چند اسباب تھے۔ مدارس کے تمام اخراجات اوقاف میں داخل ہوچکے تھے۔ اور اگر کوئی جانشین حکومت انکو واپس لینا چاہتا تو گروہ علما جنکا ملک پر بہت اثر تھا عموماً مخالف ہوجاتا جیسا کہ ایک بار ۸۰۰ھ میں واقع ہوا۔ یہ ترکی غلام جنکو کل تک لوگ بازاروں بکتے ہوئے دیکھ چکے تھے اگر خود بھی اس قسم کی فیاضیاں نہ دکھاتے اور اہل علم انکا ساتھ نہ دیتے تو انکو تخت حکومت پر بیٹھنا نصیب نہیں ہوسکتا تھا۔

خاصکر حرمین میں اس خاندان نے جو علمی فیاضیاں کیں انکی نظیر پچھلے زمانوں میں نہیں مل سکتی اس عہد سے پہلے مکہ معظمہ میں بہت کم مدرسے تھے ۵۷۹ھ میں امیر فخرالدین زنجیلی نے مکہ معظمہ میں ایک مدرسہ بنوایا ۵۸۰ھ میں خلیفہ المستضی باللہ کی کنیز خاص طاب الزمان نے ایک مدرسہ قائم کیا جسمیں دس فقہائے شافعی مدرس تھے ۶۴۱ھ میں ایک اور مدرسہ تعمیر ہوا جسکا بانی الملک المنصور عمر بن علی والی یمن تھا۔ مصر کے ترک بادشاہوں سے پہلے حرمین میں جو قابل اعتداد مدرسے موجود تھے غالباً یہی دو تین تھے لیکن ان ترکوں کے عہد سے مکہ معظمہ بھی دوسرے شہروں کی طرح ایک بڑا دارالعلم بنگیا۔

عبدالباسط نے جو سلطان ظاہر ططر کی فوج میں ناظر تھا مکہ معظمہ میں تین عمدہ مدرسے بنوائے۔ قاہرہ۔ غزہ۔ شام۔ میں بھی اُسنے بہت سے مدرسے قائم کیے تھے۔ ملک اشرف قایتبائی

نے جو خاندان چراکسہ میں سے تھا اور ۸۷۲ھ میں تخت نشین ہوا۔ مکہ معظمہ میں چاروں مذہب کے
لیے نہایت عظیم الشان مدرسہ بنوایا جسمیں بہتر۷۲ کمرے تھے اور بیچ میں جو نہایت وسیع کمرہ تھا اُسکی
چھت سنگ مرمر کی تھی اور سونے کا کام کیا ہوا تھا۔ قایتبائی جب مکہ معظمہ گیا تو فوج و حشم کے
ساتھ اسی مدرسہ میں ٹھیرا اور طلبا۔ فراش۔ بواب۔ اہل مطبخ۔ مینیجر۔ خزانچی۔ وغیرہ کی تنخواہیں مقرر
کیں۔ قایتبائی نے مدینہ منورہ میں بھی ایک عالیشان مدرسہ بنوایا۔ ابن الناصر محمد بن قلاؤن نے
مصر میں جو مدرسہ قائم کیا وہ رفعت و شان کے اعتبار سے تمام دنیا میں بے نظیر سمجھا گیا ہے۔
۷۵۷ھ میں اسکی تعمیر شروع ہوئی اور تین برس متصل ہر روز اُسکی تعمیر میں بیس ہزار درہم صرف ہوئے
جسکی کل تعداد آج کل کے حساب سے کم و بیش چوبن لاکھ روپئے ہوتی ہے اُسکا بڑا کمرہ جسکو پرنسپل
ہال کہنا چاہیئے ۶۵ گز در گز تھا۔ خود سلطان ابن الناصر بھی زمانہ تعمیر میں کثرت مصارف سے عاجز
آگیا تھا مگر یہ خیال ہمیشہ غیرت دلاتا رہا کہ مصر کا وسیع ملک کیا ایک مدرسہ کے صرف سے بھی عہدہ برآ
نہیں ہوسکتا؟ چاروں مذہب کے فقیہ درس کے لیے مقرر تھے۔ ابن الناصر نے یہ بھی ارادہ کیا تھا
کہ چار بڑے بڑے منارے تعمیر کیے جائیں۔ تین بن بھی چکے تھے مگر جب ۷۶۲ھ میں اتفاقاً ایک
منارہ کے گرنے سے تین سو یتیم بچے جو مکتب السبیل میں پڑھ رہے تھے دبکر مر گئے تو یہ ارادہ ترک
کردیا گیا[1]۔

اس عہد میں یہ واقعہ بھی ایک عجیب یادگار ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں میں سے
بھی ایک بلند حوصلہ بادشاہ یعنی سلطان غیاث الدین نے مکہ معظمہ میں مدرسہ قائم کرنے کے
لیے شریف مکہ کے پاس زر خطیر روانہ کیا۔ ہندوستان کا یہ پہلا بادشاہ ہے جسکے نام سے ایک
مدرسہ منسوب کیا گیا ہے ورنہ جیسا کہ ہم آگے چلکر لکھیں گے اس سرزمین میں اس قسم کا خیال کبھی

[1] یہ پوری تفصیل حسن المحاضرۃ مدرسہ سلطان حسن کے ذکر میں ہے ۱۲۔

نہیں پیدا ہوا۔ رمضان سنہ ۸۱۳ھ میں اُسکی تعمیر شروع ہوئی اور صفر سنہ ۸۱۴ھ میں اتمام کو پہنچی۔ زمین بارہ ہزار مثقال کو خریدی گئی اور مدرسہ کے متعلق بہت سے ایوانات اور مکان طیار ہوئے ۱۷۔ محرم سنہ ۸۱۴ھ میں بڑی شوکت وشان سے کھولا گیا۔ ساٹھ طالب العلم اُسیوقت مدرسہ میں داخل ہوئے اور سب کے لیے وظیفہ مقرر ہوا۔ چاروں مذہب کے مدرس مقرر تھے اور ہر ایک کے درس کا الگ الگ وقت مقرر تھا۔ غیاث الدین نے اسکے سوا چار مدرسے اور وہاں قائم کئے۔[۵۱]

نمونہ کے طور پر ہم اتراک وجراکسہ کے عہد کے چند مدرسوں کا ذکر کرتے ہیں۔ جو خاص اسکندریہ وقاہرہ میں موجود تھے۔ اور یوں تو بلاد مصر وشام میں سیکڑوں ہزاروں مدرسے قائم ہوچکے تھے۔ قاضی مجیر الدین حنبلی نے سنہ ۹۰۰ھ میں خاص شہر بیت المقدس کی جو تاریخ لکھی اُسمیں وہاں کے ۳۸ مدرسوں کی فہرست مع تاریخ تعمیر واسماے بانیان درج کی ہے جو اُسکے عہد میں موجود تھے

نام مدرسہ	سنہ تعمیر یا افتتاح	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام کیفیت
ظاہریہ قدیمہ	سنہ ۶۶۲ھ	الملک الظاہر بیبرس بندقداری المتوفی سنہ ۶۷۶ھ	علامہ تقی الدین بن زین للشافعیۃ محب الدین بن عبدالرحمن مدرس حنفی۔ حافظ شرف الدین دمیاطی مدرس حدیث کمال الدین قرشی مدرس قرأۃ۔ ایک کتبخانہ بھی اسپر وقف تھا۔ الملک الظاہر نے یورپ وتاتار پر چند بار فتحیں حاصل کیں۔ اسکی فتوحات اور بہت سی عالیشان تعمیرات ومصارف سلطنت کو تتمہ ابن خلکان میں

[۵۱] حرمین شریفین کے مدرسوں کا ذکر اعلام وشفاء الغرام تاریخ مکہ میں اجمالاً وتفصیلاً لکھا ہے ۱۲۔

[۵۲] مدرسہ عبدالباسط کے سوا اور باقی مدرسوں کا ذکر علامہ سیوطی نے اجمالاً وتفصیلاً کیا ہے۔ لیکن بہت سے زائد حالات مینے تتمہ ابن خلکان وخود حسن المحاضرۃ کے مختلف مقامات سے لکھے ہیں ۱۲۔

نام مدرسہ	سنہ افتتاح یا تعمیر	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام	کیفیت
				تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔
منصوریہ	•	ملک منصور قلاؤن المتوفی ۶۸۹ھ	ابوحیان۔ برہان الدین امین الدین شاگرد ابن الہمام	یہ مدرسہ نہایت عظیم الشان تھا۔ علامہ قلبیؔ مصنف تتمہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ مدرسہ اور اسمیں جو ہسپتال تھا بے نظیر خیال کیے گئے ہیں۔ ملک منصور بڑی سطوت وجبروت کا بادشاہ تھا اور اُسکے خاندان نے اکثر یورپ پر فتحیں حاصل کیں۔
ناصریہ	۷۰۳ھ	ناصر محمد ولد قلاؤن المتوفی ۷۴۱ھ		اسمیں چاروں مذہب کا درس ہوتا تھا یہ مدرسہ نہایت پُرشوکت تھا اور دروازہ پر ہروقت چوکی پہرہ رہتا تھا۔
خانقاہ بیبرسیہ	۷۰۶ھ	امیر رکن الدین بیبرس		قاہرہ میں اس سے بڑی کوئی خانقاہ نہیں ہے اسمیں جو کنگھرہ تھا وہ بغداد کے ایوان خلافت سے نکالکر آیا تھا اور بطور یادگار فتح اسمیں لگایا گیا تھا۔
خانقاہ شیخو (یا) شیخونیہ	۷۵۶ھ	امیر کبیر سیف الدین افسر امرای جداریہ	اکمل بن محمود بابرتی جنکا حاشیہ ہدایہ پر عنایہ کے نام سے مشہور ہے مدرس حنفی تھے۔ شیخ بہاء الدین بن علامہ تقی الدین سبکی مدرس شافعی۔ شیخ خلیل مصنف مختصر مدرس مالکی۔ قاضی القضاۃ موفق الدین مدرس حنبلی۔ جمال الدین عبداللہ بن حمولی مدرس حدیث	علامہ سیوطی نے بہت سے مدرسین کے نام لکھے ہیں جو اسمیں وقتاً فوقتاً فقہ اور حدیث کے درس کے لیے مقرر ہوئے۔

نام مدرسہ	سنہ تعمیر یا افتتاح	بانی مدرسہ	بعض مدرسوں کا نام	کیفیت
صرغتمشیہ	۷۵۷ھ	صرغتمش۔ افسر امرای جداریہ	قوام اتقانی مدرس حنفی	اسکی عمارت نہایت بلند اور پرتکلف تھی۔
ظاہریہ جدیدہ	۷۸۸ھ	.	علاءالدین مدرس حنفی اوحدالدین رومی مدرس شافعی شمس الدین بن مکین مدرس مالکی صلاح بن الاعمی مدرس حنبلی احمد زادہ عجمی مدرس حدیث فخرالدین ضریر مدرس قرات	۱۲۔ رجب کو کھولا گیا۔ شعرا نے اُسکی شان میں قصیدے لکھے بادشاہ نے نہایت تکلف سے ایک عام دعوت کی جسمیں تمام علما وغیرہ مدعو تھے۔ علاءالدین سیرامی مدرس حنفی جب آئے تو بادشاہ نے اُنکا فرش اپنے ہات سے بچھایا۔ علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ جتنے مدرس اسمیں مقرر ہوئے کوئی شخص اُس زمانہ میں اُنکا ہمسر نہیں تھا۔
مدرسہ عبد الباسط	.	عبد الباسط بن خلیل بن ابراہیم الدمشقی		یہ سلطان ظاہر ططر المتوفی ۸۲۴ھ کا ناظر العساکر تھا۔
مویدیہ	۸۱۹ھ	الملک المؤید		اسکی عمارت پر چالیس ہزار اشرفیاں صرف ہوئیں۔

اشرفیہ۔ ملک اشرف سیف الدین ابو نصر الدقاقی نے جسنے ۸۲۹ھ میں قبرس فتح کیا۔ یہ مدرسہ نہایت زرخطیر کے صرف سے طیار کرایا اور بہت سی آمدنی اُسپر وقف کی (اعلام۔ صفحہ ۲۰۷)۔

اسکندریہ و قاہرہ کے یہ وہ مدرسے ہیں کہ ہر ایک کو کالج بلکہ یونیورسٹی کہنا چاہیئے۔ علامہ سیوطی

نے انکو (بجز اخیر مدرسہ کے) اُمہات مدارس میں لکھا ہے۔ اور مصر کے اور بہت سے مدرسوں مثلاً فخریہ۔ فاضلیہ۔ سیفیہ۔ سعزیہ۔ مشہد نفیسی۔ مدرسہ قاتیبائی۔ جمالیہ۔ دارالمامون۔ عاشوریہ۔ خشابیہ۔ کہاریہ۔ وغیرہ کا ذکر چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ اکثر اُن کے مدرسین کے نام فقہاء مصر کے ذیل میں لکھے ہیں۔

تعلیم کے سلسلہ تاریخ میں سلاطین ترک کا زمانہ تمام پچھلے زمانوں سے زیادہ نمایاں اور تابندہ ہے۔ ترکی مدارس بہت سی خصوصیات میں اولیت کا دعوی کرسکتے ہیں۔ اور اس بات کا جائز حق رکھتے ہیں کہ تاریخ کے صفحوں میں تمام پچھلے مدرسوں کے سلسلے سے الگ لیکن ممتاز موقع پر جگہ لیں۔ گذشتہ عہدوں میں مدرسے آپس میں کوئی انتظامی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ بعض حالتوں میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ باہمی اختلاف کی ایک تحریک دلانے والی مثال تھی۔ لیکن ترکی مدارس ایک انتظامی رشتہ میں منسلک تھے اور یہ کہنا چاہیئے کہ ایک ہی خاندان کی اولاد تھے۔ پچھلے عہد میں تمام مدرسے محض مذہبی مدرسے تھے اگرچہ انہیں اور علوم بھی پڑھائے جاتے تھے لیکن ترکوں کا سررشتہ تعلیم پولیٹکل حیثیت رکھتا تھا۔ وہ سلطنت کے لیے لائق لائق عہدہ دار پیدا کرتا تھا تمام مدرسے ایک یونیورسٹی کے تابع تھے۔ اور طلباء و مدرسین درجہ بدرجہ ترقی حاصل کرتے تھے۔ مدرسین کے لیے پنشن کا حق جو ترکی حکومت میں نہایت فیاضانہ طور پر قائم کیا گیا تھا اسلامی تاریخ میں غالباً پہلی ایجاد تھی۔ یہ تعجب ہے کہ اکثر حالتوں میں پنشن اصل تنخواہ کے برابر ہوتی تھی۔ ترکوں کے عہد میں تنخواہیں بھی اکثر بیش قرار تھیں۔ بڑے بڑے مدرسوں میں مدرس کو اکثر ساٹھ یا اسّی درہم روزانہ ملتے تھے۔ اور بعض حالتوں میں یہ تعداد سو بلکہ دو سو درہم یومیہ تک پہنچ جاتی تھی ہم اس موقع پر تاریخ اوٹومین کا کچھ انتخاب نقل کرتے ہیں۔

سلہ ٹرکی کے سفر میں مجکو اس رائے سے رجوع کرنا پڑا + درہم جس چیز کا نام ہے اس سے مراد وہ سکہ ہے جسکو آجکل قرش کہتے ہیں اور یہ کل ۲ رکا ہوتا ہے۔ اس حساب سے یہ تنخواہیں بیش قرار نہیں رہتیں۔

History of the Ottoman Turks by Sir Edward
Creasy M.A. late Chief Justice of Ceylone — London
Richard Bentley

جس سے ترکی مدرسوں کی نسبت ایک معقول راے قائم کیجا سکتی ہے یہ مورخ ترکی خاندان کی
آئین ملکی اور عام انتظامات کے ذیل میں لکھتا ہے محمد ثانی نے جو بادشاہ پہلے ہوئے وہ اور
اُنہین خاصکر ارخان کو مدرسے اور کالجوں کے قیام کا ازحد شوق تھا۔ لیکن محمد ثانی ان سب سے
بڑھکر نکلا اور اُسکے زمانہ میں تعلیم کا بڑا چرچا ہوا اور عالم لوگ بڑے بڑے عہدے پانے لگے قسطنطنیہ
کا فاتح بخوبی جانتا تھا کہ سلطنت کے قیام اور وسعت کے لیے علاوہ جوانمردی اور قواعد دانی کے
کچھ اور بھی ضروری ہے۔ چونکہ وہ خود لکھا پڑھا تھا اسلیے اُسنے اپنی رعایا کی تعلیم میں کوئی دقیقہ
اُٹھا نہیں رکھا۔ محمد نے علاوہ ابتدائی مدرسوں کے جو مکتب کے نام سے مشہور ہیں اور ہر گانوں میں
کثرت سے پاے جاتے ہیں بڑے بڑے مدرسوں کی بنیاد ڈالی طالب العلموں کو دس مختلف
مضامین میں تعلیم ہوتی تھی۔ صرف۔ نحو۔ منطق۔ تاریخ۔ زبان۔ طرز تحریر۔ علم فصاحت و بلاغت۔
اقلیدس۔ ہیئت۔ جو طالب العلم ان دسوں مضامین میں دستگاہ کامل حاصل کرتے تھے دانشمند
کا خطاب پاتے تھے۔ یہ بھی سب مضامین مثل اور مولوی فاضلوں کے چھوٹے لڑکوں کو پڑھاتے
تھے۔ دانشمندوں کو ابتدائی مدرسوں کی اعلی مدرسے ملتے تھے۔ لیکن جماعت علما میں داخل ہونے
کے لیے بہت کچھ قانون (فقہ سے مراد ہے) پڑھنا اور متواتر امتحان دینے ہوتے تھے۔ اور درجہ
بدرجہ سند پاتے تھے یہ تعلیم بے شبہ اُسی تعلیم کے مطابق ہے جو پندرہویں صدی میں پیرس اور
کیمبرج میں دیجاتی تھی اور اس بات کا بہت خیال کیا جاتا تھا کہ علما میں صرف وہ لوگ داخل ہوں
جو ذی علم اور ذی لیاقت ہوں۔ ان لوگوں کو بڑی عزت اور فیاضانہ مدد اور خاص حقوق ملتے تھے۔
اسی جماعت علما میں سے بڑے کالجوں کے اعلی مدرس۔ قاضی۔ مفتی اور جج۔ مقرر ہوتے تھے مسجدوں

کے امام اور واعظ علما کے بعد ہیں۔ دنیا میں بجز ترکی کے کوئی ایسا ملک نہیں جہاں علمای مذہب ایسے ذی اختیار اور حکم شرع ایسا قوی ہو۔ عثمانی اس بات میں بڑے قابل عزت ہیں کہ وہ لوگ مدرسوں اور علما کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ جسکا نشان بھی عیسائی قوموں میں نہیں پایا جاتا۔

ترکوں میں ارخان (بو یع ۷۲۶ھ) پہلا فرمانروا تھا جسنے مدرسوں کی بنیاد ڈالی۔ اُس کا ازنیق کا مدرسہ نہایت نامور رہوا۔ داؤد قیصری جنکی شرح فصوص الحکم مشہور ہے اور علاء الدین شارح وقایہ وغیرہ مدرس تھے۔ سلطان مراد کے زمانہ میں اُسکے مدرس اعظم کی تنخواہ ماسہ درہم یومیہ تھی۔ ارخان کے جانشینوں نے اس سلسلہ کو بہت ترقی دی اور محمد خاں فاتح کے عہد میں حد کمال کو پہنچگیا۔ محمد خاں نے بچپن میں عمدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن اُسکا علمی شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ حکومت کے زمانہ میں بھی وہ طالب العلمی کرتا رہا اور علامہ خواجہ زادہ۔ علامہ بن الخطیب وغیرہ علما خاص اُسکے پڑھانے پر مقرر تھے۔

محمد فاتح نے ۸۶۹ھ میں بمقام قسطنطنیہ ایک بڑی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جسکے ماتحت آٹھ کالج تھے اور سب کے ساتھ جداگانہ بورڈنگ تھے۔ یہ عظیم الشان عمارت رجب ۸۷۵ھ میں تمام ہوئی۔ علاء الدین طوسی۔ خواجہ زادہ۔ ملا عبد الکریم۔ محمد بن مصطفے۔ اور بہت سے علما مدرس مقرر ہوئے جنمیں سے اکثر کی تنخواہ سو درہم یومیہ تھی۔ محمد خاں خود بھی ان مدرسوں میں درس کے وقت کبھی کبھی شریک ہوتا تھا۔ ایکبار علامہ علاء الدین طوسی کے درس میں حاضر ہوا۔ شرح عضد سید شریف کا درس ہو رہا تھا۔ علامہ کی حسن تقریر سے ایسا محظوظ ہوا کہ رہ رہکر کھڑا ہو جاتا تھا۔ سبق ختم ہوا تو دس ہزار درہم علامہ کو اور پانسو درہم طلبا کو صلہ دیا۔ علامہ علاء الدین قوشجی کو مدرسہ ایا صوفیہ کا مدرس اعظم کیا اور دوسو درہم یومیہ تنخواہ مقرر کی۔ علامہ قوشجی کی شرح تجرید خواجہ زادہ کے محاکمہ تہافت الفلاسفہ امام غزالی نے شہرت عام حاصل کی ہے۔ یہ محاکمہ بھی محمد خاں کی

فرمایش سے لکھا گیا تھا جسکے صلہ میں اُسنے دس ہزار درہم عنایت کیے تھے۔

بایزید خاں نے جو ۸۸۶ھ میں تخت نشین ہوا اور بہت سے مدرسے قائم کیے اور اُس زمانہ میں مدرسین کے علاوہ جتنے نامور علما تھے سب کی تنخواہیں بشرح دس ہزار عثمانی سالانہ مقرر کردیں جو لوگ شرح مفتاح سکاکی کا درس دیتے تھے اُنکی تنخواہ چار ہزار سالانہ مقرر کی۔ حرمین شریفین کے فقہا کے لیے چودہ ہزار اشرفی سالانہ کا حکم دیا۔ سلطان سلیمان نے جو ۹۲۶ھ میں سریر حکومت پر بیٹھا علاوہ اور مدارس کے ۹۷۲ھ مکہ معظمہ میں چار بڑے بڑے مدرسے تعمیر کرائے۔ قاضی مکہ نے بنیاد کا پتھر رکھا اور تمام علمانے اُنکی متابعت کی۔ ہر مدرس کی تنخواہ اُس وقت ۵۰ عثمانی یومیہ پھر سو عثمانی مقرر ہوئی۔ ان مدرسوں میں طب و حدیث کا بھی درس ہوتا تھا۔

قسطنطنیہ میں بہت سے عمدہ مدرسے بنوائے اور چھ سو طلبا کا وظیفہ مقرر کیا (عقد المنظوم فی افاضل الروم) سلطان سلیم نے پچھلی کوششوں میں اور بہت کچھ اضافہ کیا۔ مراد نے جو ۹۸۲ھ میں تخت نشین ہوا مکہ معظمہ میں بمقام صفا ایک مدرسہ بنوایا جسمیں ایک مدرس ایک معید اور بیس دانشمند تھے[۱]۔

ترکوں کی علمی تاریخ کا ہمنے نہایت چھوٹا حصہ اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ترکوں کی حکومت کو کم و بیش آج چھ سو برس ہوئے اس وسیع مدت میں بیسیوں سلاطین سیکڑوں وزرا۔ ہزاروں اہل منصب نے نہایت حوصلہ مندی سے فیاضیاں دکھائیں۔ ایک مختصر سے آرٹکل میں اُنکی اجمالی صورت بھی نہیں دکھائی جاسکتی۔ شقائق نعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ۔ و عقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم۔ ان دو تاریخوں میں

۱؎ ترکی مدارس کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ آثار الدول قرمانی۔ و اعلام و شفاء الغرام ہر دو تاریخ مکہ۔ و شقائق نعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیۃ۔ و عقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم سے لکھا ہے ۱۲۔

ارخان کے عہد سے ۹۸۴ھ تک کی علما مذکور ہیں۔ انکے حالات میں ترکی مدارس کا ذکر بھی ضمناً آجاتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو انھی دو کتابوں سے قریباً دو سو کالجوں اور مدرسوں کی فہرست بنا سکتا ہے جنمیں تمام علوم درسیہ پڑہائے جاتے تھے۔ اور جنکے بانیوں۔ مدرسوں۔ شرح تنخواہ کا حال ان تاریخوں میں کسی قدر تفصیل سے ملسکتا ہے۔ اس موقع پر ہم جریاً للعادۃ ایک مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں جسمیں چند بڑے بڑے نامور کالجوں کا ذکر اور انکے اجمالی حالات ہیں۔

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ مدرسین	کیفیت
مرادیہ	بروسہ	سلطان مراد بن اورخان	۵۰ یومیہ یعنے ۱۵۰۰ ماہوار	اسی طرح تمام مدرسین کی تنخواہیں جو لکھی ہیں
سلطانیہ	״	سلطان بایزید خاں	صہ	یومیہ سمجھیں ترکوں میں تنخواہ کا حساب یوم
قاسمیہ	״	قاسم پاشا	سہ	سے ہوتا ہے۔
مناستر	״	۰	صصہ	
محمدیہ	״	سلطان محمد خاں اول	صہ	
مرادیہ	قبلوجہ	سلطان مراد بن محمد خاں	سہ	
مرادیہ	بروسہ	״	صہ الی سہ	ملا نعمت اللہ معروف بروشنی زادہ۔
حلبیہ	ادرنہ	۰	صہ	
محمودیہ	قسطنطنیہ	محمود پاشا وزیر اعظم	صہ	عرب زادہ
مرادیہ	״	مراد پاشا	۰	
قلندریہ	״	۰	صہ	
مدرسہ ابی ایوب	״		لہ	
بایزیدیہ	״	بایزید خاں	ما،	

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ مدرسین	کیفیت
بایزیدیہ	اماسیہ	بایزید خاں	لہ	۔
ابراہیمیہ	قسطنطنیہ	ابراہیم پاشا	۔	۔
مدرسہ علی پاشا	"	علی پاشا	صہ /	۔
مدرسہ مصطفیٰ پاشا	"	مصطفیٰ پاشا	صہ	
رستمیہ	"	رستم پاشا وزیر کبیر	صہ	شمس الدین خلف مفتی ابو السعود مفسر۔ مدرس تھے سترہ برس کے سن میں اس مدرسہ کے مدرس اعظم مقرر ہوئے سنہ ۹۰۰ھ میں وفات پائی
قاسمیہ	"	قاسم پاشا	صہ	ملا محمد خلف مفتی ابو السعود۔ توفی سنہ ۹۷۱
سلیمانیہ	"	سلطان سلیمان بن السلیم	سہ	
"	"	"	"	
داؤدیہ	"	داؤد پاشا	صہ	
پیریہ	"	پیری پاشا	صللعہ	
سنانیہ	"	سنان کتخدا بیچی	صہ	
سلیمیہ عتیقیہ	"	سلطان سلیم بن سلیمان	سہ	
سلیمیہ جدیدیہ	"	"	صہ و سہ	
مدرسہ ست خاتون	"	ست خاتون	للسہ	
خاصکیہ	"	زوجۂ سلیمان خاں		
مدرسہ خانقاہ	"	"	صہ	

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ مدرسین	کیفیت
مدرسہ طرابزون	طرابزون	والدۂ سلطان سلیم خاں	۵۰	ملا نعمت اللہ معروف بروشنی زادہ۔
دار الحدیث	قسطنطنیہ	سلطان سلیمان خاں	۱۰۰	ملا کوسج امین
مدرسہ خسرویۃ	۰	امیر الامرا خسرو	۵۰	
سلیمانیۃ	دمشق	سلطان سلیمان خاں	۶۰	
مدرسہ اطنۃ	اطنۃ	پیری پاشا	۵۰	
گکیوزہ		مصطفےٰ پاشا	۵۰	
دار الحدیث	ادرنۃ		۱۰۰	ملا شمس الدین قاضی زادہ مدرس تھے۔
احمدیہ	چورلے	احمد پاشا وزیر اعظم	۵۰	ملا کوسج امین۔
سلیمانیۃ	ازنیق	سلیمان پاشا	۵۰	
مدرسہ گکیوزہ	گکیوزہ	مصطفےٰ پاشا	۰	
افضلیۃ	قسطنطنیہ		۵۰	

اخیر میں مجکو یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ ترکی مدارس کو جو ترجیح ہے۔ اور جسکا میں اعتراف کرچکا ہوں وہ زیادہ تر سلسلہ انتظام۔ اُصول ترقی۔ انضباط قواعد۔ کثرت مصارف کی رو سے ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں کے تعلیم یافتہ طلبا کو باقاعدہ ملکی عہدے ملتے تھے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جسقدر پولیٹکل پلہ بھاری ہوا کمال علمی کا وزن کم ہوتا گیا۔ یہی بات ہے کہ چھ سو برس کی مدت میں ان مدارس سے ایسے کم لوگ اُٹھے جو حکیم یا محقق کا لقب حاصل کر سکے۔ علامہ ابن خلدون نے تو کلیتہً نفی کی ہے۔ لیکن اگر صاحب کشف الظنون کی فہرست حکما تسلیم بھی کرلیجاے تاہم اُسکا اختصار ترکوں کے وسیع سلسلہ حکومت سے موزوں نسبت نہیں پیدا کرسکیگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایشیا کی تاریخ میں کمال کو دنیوی جاہ و منصب کی خواہش سے کم تعلق رہا ہی۔
ہمارے آرٹیکل کا یہ حصہ جسمیں خاص قسم کے مدارس اور دارالعلوم سے بحث ہے ختم کے
قریب ہی اور صرف دو ناموں کی جگہ آئیں اور خالی ہے یعنی **اندلس** (اسپین) و **ہندوستان**۔
اس بات کا ہمکو بہی افسوس ہے کہ اسپین جو تیغ و قلم دونوں میں خلافت بغداد کا حریف مقابل
تہا اس خاص سلسلہ میں سب سے اخیر نمبر پر ہے۔ ہم قرطبہ (کارڈوا) غرناطہ (گرنیڈا) کی شہرت
اور عظمت کے منکر نہیں ہیں۔ قرطبہ کے نقشہ میں ہم ۳۸۳۷ مسجدیں ۷۰۰ حمام ۱۱۳۰۰۰ عام رعایا
کے مکانات دیکھتے ہیں۔ قصر الزہرا۔ کامل۔ مجدد۔ قصر الحائر۔ روضۃ۔ مبارک۔ قصر السرور۔ تشیق
تاج۔ بدیع [۵۱] کے بلند اور زیب و زینت سے معمور عمارتیں بہی ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔
لیکن اس تمام وسعت میں کسی کالج یا اسکول کا ہمکو نشان نہیں ملتا۔ بے شبہ قرطبہ کی
علمی شہرت بغداد سے کم درجہ پر نہیں ہے۔ بے شبہ یورپ کی استادی کا فخر اسپین ہی کا خاص
حصہ ہے لیکن اسوقت اصطلاحی مدارس سے بحث ہے جسکے معنی اتنے ہی تک محدود ہیں کہ
خاص درس و تدریس کی غرض سے کوئی عمارت طیار کی گئی ہو۔ اسپین کی بجا طرفداری علامہ مقری
سے زیادہ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ جو اسپین کی ایک ایک خوبی کو تمام اور ممالک اسلامیہ کے
سامنے اس دعوی سے پیش کرتا ہے کہ "تم ایک کا بہی جواب لا سکتے ہو"۔ تاہم اس محقق اور وسیع
النظر مورخ نے صاف صاف اقرار کیا ہے کہ "تمام اسپین میں ایک بہی مدرسہ نہیں تہا صرف مسجدوں
کے صحن تہے جنمیں تمام علوم و فنون پڑہائے جاتے تہے" [۵۲] نوسٹر صاحب کی تاریخ اسپین و
نظم الممالک و چیمبرس انسائیکلوپیڈیا وغیرہ میں اسپین کے مدرسوں کا جہاں اجمالاً ذکر کیا گیا ہے

---

۵۱ یہ سب قرطبہ کے عالیشان ایوانات و باغات کے نام ہیں ۱۲۔

۵۲ دیکھو نفح الطیب تاریخ اندلس مطبوعہ فرانس جلد اول صفحہ ۱۳۶۔

غالباً اس سے اسی قسم کی عام درسگاہیں مراد ہیں۔

ہندوستان[1] کے تذکرہ میں ہمکو بے خطر کہنا چاہیئے کہ اس سرزمین پر شاید ایک بھی علمی عمارت نہیں قائم ہوئی لیکن اس ملک کی عام علمی فیاضیوں کا انکار نہیں ہوسکتا۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان۔ عالمگیر کے خزانۂ شاہی سے عموماً اُن لوگوں کے لیے جاگیریں اور وظیفے مقرر تھے جو بطور خود درس وتدریس کرتے رہتے تھے۔ دولت ترکیہ اسقدر بے انتہا صرف اور سعی واہتمام کے ساتھ بھی حصل نتیجہ میں دولت تیموریہ سے کچھ فائق نہیں ہے۔ شمس الدین فناری۔ قاضی زادہ۔ خواجہ زادہ۔ علامہ قوشجی۔ ابن المؤید۔ وغیرہ کے مقابلہ میں جنکو صاحب کشف الظنون۔ حکما۔ کا لقب دیتے ہیں۔ ہم ملا محمود جونپوری۔ ملا نظام الدین۔ محب اللہ بہاری حمداللہ۔ بحر العلوم۔ شاہ ولی اللہ صاحب کو کسی قدر ترجیح کے ساتھ پیش کرسکتے ہیں۔

جن مدرسوں کے حالات ہم لکھ آئے ہیں اکثر مذہبی یا عقلی علوم کے درس کے لیے تھے صنعتی مدارس کے متعلق ہماری واقفیت نہایت محدود ہے۔ اسلامی ملکوں میں عمدہ صنعتوں کے بہت سے آثار موجود ہیں مگر انکی تعلیم کے کسی مرتب سلسلہ کو ہم نہیں معلوم کرسکے ہیں۔ فنون جنگ میں مسلمانوں کی ترقی اب بھی دنیا کی موجودہ صورت سے عیاں ہے۔ اور مسٹر ایڈورڈ ڈ‍زی صاحب نے یورپ میں ترکوں کی فتوحات کو اسی امر سے منسوب کیا ہے۔ لیکن ہم عبدالمومن سلطان مراکو کے مدرسہ حربیہ کے سوا اور کسی حربی تعلیم گاہ کے حالات سے نہیں واقف ہیں۔ چراکسہ کے عہد میں جو عمدہ فوجیں طیار ہوئیں اُسکا یہ طریقہ تھا کہ ترک اور چرکس غلام جو خرید کرکے آتے تھے اُنکو پہلے قرآن اور معمولی خط کتابت وکسیقدر حساب سکھایا جاتا تھا پھر فقہ کی تعلیم ہوتی تھی اور بعض تیز طبع نوجوان معتدبہ لیاقت تک پہنچ جاتے تھے۔ اسکے بعد نیزہ بازی۔ اور تیراندازی اور پھر شہسواری سکھائی جاتی تھی جو اُنکی تعلیم کا انتہائی زینہ تھا۔ لیکن یہ طریقہ بھی کسی باقاعدہ ہیئت اجتماعی

[1] میں اسبات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ تحقیق صحیح نہیں ثابت ہوئی۔ ہندستان میں بہت سے مدارس تعمیر ہوئے تھے گو اب انکا نام ونشان باقی نہیں رہا۔

کی صورت نہیں رکھتا تھا اور غالباً تمام ممالک اسلامیہ میں حربی تعلیم کا یہی انداز تھا۔ خلیفہ **عبد المومن بن علی** کا مدرسہ حربیہ خاصتہً قابل ذکر ہے جس کی تفصیل ہم ہسٹری آف ڈومنین آف اسپین۔ مصنفہ کانڈی[۱] سے قریب قریب اسی کے لفظوں میں نقل کرتے ہیں۔

"اُسنے (عبد المومن) نے ایک اسکول لڑکوں کے لیے بنایا جس میں صرف علوم ہی نہیں بلکہ سپہ گری کے کام بھی سکھائے جاتے تھے۔ کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ صرف پڑھے لکھے قاضی طیار ہوں بلکہ اسکی خواہش تھی کہ لائق لائق گورنر ملکوں کے لیے اور فائق گروہ قضاۃ شہروں کے انتظام کے لیے پیدا ہوں بلکہ بڑے بڑے جنرل اور اچھے جنگ آور اُس کے اسکول سے تعلیم پاکر نکلیں۔ ان کالج اور اسکولوں میں وہ مصامدہ اور دوسری قوموں کے شریف خاندانوں سے جو اُنکے ملک میں رہتے تھے لڑکے جمع کرتا تھا جنکی تعداد تین ہزار تھی اور جو قریب قریب ایک ہی عمر ہونے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک ہی دن کے پیدا ہیں۔ یہ لڑکے حافظ اور طالبین کہلاتے تھے۔ کیونکہ وہ موطا۔ یا اُصول المہدی حفظ یاد کرتے تھے اور ایک دوسری کتاب بھی پڑھتے تھے جسکا نام مایطلبہ القاضی تھا۔ حافظین کو بادشاہ جمعہ کے دن الکوزمیں جمع کیا کرتا تھا جسدن کہ وہ آزالہ جایا کرتا تھا وہ انکو حکم دیتا تھا کہ ہفتہ بھر کا پڑھا اُسکے سامنے دُہرائیں ہفتہ میں ایک دوسرے دن انکو حکم دیتا تھا کہ شہسواری۔ ہتھیاروں کے کرتب۔ نیزہ بازی۔ گھوڑ دوڑ۔ اور بہت سی مشقوں کا جو سپاہیوں کے لیے ضرور ہیں تماشا دکھلائیں۔ تیسرے دن اُن کی تیراندازی کی مشق دیکھتا تھا اور ایک اور دن اُنکی شناوری کی اُستادیاں ملاحظہ کرتا تھا جسکے لیے اُسنے اپنے باغ میں ایک بڑا وسیع تالاب بنوایا تھا جو تین سو قدم لمبا اور اُتنا ہی چوڑا تھا۔ تالاب میں مختلف قسم کی کشتیاں اور اور قسم کی جو کہ خود اسنے ایجاد کی تھیں اور اس مضع کی

---

[۱] دیکھو تاریخ مذکور۔ جلد ثانی۔ صفحہ ۴۷۵۔ مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء ۱۲

اُس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں تھیں۔ پڑی رہتی تھیں۔ وہ ان کشتیوں پر حافظین کو سوار کراتا تھا جنہیں بیٹھکر ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور اپنے آپ کو بچانے میں وہ بڑی پھرتی اور چالاکیاں دکھلاتے تھے۔ عبدالمومن خود اُنکو کشتیوں کے کھینے اور کسی خاص سمت لیجانے اور تمام اُن اعمال کے طریقے بتاتا تھا جو سمندر میں جہازوں کے استعمال کے لیے ضروری ہیں۔ اسطرح پر ہفتہ کا ہر ایک دن کام میں لایا جاتا تھا اور ہر کام کے لیے ایک خاص دن مقرر تھا۔ یہ لڑکے بڑے جوش سے اپنا کام کرتے تھے بوجہ اُن گراں قدر انعاموں کے جو کہ عبدالمومن کی طرف سے اُن نوجوانوں کو دیئے جاتے تھے جنہوں نے فتح حاصل کی ہے یا اپنے فرائض میں زیادہ مشاق ہیں۔ یہ سب خرچ عبدالمومن خود دیتا تھا۔ یہاں تک کہ ہتھیار اور گھوڑے بھی اُسی کے عنایت کیے ہوئے ہوتے تھے۔ ان حافظین میں ۱۳ لڑکے خود عبدالمومن کی اولاد تھے جو ہتھیاروں کے کام اور دوسری قسم کی مشاقیوں میں نہایت چالاک تھے۔ اسکے علاوہ وہ ذاتی اخلاق میں بھی نہایت برگزیدہ اور ممتاز تھے۔"

یہ سب مدرسے وہ تھے جو ممالک اسلامیہ میں قائم ہوئے لیکن مسلمانوں کی علمی فیاضی اس وسیع دائرہ میں بھی محدود نہ تھی۔ اُنہوں نے یورپ کے خاص شہروں میں بھی رصدخانے صنعت گاہیں اور مدرسے قائم کیے جنمیں سے ایک کا ذکر گبن صاحب کی تاریخ سے اُنہی کے الفاظ میں کرتا ہوں وہ رومن امپائر حصہ مسلمانان فتح سالرنو کے ذیل میں لکھتے ہیں "افریقیہ اور ہسپانیہ اور سسلی میں جو عرب کی نوآبادیاں تھیں اُنکو یونانی دواؤں سے واقفیت حاصل ہوئی اور بوجہ اجتماع جنگ و صلح علم کا پرتو سالرنو جیسے مشہور شہر میں چمکا۔ ایک مدرسہ جو اول ہی اول فرنگستان کے زمانہ جہالت میں قائم ہوا وہ فن جراحی کے لیے مخصوص تھا۔ اس مفید اور صحت بخش پیشہ کے لیے پادریوں اور راہبوں کی منظوری لے لی گئی تھی۔ اور بہت سے نامی گرامی مریض دور دور

مقامات کے سارنو کے اطباکے پاس رجوع کرتے تھے یا اُنکو طلب کرتے تھے یہ اطبا۔ نارمنڈی کی فتحیابوں کے ظل حمایت میں رہتے تھے۔ قسطنطین نام افریقہ کا ایک عیسائی اٹھتیس برس سفر حج میں رہکر اور زبان و علم عربی کی تحصیل کامل کرکے بغداد سے واپس آیا۔ اس بوعلی سینا کے شاگرد کے مطب اور ہدایات اور تحریرات سے سارنو مالا مال ہوگیا"

قدیم تعلیم

۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف و تالیف نہیں شروع ہوئی تھی جو تعلم و تعلیم تھی۔ وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرز زندگی کے لیے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جنکو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرز تعلیم تو بالکل وہی تھا۔ (یعنی سند و روایت) جو قدیم زمانہ سے اُنمیں رائج تھا۔ لیکن سو برس کی مدت میں تمدن بہت کچھ ترقی کرگیا۔ اور اُسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتب اور باقاعدہ ہوچلی۔ اس دور میں جن علوم کو رواج عام حاصل ہوا۔ وہ نحو۔ معانی۔ لغت فقہ۔ اصول۔ حدیث۔ تاریخ۔ اسماء الرجال۔ طبقات۔ اور انکے متعلقات تھے۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہوگیا تھا مگر رواج عام نہ حاصل کرسکا۔ جسکی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اُس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت۔ کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ اور منطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے۔ دیکھو۔ گنگس سے دریاے سندھ کے کنارہ تک اسلام حکومت کررہا ہے۔ حجازی فتوحات کا سیلاب اب رُکتا چلا ہے۔ مفتوحہ ممالک میں امن و انتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستان عرب سے نکلکر دور دراز

ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقہ میں داخل ہو رہے ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سر رشتہ تعلیم ہے نہ یونیورسٹیاں ہیں۔ نہ مدرسے ہیں۔ عرب کی نسلیں حکمراں ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق۔ معاشرت۔ تمدن۔ پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم و فنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرو۔ ہرات۔ نیشاپور۔ بخارا۔ فارس۔ بغداد۔ مصر۔ شام۔ اندلس۔ کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج رہا ہے۔ عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم ہیں جنہیں سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے اور جو آجکل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں۔ اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن۔ خانقاہوں کے حجرے۔ علما کے ذاتی مکانات ہیں۔ لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے عالیشان قصر و ایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے اُس سے کچھ زیادہ نہو سکی۔ اگرچہ اسوقت اُس زمانہ کا کوئی رجسٹر نہیں موجود ہے جس سے ہم حساب لگا سکیں کہ فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے۔ لیکن تذکرہ۔ تراجم۔ اسماء الرجال۔ طبقات کی سیکڑوں ہزاروں کتابیں موجود ہیں جنسے ہم صحیح اندازہ کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اگرچہ متواتر انقلابات۔ تخت گاہوں کی بربادی۔ اسپین کی تباہی۔ تاتار کی غارتگری۔ کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اسوجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانہ کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں۔ تاہم ہر عہد میں ہم سیکڑوں ماہرین و مجتہدین فن کا نشان دیکھ سکتے ہیں صرف ہمعصر و ہموطن اہل کمال کی فہرست طیار کیجائے تو بھی بہت سی جلدیں طیار ہو سکتی ہیں۔ ڈاکٹر

تعلیم کی وسعت

اسپرنگر صاحب تخمینہ کرتے ہیں (شاید حسن ظن ہو) کہ "مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال ملسکتا ہے" اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہوسکتا ہے۔

مشہور علما کے تعلیمی حالات پڑہو۔ ایک ایک اُستاد کے حلقہ درس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں طالب العلم مشغول درس نظر آئینگے۔ علامہ ذہبی طبقات میں ابوالتقی المتوفی ۵۰۱ھ کے ترجمے کے بعد لکھتے ہیں کہ "اُس زمانہ کے بعض حلقہ درس ایسے ہوتے تھے جنمیں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تہیں اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تے اس بڑے مجمع میں دوسو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد و فتوے دینے کی پوری قابلیت رکھتے تے" خطیب مورخ بغداد۔ علامہ ابوحامد اسفرائنی کے حلقہ میں خود شریک تہا اسکا بیان ہے کہ سات سو طلبہ درس میں حاضر تہے۔ فرا نحوی نے کتاب المعانی کا جب لکچر دیا (جبکو عربی زبان میں املا کہتے ہیں) تو حاضرین میں سے ۸۰ صرف قاضی تھے[1]۔ رضی الدین نیشاپوری کے حلقہ درس میں چار سو فارغ التحصیل اہل علم حاضر ہوتے تہے۔ بصرہ کی جامع مسجد میں امام بخاری نے جب مجلس املاء منعقد کی تو ہزار کے قریب محدثین۔ فقہاء۔ حفاظ۔ اہلِ مناظرہ شامل ہوئے خود امام بخاری سے جن لوگوں نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی اُنکی تعداد قریباً نوّے ہزار ہے[2]۔ اس قسم کی سیکڑوں شالیں ہیں جنکا ہم استقصا نہیں کرسکتے۔

ہر درجہ کے لوگونمیں تعلیم کی اشاعت

ہر قوم ہر فرقہ۔ ہر طبقہ میں تعلیم کثرت سے جاری تہی مصنفین و اہل فن کے حالات پڑہو سیکڑوں ہزاروں اہل کمال ملیں گے جنکے باپ دادا۔ خیاط۔ اسکاف۔ جولاہے۔ حلوائی۔ طباخ۔ حداد۔ وغیرہ تہے۔ اُمرا کا عیش پسند گروہ بہی تعلیم سے مالامال تہا۔ لوگ تعجب سے

---

[1] ان لوگوں کے تراجم دیکھو ۱۲ [2] دیکھو مقدمہ قسطلانی ۱۲-

سنینگے کہ ابن المعتز عباسی المتوفی ۲۹۶ھ جو علم بدیع کا موجد اور شاعری میں ابو نواس و بشار کا ہمسر تھا اور ابو فراس جیسے عرب کی شاعری کا خاتمہ ہوگیا۔ والیان ملک تھے۔ اور حکیم بو علی سینا و محقق طوسی وزارت کے بلند منصب پر ممتاز تھے۔

اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ یہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے یعنی املا جسکو اُردو میں لکچر دینا کہتے ہیں۔ اُستاد ایک بلند مقام شلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالب العلم جو ہمیشہ دوات و قلم لیکر بیٹھتے تھے ان تقریرات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اس طرح پر ایک مستقل کتاب طیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔ امالی بن درید۔ و ثعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہیں جب معمولی سے زیادہ طلبا حلقۂ درس میں جمع ہوتے تھے تو اُستاد کے سامنے یا دائیں بائیں چند فاضل کھڑے ہوتے تھے جو دور والوں کو اُستاد کے خاص الفاظ سُنا سکتے تھے۔ یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے۔ یہ طریقۂ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہیں تھا۔ ابو بشر متی جو بغداد میں ارسطو کی کتاب المنطق کا درس دیتا تھا اُسکے لکچر میں سیکڑوں طلبا شریک ہوتے تھے جنمیں فارابی بھی تھا۔ اور اُسنے کئی سو صفحے خود نقل کئے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور مستعد و اہل کمال کی خدمت میں پہنچکر فائدہ اُٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مشہور اہل فن کی لائف چھان ڈالو۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں ملیگا جسنے تکمیل تعلیم کے لیے دو چار سو میل کی مسافت نہ طے کی ہو۔ اس زمانہ میں ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اُٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہوا اُس زمانہ کے لوگ ہمیشہ اُسکو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغداد۔ نیشا پور۔ قرطبہ۔ وغیرہ میں گو۔ ہر فن کے کامل موجود تھے مگر ان شہروں کے رہنے والے بھی مشرق و مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے۔ علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انہی علما کے

تعلیم کے لیے سفر

حالات میں ہے جو اسپین سے مصر و شام و بغداد گئے۔ یا ان مقامات سے چلکر اسپین میں داخل ہوئے جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لیے مسلمان ہمیشہ سفر کرتے رہے ہیں دنیا کی تاریخ میں اسکی نظیر موجود نہیں ہے۔

مجالس مناظرہ

دوسری چیز جو اعلی تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا۔ مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے بعض امرا اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے۔ فقہ۔ ادب۔ نحو۔ وغیرہ ہر ایک علم کی جداگانہ مجلسیں تھیں۔ ان میں علما اور طلبا دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیہ کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا۔ یہ جلسے جنمیں زیادہ تر انصاف و حق پسندی کا استعمال ہوتا تھا معمولی نصاب تعلیم ختم کرنے کے بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پُر اثر تھے۔ تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد اُستاد ایک تحریری سند عنایت کرتا تھا جسمیں اُسکی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی اس سند میں وہ طیلسان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علما کا مخصوص لباس تھا[1]

وسعت تعلیم کے

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے (۱) تعلیم۔ مذہب کا ایک ضروری جزو سمجھی گئی تھی قرآن و حدیث (جسپر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں۔ اتنے تعلق سے۔ نحو۔ صرف۔ لغت۔ معانی۔ اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا تھے فلسفہ نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی۔ اس سلسلہ نے بڑھتے بڑھتے قریباً ہر علم و فن کو اپنے دائرہ میں لے لیا تھا۔ اب خیال کرو کہ ایک قوم جسمیں اسلام کا جوش ابھی

---

[1] علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ "اول جس شخص نے علما کے لیے خاص لباس قرار دیا وہ قاضی ابو یوسف صاحب ہیں۔ وہی لباس اب بھی چلا آتا ہے" یہ لباس طیلسان کے علاوہ ایک جبہ ہوتا تھا جو آج کل کے ایم اے کے لوگون سے بہت مشابہ تھا۔ اسمیں ہڈ بھی لگا ہوتا تھا (دیکھو حسن المحاضرۃ جلد ثانی۔ صفحہ ۲۲۶۔ مطبوعہ مصر)۔

تازہ ہے جسکی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے جس کی ہمتیں بلند۔ ارادے مستقل۔ حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اُن کے جوش کو زیادہ تیز کردیا ہے جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہوگی تو کس حد تک پہنچا کر رہیگی۔ عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول کرچکی تہیں مذہب نے اُنکو بہی اُنہی سرگرم جذبات سے بہر دیا تہا۔ جو عرب کے ذاتی خاصے تہے اور چونکہ وہ مدت سے تمدن و معاشرت کی آبادی میں بسر کرتے آئے تہے تعلیم کے معاملہ میں انہوں نے اپنے اُستاد (عرب) سے زیادہ کام دیا۔ یہی بات ہے کہ نحو۔ لغت۔ حدیث۔ اُصول فقہ فلسفہ کے امام و پیشوا۔ قریباً کل عجمی ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ تاریخ میں ایک مستقل مضمون لکہا ہے جسکی سُرخی یہ ہے "حملة العلم فی الاسلام اکثرھم العجم" یعنی "اُسلام میں علم کے حاملین اکثر عجمی ہیں"۔ ہمارے اکثر اخوان جو عرب کی نسل سے ہیں اس بات کو رشک اور تعجب سے سنیں گے مگر اُنکو ہشام[1] و عیسیٰ کی طرح صبر کرنا چاہیئے۔

(۲) تعلیم مسجدوں اور علما کی خاص درسگاہوں میں مقید نہ تہی۔ وزرا۔ حکام۔ فوجی افسر اہل منصب۔ ہر طبقہ کے لوگ پڑہتے پڑہاتے رہتے تہے۔ وزارت کے کثیر الاشغال وقت میں بہی بوعلی سینا کی خدمت میں مستعد طلبا کا ایک گروہ حاضر رہتا تہا۔

[1] ہشام بن عبدالملک دولۃ بنوامیہ کا نامور خلیفہ تہا۔ راوی کا بیان ہے کہ مجہسے ہشام نے پوچہا کہ اسوقت مکہ میں علم کا سردار کون ہے۔ مینے کہا۔ عطا۔ (ہشام) وہ عربی الاصل ہے (میں) نہیں۔ اسی طرح اُسنے شام۔ مصر۔ جزیرہ۔ خراسان۔ بصرہ۔ کی بنسبت پوچہا۔ مینے۔ مکحول۔ یزید۔ میموں۔ ضحاک کے نام لیے۔ ہر نام پر پوچہتا جاتا تہا کہ عربی الاصل ہے" اور مجہسے "نہیں" کا لفظ سُنکر پیچ وتاب کہاتا جاتا تہا۔ اخیر میں مینے کہا ابراہیم النخعی جو کوفہ کا امام ہے عربی الاصل ہے۔ اسپر اُسنے ایک ٹہنڈی سانس بہر کر کہا کہ "خیر اس سے کچھ تسکین ہوئی"۔ (فتح المغیث صفحہ ۴۹۰) عیسے کی بنسبت بہی ایک اسی قسم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ۱۲۔

(٣) تعلیم میں نہایت آزادی تھی کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کرسکتا تھا۔ اہل کمال کے زمرہ میں سیکڑوں گذرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے

(٤) امرا اور اہل منصب کا گروہ جو شائقین علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا۔ سلاطین و وزرا تو ایک طرف۔ معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چونکہ اُنکی تنخواہیں کسی خدمت کے بدل نہ تھیں بلکہ صرف اُنکا ذاتی کمال اور قبول عام مہنگے داموں کو خریدا جاتا تھا۔ تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنیکا ایک عام جوش پھیل گیا تھا۔ تصنیفات میں زور طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اسیلیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدردانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چیں ہیں۔

مدرسوں کا زمانہ

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعتہً کوئی عظیم تبدیلی نہیں پیدا کی۔ نصاب تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا۔ پرویٹ تعلیم گاہیں عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک اُنپر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنت عثمانیہ کے زمانہ میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا۔ آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدت معین ہو چکی تھی گو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی مثلاً مغرب (مراکو وغیرہ) میں سولہ برس اور ٹونس میں پانچ برس طالب العلم کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا۔

املا کا طریقہ جاتا رہا

املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا۔ آٹھویں صدی میں حافظ زین الدین عراقی نے (حافظ ابن حجر کے اُستاد تھے) اُسکو زندہ کرنا چاہا اور قریباً چارسو مجلسوں میں اس طرح درس بھی دیا۔ حافظ ابن حجر و سخاوی نے بھی اُنکی تقلید کی مگر اُنہی بزرگوں پر خاتمہ

مدرسوں کا مذہبی اثر

ہوگیا۔ جلال الدین سیوطی نے ارادہ کیا مگر لوگوں کی بے توجہی دیکھکر خود باز رہے۔

یہ مدرسے اکثر مذہبی تھے اور کسی ایک مذہب کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے۔ دار العلوم نظامیہ صرف شافعیوں کے لیے تھا مستنصریہ وغیرہ میں چاروں مذہب کا درس ہوتا تھا مگر مدرسین ونصاب تعلیم بالکل جداگانہ تھی۔ اس خصوصیت نے مذہب پر ایک نمایاں اثر ڈالا۔ چوتھی صدی میں بلکہ اُس سے پہلے تقلید مذہبی کی بنیاد پڑ چکی تھی مگر ان مدرسوں نے چونکہ اُسکو محسوس صورت میں دکھایا قوم میں اُسکا عام رواج ہوگیا اور نہایت سختی کے ساتھ ہوا۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے تقلید شخصی کی ابتدا چوتھی صدی کے بعد قرار دی ہے[۵۱] ہر شخص بآسانی فیصلہ کرسکتا ہے کہ ان مدرسوں نے جو تقلید شخصی کے ہمزمان ہیں۔ یا خود تقلید کو پیدا کیا ہوگا۔ یا کم سے کم اُسکو ترقی اور استواری دی ہوگی۔ مدرسوں کی ابتدائی زمانہ میں تو ایسے علما کثرت سے تھے جو اجتہاد کا حق رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تقلید کے عام رواج نے علوم اور ایجاد کی قوت کو اسقدر گھٹا دیا کہ گویا قوم سے اجتہاد کی قابلیت ہی جاتی رہی۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے کتاب الانصاف میں نہایت سچ لکھا ہے کہ اُس زمانہ میں (یعنی پانچویں چھٹی صدی میں تقلید ہی ضروری تھی۔

تنزل تعلیم کے اسباب

تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کردیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھی مثلاً نحو۔ صرف۔ منطق۔ وامثال ذالک اُنکی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصہ اُنھی کی نذر ہوگیا اور اتنا وقت نہ ملسکا کہ جن علوم کی تحمیل مقصود اصلی تھی اُنپر پوری توجہ ہوسکتی۔

"تصانیف کی کثرت اور اُنکا درس میں داخل ہونا"[۵۲] اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا

[۵۱] دیکھو حجۃ اللہ البالغۃ صفحہ ۱۵۸-۱۲-

[۵۲] علامہ ابن خلدون نے ان دونوں باتوں پر نہایت عمدہ بحث لکھی ہے۔ دیکھو مقدمہ تاریخ فصل ۷-کی فصل ۲۸ و فصل ۳۱-

پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی۔ لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جسمیں اصلی مسائل سے زیادہ تر کتاب کی عبارت اور اُنکے متعلقات سے بحث ہوتی تھی۔ ہمارے ہندوستان میں توضیروں کے مرجع اور حیثیت تعلیلی وتقلیدی و بُعدیت ذاتی و زمانی کے تنگ دائرہ سے طلبا تو کیا اکثر علما بھی کبھی باہر نہیں نکلے۔

مدارس میں فلسفہ کی تعلیم نہ تھی۔

ان مدرسوں میں (ترکی مدارس کے سوا) فلسفہ اور منطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں تو ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی۔ لیکن اسکا الزام بانیان مدرسہ پر نہیں ہے بلکہ قوم کے اُن بزرگواروں پر ہے جو دینی یا دنیوی حیثیت سے قوم پر حکمراں تھے۔ ہم لکھ آئے ہیں کہ مسلمانوں میں علوم کی بنیاد مذہب کی زمین پر رکھی گئی۔ اسکا لازمی نتیجہ تھا کہ مذہبی پیشواؤں کی اجتہادی رائیں جدہر رُخ کریں علوم بھی اُنکا ساتھ دیں۔ اسی وجہ سے مملکت اسلامی کے ہر گوشہ میں رہ رہ کر فلسفہ کو صدمے اُٹھانے پڑتے تھے۔ معتضد باللہ خلیفہ عباسی نے جو ۲۷۹ھ میں تخت نشین ہوا پہلے ہی سال فرمان نافذ کیا کہ کتب فروش فلسفہ کی کتابیں نہ بیچنے پائیں[۵۱]۔ حکیم ابن رشد کو اپنی فلسفی تصنیفات سے اسیلیے خود انکار کرنا پڑا کہ خاندان عبدالموسن (سلاطین مراکو) نے اس جرم پر اُسکو قید کر دیا تھا۔ اسی خاندان کے ایک فرمانروا نے جسکا نام مامون تھا حکیم بن حبیب کو قتل کرا دیا[۵۲]۔ سلطنت عثمانیہ میں بھی ایک مفتی صاحب نے فلسفہ کا درس بند کرا دیا[۵۳]۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے علم منطق کے ناجائز ہونے پر ایک کتاب ہی تصنیف کر ڈالی۔ جسکا نام "القول المشرق فی تحریم الاشتغال بالمنطق" ہے۔ علامہ ابن الصلاح نے بھی اس مضمون کا ایک فتوی لکھا[۵۴]۔ علامہ ابن تیمیہ۔ **مامون** پر ہمیشہ

---

۵۱ تاریخ الخلفا۔ خلافۃ معتضد باللہ۔ ۵۲ نفح الطیب تاریخ اسپین مطبوعہ فرانس جلد ثانی صفحہ ۱۲۵۔

۵۳ کشف الظنون۔ ذکر علم حکمت۔ ۱۲ ۵۴ حسن المحاضرۃ ترجمہ حافظ جلال الدین سیوطی ۱۲۔

ترس کھاتے رہے کہ دیکھئے اس جرم پر (فلسفہ کا رواج دینا) خدا اُس سے کیا مواخذہ کرتا ہے"۔ اسپین میں اُمرا اور خواص فلسفہ کے حامی تھے لیکن عوام کی برہمی کے خوف سے کبھی اس علم کو عام آزادی نہیں دی گئی[لہ]۔ تاہم مجکو اقرار کرنا چاہیے کہ فلسفہ کے دوستوں کی تعداد (عوام کا ذکر نہیں) دشمنوں سے زیادہ تھی۔

تعلیم پر مذہب کا اثر

مذہب نے تعلیم پر جو بڑا نمایاں اثر دکھایا وہ یہ ہے کہ قدیم عربی زبان نہایت احتیاط سے محفوظ رہی حالانکہ قدیم عربی ایک مدت سے نہ ملک کی زبان ہے نہ حکومت کی۔ فارس و خراسان کی عام زبان فارسی تھی۔ عباسی جو بغداد میں خلیفہ کہلاتے تھے اُنکا جاہ و جلال بغداد کی شہر پناہ تک محدود تھا۔ عنان حکومت دیلم یا سلجوق کے ہات میں تھی جو زبان اور اصل دونوں اعتبار سے عجمی تھے مصر و شام ایک مدت تک ایوبیہ۔ نوریہ۔ چراکسہ کے قبضہ میں رہے اور یہ سب عجمی تھے۔ ممالک مغربی (مراکو۔ تونس وغیرہ) میں بربر و زناتہ کی عملداری تھی۔ خود عرب میں قدیم عربی کا رواج نہیں رہا تھا۔ غرض اُسکے زندہ رہنے کا کوئی سہارا نہ تھا۔ لیکن صرف اس بات نے کہ قرآن پاک اور حدیث اسی زبان میں تھی اس کہنہ زبان کو تیرہ سو برس کی عمر دی اور خدا سے اُمید ہے کہ قیامت تک اُسکو قائم رکھے۔

اس بات کا بے شبہہ افسوس ہے کہ اس یک طرفہ توجہ نے موجودہ زبان سے ہمکو بالکل محروم رکھا آج چھ سو برس ہوئے کہ عرب کی زبان بالکل بدل گئی سیکڑوں نئے الفاظ کا داخل ہو جانا۔ مختلف تصرفات و تبدیلیاں۔ نئے محاوروں کا استعمال۔ یہ سب ایک طرف۔ خود اعراب و ترکیب کی وہ حالت نہیں رہی۔ موجودہ علم نحو۔ اب سرے سے بیکار ہو گیا ہے۔ تقریباً پانسو برس سے عرب اسی نئی زبان میں شعر و قصائد لکھتے ہیں۔ اسی زبان میں اُنکے فصیح و بلیغ خطبے پائے

[لہ] نفح الطیب۔ جلد اول صفحہ ۱۳۶۔

جاتے ہیں۔ لوگوں کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ یہ قصائد اگر اعراب کے ساتھ پڑہے جائیں تو موزوں نہیں رہتے افسوس ہے کہ اس جدید مستقل زبان پر کسی نے توجہ نہیں کی اور ان اشعار و خطب کے سمجھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی لغت موجود نہیں[۱]۔ کسقدر افسوس و شرم کی بات ہے کہ ان لغات محدثہ کے لیے ہمکو عیسائی فاضلوں کا دریوزہ گر ہونا پڑتا ہے یعنی پروفیسر بطرس کا جس نے نہایت تحقیق سے محیط المحیط لکھی ہے اور لین صاحب انگلشی کا جنکی کتاب مدالقاموس کی متعدد جلدیں لندن میں چھپ چکی ہیں۔

ملکی خصوصیتیں

اسلام جس وسیع دنیا پر حکومت کر رہا تہا اُسمیں جغرافی تقسیم کی حیثیت سے مختلف ملک شامل تہے اور متعدد قومیں آباد تہیں۔ اسلامی اتحاد نے اگرچہ ہر حصہ میں یکساں طور پر علوم کی روشنی پہیلائی مگر ملکی اور قومی خصوصیتوں نے مختلف صورتیں پیدا کیں۔ ایران نے منقولی علوم کے علاوہ عقلیات کو معراج کمال تک پہنچایا۔ مصر و شام میں فقہ حدیث و اسماء الرجال پر زیادہ توجہ ہوئی۔ حافظ جلال الدین سیوطی۔ مصر کی فضیلت کی ایک بڑی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ "وہاں فلسفہ کا زور نہیں ہے"، اسپین میں زباندانی۔ شاعری۔ تاریخ نے زیادہ فروغ ہوا یہاں تک کہ لڑکوں کو قرآن پڑہنے کے زمانہ سے اشعار و امثال یاد کرائے جاتے تہے۔ یہ اختلاف اُنہی ملکی خصوصیتوں کا اثر تہا۔ ایرانیوں کے ذہن کی لطافت۔ نکتہ سنجی۔ دقیقہ سنجی فلسفہ و منطق کے بالکل مناسب تہی۔ مصر و شام عرب کے دامن میں تہے اور اس وجہ سے قوت حافظہ کی عمدگی اور متوسط ذہانت نے حدیث و اسماء الرجال کو زیادہ پسند کیا۔ اسپین نے عرب ہونے کی حیثیت سے مصر و شام کا ہمپایہ تہا۔ لیکن اتنی خصوصیت نے کہ وہاں مدت تک عرب خاندان

[۱] علامہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں اس بحث پر متعدد مضمون لکھے ہیں۔ بہت سے اشعار بہی نقل کیے ہیں جو اس نئی زبان میں شعرائے عرب نے لکھے اور جنہیں اعراب کا مطلق پتہ نہیں ۱۲۔

حکومت کرتے رہے جو شعر و شاعری پر جان دیتے تھے۔ اسپین میں ادب و شاعری کو زیادہ چمکایا۔ شام میں بھی آل حمدان کے زمانہ میں جو عموماً سخنور تھے۔ شاعری کا پایہ نہایت بلند ہوگیا تھا۔

انقلابات حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوا کیے علمی مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوئے۔ ایک خاندان گو کلیتہً برباد ہوجاتا تھا۔ مگر اُسکے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے جو سو اضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہوچکے تھے دوسری نئی حکومت انکو غصب نہیں کرسکتی تھی۔ ہلاکو خاں نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کردیا۔ تاہم اوقاف میں کچھ تصرف نکرسکا۔ اُسنے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقق طوسی کے ہات میں دیئے جسکا بہت بڑا حصہ محقق موصوف نے **رصد خانہ** کی تعمیر میں صرف کیا۔ ممالک اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اُسکو استحکام سلطنت اور عظمت و جلال قائم رکھنے کیلئے ضرور تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پہلی حکومت سے زیادہ فیاضیاں دکھائے۔

اس بات سے تعجب اور افسوس دونوں ہوتا ہے کہ پہلی تعلیم جسکا اُترا ہوا خاکہ اب بھی ہندوستان میں موجود ہے۔ پولیٹکل آواز سے بالکل خالی تھی۔ نصاب تعلیم میں ایسی کوئی کتاب داخل نہ تھی۔ تاریخ کی کتابیں اگر پڑھائی جاتی تھیں تو تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ فن انشا کے اعتبار سے طالب العلموں کی سادہ اور مفلسانہ طرز زندگی۔ دنیوی خواہشوں سے مبرا اور بیغرض شوق۔ کمالات علمی کے لیے جسقدر زیادہ مفید تھا اُسیقدر اُنکو معاملات ملکی سے الگ رکھتا تھا۔ ہمکو تو جرات نہیں ہوسکتی مگر علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں (گو بیان سبب میں ہمسے مختلف ہیں) کہ "ان العلماء من بین البشر ابعد الامم عن السیاسة" یعنی نوع بشر میں عالم لوگ انتظامات ملکی سے بہت دور ہیں"۔[۱]

---

[۱] دیکھو مقدمہ ابن خلدون فصل ۶ کی فصل ۳۵۔

ہمنے اس آرٹکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں۔ مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے۔ ہماری علمی فیاضیوں اور ایجادات وصنائع کو مدرسوں کے احاطہ سے باہر ڈھونڈنا چاہیئے۔ مدرسوں کی کثرت اور عالمگیر رواج نے بھی پرویٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا ۸۴۹ھ میں جبکہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا۔ خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقہ درس تھے جنہیں ہر قسم کے علوم وفنون پڑہائے جاتے تھے۔[1]

میں نے اس آرٹکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب وتاب سے لکھوں۔ قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا یہ بھی اُسکے چہرے پر نہیں کھلتا۔ سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کرسکتے ہیں۔ ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا۔

مؤلف

گرفتم کز حریفاں بیش باکم میتواں گفتن		زُ دستت تا چہ آمد آخر اینہم میتواں گفتن

[1] حسن المحاضرۃ۔ جلد ثانی۔ صفحہ ۱۸۰۔

غلطنامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵	۵	سسرو	ستشرت
۱۰	۷	ابوییسی	ابوعیسی
۲۰	۱۴	زیادہ،	زیادہ
۳۳	۶	اسکوزرور	اسکوضرور
۳۸	۷	فارسی ہی	فارسی ہی
۴۵	۷	سرمایہ	سرمایہ ملکے
۴۹	۱	نقول	منقول
۵۲	۴	مختلف	مخالف
۵۵	۱۴	جب نالیس فورس	جب ، نالیس فورس
۷۱	۱۷	اورعلما	اورخاصکرعلما
۷۳	۵	مختلف تھے	مختلف نہ تھے
〃	۱۲	حضرت عمر کے وقت	حضرت عمر کے وقت میں
۷۵	۲	کاکاتب	اسکا کاتب
۷۷	۹	اسلام	اسلام

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۹	۸	عمال یمن	عمال ِ یمن
۸۲	۱۰	الصلوبا	صلوباً
"	۱۶	کان من کذا	کان کذا
۹۲	۱۷	نقط	نقطہ
۹۸	۱ و ۲	کتاب کے میں	کتاب کے دیباچہ میں
۱۰۳	۵	ہر حصوں میں	ہر حصہ میں
۱۰۸	۹	عمارتوں	عمارات
۱۱۰	۹	اسی	اس
۱۱۲	۳	الموتمہ	الموتمر
۱۱۴	۱۷	سے	ہے
۱۱۵	۱۳	کتب خانوں	کتب خانوں میں
۱۱۹	۱۹	سنہ ۱۹۴ء	سنہ ۱۸۹۴ء
"	۰	تمام	عام
۱۲۰	۱	یعنی پروفیسر ہادی نے سنہ ۱۸۹۴ء میں ابتدائی تعلیم کا مدرسہ کھولا۔	×
۱۲۵	۱۷	چھوٹ	جھوٹ
۱۳۰	۲	اور اور ینٹیل	اور ینٹیل
"	۱۷	مخرت	مخرج

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۳۱	۶	بطریق پٹرپارک	بطریق یعنی پیٹرپارک
۱۳۶	۸	عبادت	عبارت
"	"	سیمسولانگل	سیولانگل
"	۱۲	"	"
۱۳۷	۴	فکات	فکانت
"	۶	ضاعۃ الطب	صناعۃ الطب
۱۳۸	۷	بارض مصر	بارض مصر ہے
۱۳۹	۴	یاددلا	یاد دلانا
۱۴۱	۲	ہیں	میں
۱۴۷	۷	۲۳	۱۲
۱۴۸	۲	باخبار الاحرام	باخبار الاہرام
۱۴۹	۱۱	موقعوں میں	کتابوں میں
"	۱۵	یوسکس	یوٹیکس
۱۵۰	۱۴	سورنیاں	سیو رنیاں
۱۵۲	۶	سڈیو	سدیو
۱۵۴	۱	اس قصہ کے	اس قسم کے
"	۱۹	دکانتہم	
۱۵۶	۶	بلمیعۃ	بیجۃ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۵۶	۱۵	پہلے طبہ میں	پہلے وطبہ میں
۱۵۷	۳	السنہ ماھالہ	
۶	۱۸	خلات	خلافت
۱۶۰	۹	ابن النبدی	ابن البندی
۱۶۳	۹	اور اسکے	اور ہم اسکے
۱۶۶	۱۵	لٹین	لاطینی
۱۷۰	۳	کابر دولت	اکابر دولت
۶	۷	متصب	منصب
۱۷۲	۹	سیکڑوں اور ہزاروں	سیکڑوں ہزاروں
۱۷۳	۲	رشیدگو	رشید کو
۱۷۴	۹	بیت	بیبت
۱۷۵	۲	ابن لبطریق	ابن البطریق
۱۷۸	۱۳	وبہ	وجہ
۱۷۹	۱۴	الطبیعۃ	الطبیعیہ
۱۸۲	۲	عبداللہ بن بلال	عبداللہ بن ہلال
۶	۸	ماانی	ساماتی
۱۸۸	۱۹	طریق	لبطریق
۱۹۳	۱۱	قرطیبہ	قرطبہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۹۳	۱۸	کامیری	کاسیری
۱۹۶	۱۰	اتہتر	اتہنز
"	"	حسٹینئن	جسٹینین
۱۹۷	۱۳	فی ممکیفیة	فی کیفیتہ
۱۹۸	۱۳	طیاوس	طیماوس
۲۰۴	۹	یحییٰ بن عدی نے کیا	یحییٰ بن عدی سے کیا لہ
۲۰۷	۱۷	وحدت ووجود	وحدت وجود
۲۱۰	۱	ایرون	ایرن
"	۱۰	"	"
"	۱۲	المصونة	المصوتة
۲۱۹	۱۶	خاندا	خاندان
۲۲۱	۸	حسین	حسنین
۲۲۲	۴	ابن اصیبعہ	ابن ابی اصیبعہ
"	۱۳	الضاعة	الصناعة
۲۲۷	۴	عفت الکلب	عفقة الکلب
۲۳۲	۱۵	تین مقالوں میں سے	تین مقالوں میں ہے
۲۳۵	۱	قسطنطن	قسطنطین
"	۱۵	ابن حنجل	ابن جلجل

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۳۶	۱	منصف	مصنف
۲۳۷	۵	بہپنسا سے کہا	بہپنسا رکھا
۲۳۸	۷	لم تجمع	لم تجمع
۲۴۲	۴	خدائی نامہ	خداے نامہ
۲۴۳	۵	تہیں	نہیں
"	۱۳	استمار	استماعہ
۲۴۹	۱۷	کتابیں کتابیں	کتابیں
۲۵۳	۴	اسرائیلوں	اسرائیلیوں
۲۵۵	۱۴	حاخط	جاحظ
۲۷۱	۱۳	ثقۃ لدولہ	ثقۃ الدولہ
۲۷۵	۱۲	منبج	منبج
۲۸۰	۱۹	بی مثل	بے مثل تھے
۲۸۵	۱۱	س خاندان نے	اس خاندان نے
۲۸۶	۲	سے نہایت	لئے نہایت
۲۸۹	۴	ہر یہ جدیدہ	ظاہر یہ جدیدہ
"	۱۷	ابو نصر الدقانی	ابو نصر الدقاق
۲۹۱	۱ و ۲ و ۳		History of the Ottoman Turks by Sir Edward Creasy, M.A. late Chief Justice of Ceylon

صحیح	غلط	سطر	صفحہ
ہوا کہرت سے	ہوا او رہبت سے	۳	۲۹۳
سلیمیہ عتیقہ	سلیمیہ عتیقیہ	۱۵	۲۹۵
ازیق	ازیں	۱۰	۲۹[illegible]
قصر الحائر	قصرلحائز	۷	۲۹۷
اعتبار سے، طالب علموں کی	اعتبارسے طالبعلموں کی	۱۴	۳۱۲

غلطنامہ حواشی مقابل وتحتانی

صفحہ	غلط	صحیح
۱۶ (حاشیہ تحتانی)		۵ تاریخ سلجوق
۳۰ (حاشیہ مقابل	فارس کی بانیاں فارس کی کتابیں	فارس کی بانیاں مذہب کی کتابیں
۴۶ (حاشیہ تحتانی)	کتاب الخرام	کتاب الخراج
۱۲۱ (حاشیہ تحتانی)		لہ یہ شخص گونگوں کی تعلیم کا موجد ہے
۱۷۱ (حاشیہ تحتانی)	السندہ	السندیہ
۲۷۳ (حاشیہ تحتانی)	حنبلیہ کے بھی نام لکھے ہیں	حنبلیہ کے نام بھی لکھے ہیں۔
۳۰۴ (حاشیہ مقابل)	تعلیم کے لئے سفر	تعلیم کے لئے سفر
۳۰۵ (״)	وسعت تعلیم کے	وسعت تعلیم کے اسباب
״ (حاشیہ تحتانی)	ایم اے کی لوگوں سے	ایم اے کی کون سے
۳۰۷ (حاشیہ مقابل)	املا کا طریقہ جاتا رہا	املا کا طریقہ جاتا رہا
۳۱۱ (״)	لکی خصوصیتیں	ملکی خصوصیتیں

اطلاع

اشتہار

تصنیفات جناب مولانا محمد شبلی صاحب نعمانی المخاطب بہ شمس العلما

نام کتاب	مضمون	قیمت	کہاں سے مل سکتی ہے
سیرۃ النعمان	امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کی سوانح عمری جس میں انکے اصول اجتہاد و مسائل فقہیہ پر تفصیلی بحث ہے۔	عہ	مصنف علی گڈھ یا اعظم گڈھ کے پتہ سے
سفرنامہ	مصنف نے قسطنطنیہ و شام و مصر کا جو سفر کیا تھا اسکے واقعات۔ اور ان ممالک کے ہر قسم کے حالات۔	عہ ر	دکان الفرض مدرسۃ العلوم علی
رسائل شبلی	مصنف کے تاریخی مضامین کا مجموعہ	۹ر	مصنف
الفاروق	حضرت عمر فاروق کی مفصل سوانح عمری جو تقریباً ۶۰۰ صفحوں میں ہے۔ اور نہایت اہتمام اور خوبی سے چھپ رہی ہے۔		

سوداگروں کو جو عہ یا اس سے زیادہ قیمت کی کتابیں خریدیں عہ فی صدی کمیشن ملیگا اور ما کے خریدار کو عہ فی صدی۔